حلال و حرام

- عقیدہ و ایمان
- لباس و غذا
- معاشرت و معاملات
- ازدواجی زندگی
- آداب و اخلاق
- مومنانہ کردار

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی
صدر مدرسۃ دار العلوم سبیل السلام
(حیدر آباد دکن)

زمزم پبلشرز

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست مضامین

پانچواں باب

چھٹا باب

مضامین	صفحہ

مضامین	صفحہ

گیارھواں باب

طبعِ سوم

اس کتاب کا پہلا اور دوسرا ایڈیشن " دارالعلوم سبیل السلام حیدر آباد " اور اس کے ناظمِ عالی مقام جناب مولانا محمد رضوان القاسمی صاحب کے زیرِ اہتمام شائع ہوا تھا ۔ جب اس کتاب کا پہلا ایڈیشن طبع ہوا اور " ندوہ ایجنسی ، ارم کالج حیدر آباد " میں استاذِ گرامی حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مدظلہ شیخ الحدیث دارالعلوم حیدر آباد کے ہاتھوں اس کی رسمِ اجراء عمل میں آئی ، تو صرف پانچ دنوں میں ایک ہزار سے زائد نسخے فروخت ہو گئے اور دور دور تک یہ کتاب پہنچ گئی مجھے خود بھی اس پذیرائی کی امید نہیں تھی ، بلکہ میں اسے اس نسبت کی برکت سمجھتا ہوں کہ اس کتاب کا بڑا حصہ سفرِ حجاز کے درمیان چلتے پھرتے لکھا گیا ، جلد ہی اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن بھی آ گیا اور قریب سال بھر میں یہ ایڈیشن بھی نکل گیا ۔

ادھر عرصہ سے یہ کتاب نایاب تھی اور اصحابِ ذوق کا تقاضہ تھا کہ جلد سے جلد اس کی اشاعت عمل میں آنی چاہئے ۔ کتب خانہ نعیمیہ دیوبند اور اس کے علم دوست ذمہ داران اس کی طباعت کے خواہشمند تھے اور بار بار تقاضہ کرتے تھے چنانچہ ایک طویل عرصہ کے انتظار کے کتاب کا تیسرا ایڈیشن قارئین کے ہاتھوں میں ہے ، اس میں کوئی کمی یا اضافہ نہیں کیا گیا ہے ، البتہ طبعِ اول میں کتابت کی کچھ غلطیاں رہ گئی تھیں دوسرے ایڈیشن ان اغلاط کو سامنے رکھکر ایک " صحت نامۂ اغلاط " کتاب کے اخیر شامل کر دیا گیا تھا ، اب خود کتاب میں ان کی تصحیح کر دی گئی ہے ۔

الحمدللہ اسلام آباد اور لاہور (پاکستان) سے بھی اس کتاب کے کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں، عربی میں اس کتاب کا ترجمہ ہو چکا ہے جس پر نظرِ ثانی کا کام چل رہا ہے انشاء اللہ جلد ہی اس کتاب کی اشاعت بھی عمل میں آئے گی۔ بعض احباب انگریزی میں بھی کتاب کا ترجمہ کر رہے ہیں، میری خواہش ہے کہ جلد از جلد انگریزی ایڈیشن آجائے تاکہ امریکہ اور یورپ میں رہنے والے بھائیوں تک بھی یہ سوغات پہونچ جائے۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز۔

کتاب کا نیا ایڈیشن "المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد" کے زیرِ اہتمام طبع ہو رہا ہے اور نشر و اشاعت کا کام کتب خانہ نعیمیہ دیوبند نے اپنے ذمہ لیا ہے۔ دیوبند ہندوستان میں کتابوں کا سب سے بڑا مارکیٹ ہے جہاں سے نہ صرف ہندوستان بلکہ برِّ صغیر کے گوشہ گوشہ تک کتابیں پہونچ جاتی ہیں اور عرب اور مغرب کے اردو داں حلقہ تک بھی یہاں کی کتابوں کی رسائی ہے اس لئے، امید ہے کہ اب اس کتاب کے افادہ و استفادہ کا دائرہ اور بھی وسیع ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس کتاب کو مؤلف کیلئے زادِ آخرت بنائے اور اس کے نفع کو عام و تام فرمائے۔

ربنا تقبّل منّا انک انت السمیع العلیم۔

خالد سیف اللہ رحمانی

(خادم طلبۂ المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد)

یکم ربیع الاول ۱۴۲۱ھ

۲۴؍ جون ۲۰۰۰ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرفے چند

دُنیا دارالامتحان ہے اور خدا نے اتنی وسیع و عریض، خوبصورت اور حسین دنیا اسی لئے بنائی ہے کہ فرزندانِ آدم کی ثابت قدمی اور استقامت کا امتحان ہو، اس دارالامتحان میں نفس کی گمرہی کے اتنے سامان رکھ دیئے گئے ہیں کہ ان کا حساب اور شمار ممکن نہیں۔ دوسری طرف انسان کو ارادہ و اختیار کی ایک خاص قوت بھی فراہم کی گئی ہے کہ وہ جیسا ارادہ کریگا اور اپنی قوتِ اختیار و انتخاب کا استعمال کریگا مشیتِ خداوندی اپنی مدد کا ہاتھ بڑھائے گی، اگر کسی پاؤں نے یہ طے کرلیا ہو کہ اسے کعبہ کے بجائے صنم خانہ جانا ہے اور کوئی زبان اسی پر مصِر ہو کہ وہ "شیرِ طہور" کے بجائے شراب ہی سے لذت آشنا ہوگی تو نہ اس کا پاؤں جنبش سے رک سکے گا اور نہ زبان ذوق اور لذت کے ادراک سے محروم ہوگی۔

اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں اور رسولوں کے ذریعہ انسانیت کو اس سے بھی آگاہ کردیا ہے کہ وہ کن اعمال سے خوش ہوتا ہے اور کن اعمال سے ناراض؟ اس کی مرضیات کیا ہیں اور منہیات کیا ہیں؟ اپنے ارادہ و اختیار کی صلاحیت کو کن افعال کے کرنے میں صرف کرنا چاہیے اور کن باتوں سے اجتناب کرنا چاہیئے؟ جو باتیں کرنے کی ہیں اور خدا کی مرضیات کے مطابق ہیں وہ حلال ہیں اور جو باتیں بچنے کی ہیں اور خدا نے ان سے منع فرمایا ہے وہ حرام ہیں، گویا غور کیا جائے تو دین و شریعت تمام تر

حلال وحرام کی رہنمائی سے عبارت ہے، چاہے اعتقادات کا شعبہ ہو، معاملات ہوں معاشرتی زندگی ہو، آدابِ اخلاق ہوں، اجتماعی زندگی ہو، حقوق اور تعلقات ہوں، اِن سب میں جو خدا کی مرضیات ہیں وہ حلال ہیں اور جو منہیات ہیں وہ حرام ہیں یحلال و حرام کی تمام تفصیلات اسی اصول پر مبنی ہیں۔

اس اصول کو پیشِ نظر رکھا جائے تو قرآن وحدیث کے جتنے مضامین ہیں اور ان سے متکلمین نے عقیدہ، فقہاء نے عملی زندگی اور صوفیاء نے اخلاق وعادات کی بابت استنباط کیا ہے وہ سب کے سب حلال وحرام ہی میں داخل ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ اس مختصر کتاب میں ان تمام امور کا احاطہ مقصود نہیں بلکہ فقہاء نے حلال و حرام کے کچھ ضروری احکام (جو روزمرہ زندگی میں پیش آتے ہیں) کو ایک الگ عنوان سے جمع کیا ہے۔ جس کو بعضوں نے "کتاب الحظر والاباحۃ"، بعضوں نے "کتاب الکراہیۃ"، اور بعضوں نے "کتاب الاستحسان" کے عنوان سے ذکر کیا ہے، اس باب کو مختلف گوشوں سے متعلق حلال وحرام کے احکام کا منتخب مجموعہ ہی کہا جا سکتا ہے، اس میں بڑے مفید اور ضروری اور کثیر الوقوع مسائل ذکر کئے جاتے ہیں۔

ماضی قریب میں ان احکام کی اہمیت، ضرورت اور افادیت کے پیشِ نظر مختلف اہلِ علم نے حلال وحرام کے نام سے احکام ومسائل کے مجموعے مرتب کئے ہیں ان میں مشہور عرب عالم ڈاکٹر قرضاوی کا نام خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے جن کی کتاب اُردو میں بھی منتقل ہو چکی ہے، ڈاکٹر قرضاوی کی کتاب اپنی بہت سی خوبیوں کے باوجود ایک تو جزئیات وتفصیلات کو جامع نہ تھی اور اس میں کتبِ فقہ اور سلفِ صالحین کی آراء سے نسبتاً کم فائدہ اٹھایا گیا تھا۔ دوسرے بعض مسائل میں ایسی رائے اختیار کی گئی ہے جو اکثر اہلِ علم اور مستند اربابِ افتاء کی آراء سے مختلف ہے، نیز بعض ایسے مسائل جن کی مسلمانانِ ہند کو ضرورت پیش آتی ہے فطری بات ہے کہ اس میں

زیرِ بحث نہیں آئے ہیں ———— غالباً انہی وجوہ کے تحت ڈاکٹر قرضاوی کی کتاب کے بعد عالمِ عرب میں مختلف اہلِ علم نے اس موضوع پر قلم اٹھایا اور بعضوں نے خاص طور پر قرضاوی صاحب کی بعض آرار کی تردید اور تنقید پر رسائل تصنیف کئے، اِس سلسلہ میں صالح فوزان کی "الاعلام بنقد کتاب الحلال والحرام" خود راقمِ سطور کی نظروں سے گذری ہے۔

میرا خیال ہے کہ اس طرح کے موضوعات پر جو تحریریں مرتب ہوں، ان میں فقہ وقانون کی خشکی کے ساتھ دعوت وتذکیر کی حلاوت اور چاشنی بھی ہو کہ اصل مقصود عمل کی ترغیب ہی ہے اور وہ اسی طور حاصل ہو سکتا ہے، مسائل واحکام بیان کرتے ہوئے ترغیبی وتہدیدی آیات وروایات ذکر کی جائیں، حکم کی ظاہری مصلحت اور حکمت بھی بیان کی جائے، زبان واسلوب مؤثر ہو تو فائدہ زیادہ ہوتا ہے، امام غزالیؒ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "احیار العلوم" اور شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے اپنی مایۂ ناز تالیف "حجۃ اللہ البالغہ" میں نیز امام ابن تیمیہؒ نے اپنی تحریروں میں یہی اسلوب اختیار کیا ہے اور اس سے قوم وملت کو جو فائدہ پہنچا وہ محتاجِ اظہار نہیں۔

اردو زبان میں ایک ایسی کتاب کی شدت سے ضرورت محسوس ہو رہی تھی جس میں ایسے ضروری اور کثیر الوقوع مسائل جمع کر دیئے جائیں کہ اس میں کتاب وسنت کی نصوص اور فقہار کے اجتہادات دونوں سے فائدہ اٹھایا جائے، زبان شستہ اور عام فہم ہو، تحریر میں تذکیر اور دعوت کا رنگ بھی نمایاں ہو، حوالہ جات کا اہتمام ہو اور ماخذ سے براہِ راست مراجعت کی جائے، آداب واذکار بھی ذکر کئے جائیں۔

پیشِ نظر کتاب اسی ضرورت کی تکمیل ہے، مسائل کے احاطہ، حوالہ جات کے اہتمام، زبان کی حلاوت اور شائستگی، اسلوبِ تحریر میں نصح وتذکیر کا غلبہ اور مسائل کے بیان کرنے میں اور قابلِ بحث امور پر اظہارِ رائے میں اعتدال وتوازن

اور افراط و تفریط سے گریز اور کتب فقہ میں پھیلے ہوئے اور منتشر مسائل کے درمیان حسنِ انتخاب نیز ہر باب کے شروع میں موضوع کے مناسب مؤثر تمہید وغیرہ کی وجہ سے قوی امید ہے کہ یہ کتاب بھی انشاء اللہ مؤلف کی دوسری کتابوں کی طرح مقبول اور نافع ہوگی۔

مجھے مسرت ہے کہ یہ کتاب دار العلوم سبیل السلام حیدرآباد کے دار الاشاعت سے طبع ہورہی ہے اور جامعہ ہذا نے ادھر اس سمت میں خاصی پیش قدمی کی ہے ــــ علم وتحقیق کے کاموں کی حوصلہ افزائی اور اس کے فروغ و ترقی میں شرکت وتعاون جامعہ کے اولینِ مقاصد میں ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سلسلہ کو ثبات و دوام عطا فرمائے اور مفید اور بہتر تحریروں کی سوغات یہاں سے قوم و ملت کو ملتی رہے اور جامعہ کی تمام مطبوعات اور بالخصوص پیشِ نظر کتاب کو قبولِ عام سے سرفراز فرمائے۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط

آخر میں محترم الحاج سید ضیاء الرحمٰن صاحب صدر مجلسِ انتظامی دار العلوم سبیل السلام کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں کہ وہ اپنی علم نوازی کے سبب چاہتے ہیں کہ یہاں کے دوسرے شعبوں کی طرح شعبۂ تصنیف و تالیف اور شعبۂ صحافت بھی روز افزوں ترقی کرتا رہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی عمر اور صحت میں برکت عطا فرمائے اور منتظمینِ دار العلوم کی، دار العلوم کی فلاح و ترقی اور بقاء و استحکام کے سلسلہ میں جو نیک خواہشات اور عزائم ہیں ان کی تکمیل کا سامان مہیا فرمائے ــــ وَبِاللّٰهِ التَّوْفِيْقُ وَعَلَيْهِ التُّكْلَانُ۔

محمد رضوان القاسمی

ناظم دار العلوم سبیل السلام حیدرآباد

۱۸ ربیع الآخر ۱۴۱۳ھ

۱۶ اکتوبر ۱۹۹۲ء

پیش لفظ

حضرت مولانا مفتی محمد ظفیر الدین صدیقی صاحب

الحمد للہ وکفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفی۔

اسلام ایک مستقل نظامِ حیات کا نام ہے، جس کا کائناتِ انسانی کو اللہ تعالیٰ نے مکلف قرار دیا ہے۔ ہر وہ انسان جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مانتا ہے اور تعلیمات کتاب و سنت پر ایمان رکھتا ہے، اس پر لازم ہے کہ وہ اسلامی نظامِ حیات کو اپنائے اور اس ضابطہ کے مطابق اپنی زندگی گذارے اور اسی پر اس کی موت ہو۔

یہ ظاہر ہے کہ انسانی مزاج مجموعہ اضداد ہے۔ اس میں نیکی اور بھلائی کے جذبات بھی ہیں اور بدی اور بدخواہی کی خواہشات بھی، اس میں محبت اور الفت بھی پائی جاتی ہے اور نفرت وعداوت بھی، وہ خیرخواہی اور رواداری کو بھی پسند کرتا ہے اور اس کی فطرت میں فتنہ و فساد سے دلچسپی بھی ہے۔

اور اسی انسانی مزاج کی اصلاح کے لئے ہر دور میں پیغمبر اور رسول بھیجے گئے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ تک ہزاروں نبی اور رسول آئے اور انہوں نے راہِ حق کی ہدایت کی اور ضلالت و شیطنت کی راہ سے روکا۔ اسی کے ساتھ حلال وحرام اور جائز و ناجائز میں امتیاز کرنا سکھایا۔ صراطِ مستقیم اختیار کرنے پر بشارت دی اور اس راہِ حق سے

دور ہونے پر جہنم کی وعید سنائی۔

ربّ العالمین نے اپنی آخری آسمانی کتاب میں بھی کلیات واصول کو سامنے رکھ کر حلال وحرام کی نشان دہی کی اور رسول الثقلین صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی مزید تفصیل بیان فرمائی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کی امت کے مجتہدین اور صحابۂ کرام نے اس کی اشاعت میں بھرپور حصہ لیا اور کتاب و سنت کو سامنے رکھ کر اصول وکلیات کی روشنی میں فقہی جزئیات اور مسائل کا استنباط اور استخراج کیا اور پھر تمام احکام ومسائل کو مرتب کر کے کائناتِ انسانی کے سامنے پیش کیا تاکہ امت کو کوئی دشواری پیش آئے تو وقت ضرورت اس ذخیرہ سے مدد ملے اور اس کی رہنمائی کا فریضہ ادا ہو اور شیطان کا لشکر اس کو راہ راست سے دور کرنے میں کامیابی حاصل نہ کر سکے

زمانہ جس جس طرح آگے بڑھتا گیا۔ انسان کی ضرورتیں بڑھتی گئیں اور نئے نئے مسائل پیدا ہوتے گئے۔ فقہاء کرام نے ان پیش آمدہ مسائل کا جواب فراہم کیا جو آج بھی ضخیم کتابوں کی صورت میں الحمدللہ امت کے سامنے موجود ہیں اور اہل علم اس مجموعہ سے استفادہ کر رہے ہیں اور آئندہ بھی انشاء اللہ کرتے رہیں گے۔

حرام وحلال کا تعلق انسانی معاشرہ سے ہو یا اس کی عائلی زندگی سے، پھر ماکولات ومشروبات سے ہو یا کسب معاش سے یا زندگی کے دوسرے شعبہ جات سے، کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس پر روشنی نہ ڈالی گئی ہو۔

قرآن پاک میں حلال وحرام دونوں مسائل آئے ہیں۔ ارشادِ ربانی ہے:

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ — حرام کیا گیا تم پر مردہ جانور اور خون اور

ولحم الخنزیر وما اھل بہ لغیر اللہ والمنخنقۃ والموقوذۃ والمتردیۃ والنطیحۃ۔ (المائدۃ: ۱) — سور کا گوشت اور وہ جانور جس پر نام پکارا جائے اللہ کے سوا کسی اور کا اور وہ جو مر گیا گلا گھونٹنے سے یا چوٹ سے یا اونچے سے گر کر یا سینگ مارنے سے۔

نکاح کے سلسلہ میں ارشاد ہے:

حرمت علیکم امھاتکم وبناتکم واخواتکم (النساء: ۱۴) — حرام ہوئی ہیں تم پر تمہاری مائیں اور بیٹیاں اور بہنیں۔

خرید و فروخت کے سلسلہ میں ارشاد ہوا۔

احل اللہ البیع وحرم الربٰو (البقرۃ) — حلال کیا اللہ نے تجارت کو اور حرام کیا سود کو۔

شراب و جوا کے متعلق کہا گیا:

انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشیطان فاجتنبوہ۔ (المائدۃ: ۱۱) — بلاشبہ شراب اور جوا اور بت اور پانسے یہ سب شیطان کے گندے کام ہیں، سو ان سے بچتے رہو ....

غیروں کا مال بالخصوص یتیموں کا مال ناجائز طور پر کھانے کے سلسلہ میں فرمایا گیا:

ان الذین یاکلون اموال الیتامیٰ ظلماً انما یاکلون فی بطونھم ناراً وسیصلون سعیراً (النساء) — جو لوگ یتیموں کا مال ناحق کھاتے ہیں وہ لوگ اپنے پیٹوں میں آگ ہی بھر رہے ہیں اور عنقریب آگ میں داخل ہوں گے۔

بت پرستی اور جھوٹ کی مذمت کی گئی اور ارشاد ہوا:

فاجتنبوا الرجس من الاوثان واجتنبوا قول الزور (الحج - ۳) — بتوں کی گندگی سے بچتے رہو اور جھوٹی باتوں سے بچتے رہو۔

زنا اور زانیہ و زانی کے متعلق بیان کیا گیا:

ولا تقربوا الزنا انہ کان فاحشۃ وساء سبیلا (بنی اسرائیل - ۴)

زناکاری اور بدکاری کے قریب مت جاؤ دراصل یہ بڑی بے شرمی اور بے حیائی کا فعل ہے جس سے بدی کے راستے کھلتے ہیں۔

الزانیۃ والزانی فاجلدوا کل واحد منھما مائۃ جلدۃ ولا تأخذکم بھما رأفۃ فی دین اللہ (النور)

بدکاری کرنیوالی عورت اور بدکاری کرنیوالے مرد ان دونوں میں سے ہر ایک کو سو سو کوڑے مارو اور تم کو ان پر ترس نہ آئے اللہ کے حکم کے چلانے میں

حد قذف کو بیان فرمایا اور ارشاد ہوا۔

والذین یرمون المحصنٰت ثم لم یاتوا باربعۃ شھداء فاجلدوھم ثمانین جلدۃ۔ (النور)

اور جو لوگ پاکدامن عورتوں کو عیب لگائیں پھر وہ چار مرد گواہ نہ لائیں تو ان کو اسّی دُرّے مارو۔

الیوم احل لکم الطیبات وطعام الذین اوتوا الکتاب حل لکم وطعامکم حل لھم (المائدہ ۱۵۸)

آج حلال ہوئیں تمہارے لئے تمام پاکیزہ چیزیں اور اہلِ کتاب کا کھانا تم کو حلال ہے اور تمہارا کھانا ان کو حلال ہے۔

یا ایھا الرسل کلوا من الطیبٰت و اعملوا صالحاً یا ایھا الذین اٰمنوا کلوا من الطیبات ما رزقناکم (البقرۃ ۲)

اے رسولو! ستھری و پاک چیزیں کھاؤ اور بھلے کام کرو۔ اے ایمان والو! پاکیزہ چیزیں کھاؤ جو ہم نے تم کو دیئے ہیں۔

احادیث نبوی میں قرآن پاک سے زیادہ صراحت ہے اور بہت ساری چیزوں کی حلت و حرمت کو بتایا گیا ہے۔ رسول الثقلین صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

اَلَا لا یحل مال امرأ اِلَّا بطیب نفس منہ۔ (مشکوٰۃ)

سُن لو کسی آدمی کا مال دوسرے کیلئے حلال نہیں ہوتا ہے جب تک وہ بخوشی اجازت نہ دیدے۔

ایک دوسرے موقع سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الالا یحل لکم الحمار الاھلی و لا کل ذی ناب من السباع (مشکوٰۃ: ۲۹)

خبردار! تمہارے لیے پالتو گدھا حلال نہیں ہے اور نہ دانت والے درندے۔

ایک بار آپؐ نے ہدایت فرمائی۔

ان اللہ لم یحل لکم ان تدخلوا بیوت اھل الکتاب الا باذن ولا ضرب نسائھم ولا اکل ثمارھم اذا اعطوکم الذی علیھم۔ (مشکوٰۃ ص: ۲۹)

اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے حلال نہیں فرمایا ہے کہ تم اہلِ کتاب کے گھر میں اسکی اجازت کے بغیر داخل ہو اور نہ ان کی عورتوں کو مارنا درست اور نہ ان کا پھل کھانا جب انہوں نے جزیہ ادا کر دیا ہو

جو چیزیں ناجائز اور حرام تھیں مختلف مواقع سے سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے روکا:

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نھیٰ عن ثمن الکلب ومھر البغی وحلوان الکاھن۔ (مشکوٰۃ ص: ۲۴۱)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کتا کی قیمت اور بازاری عورت کی اجرت اور کاہنوں کے لین دین سے روکا ہے۔

آپؐ نے منع فرمایا کہ خون وغیرہ بیچ کر اسکی قیمت مت کھاؤ کہ یہ بھی حرام ہے:

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نھیٰ عن ثمن الدم وثمن الکلب وکسب البغی (مشکوٰۃ ص: ۲۴۱)

بلاشبہ خون کی قیمت، کتے کی قیمت اور طوائف کی کمائی کھانے سے منع فرمایا ہے

کل ذی ناب من السباع فاکلہ حرامٌ۔

ہر ذی ناب درندوں کا کھانا حرام قرار دیا گیا ہے۔ (مشکوٰۃ ص: ۳۵۹)

عن ابی ثعلبۃ قال حرم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لحوم الحمر الاھلیۃ۔ (مشکوٰۃ ص: ۳۵۹)

ابو ثعلبہؓ سے مروی ہے کہ رسول اکرمؐ نے پالتو گدھے کا گوشت حرام قرار دیا۔

احادیث نبویؐ میں حلال وحرام کا بڑا ذخیرہ ہے۔ یہاں نمونہ کے طور پر چند احادیث نقل کر دی گئی ہیں تاکہ اندازہ ہو سکے کہ حلال وحرام کی بنیاد کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں صراحت کے ساتھ موجود ہے جن کو سامنے رکھ کر ہی بعد کے فقہار نے تمام احکام ومسائل کا ذخیرہ مدون کیا ہے جو فقہ وفتاویٰ کی کتابوں کی صورت میں امت میں پائی جاتی ہیں اور آج علمار انہی کتابوں کے حوالہ سے حلال وحرام کا فتویٰ دیتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی پیش گوئی فرمائی ہے کہ آئندہ ایک ایسا زمانہ بھی آنے والا ہے کہ لوگ حلال وحرام کی تمیز اٹھا دیں گے اور ساری چیزوں کا استعمال شروع کر دیں گے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یاتی علی الناس زمان لایبالی المرأ اخذ منه أمن الحلال ام من الحرام رواہ البخاری۔ (مشکوٰۃ ص: ۲۴۱)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لوگوں پر ایک زمانہ آئے گا کہ آدمی اس کی قطعاً پرواہ نہیں کریگا کہ وہ حلال کھا رہا ہے یا حرام کھا رہا ہے۔

حالانکہ حلال وحرام ظاہر ہو گا۔ علمار اس کی نشاندہی کر چکے ہوں گے۔ لیکن کچھ لوگ اس کی پرواہ نہیں کریں گے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الحلال بین والحرام بین وبینهما مشتبهات لایعلمهن کثیر من الناس (ایضاً)	رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ حلال بھی ظاہر ہے اور حرام بھی اور ان دونوں کے درمیان جو چیزیں مشتبہ ہیں بہت سے لوگ نہیں جانتے ہیں۔

یہ بات ذہن نشین رکھی جائے کہ ہر غذا کی تاثیر ہوتی ہے۔ حرام سے جو گوشت پوست اور خون تیار ہوتا ہے۔ اس میں وہ ساری برائیاں پیوست

ہوتی ہیں جو کھانے والوں کو نیکی کے کام پر آمادہ نہیں ہونے دیتی اور ایسے ہی لوگ ملک و ملت میں فتنہ و فساد کو جنم دیتے ہیں اور ملک کا امن و امان اور سکون و اطمینان برباد کرتے ہیں اور ان کی ہی وجہ سے قتل اور خوں ریزی، چوری، ڈکیتی عام ہوتی ہے اور ملک تباہی و بربادی کے کنارے پہونچ جاتا ہے اور پبلک آرام کی نیند نہیں سو پاتی ہے۔

رسول اکرمؐ نے فرمایا کہ ایسے لوگ جہنم کے ایندھن بنیں گے۔

عن ابی بکران رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لایدخل الجنۃ جسد غذی بالحرام (مشکوٰۃ ص: ۲۴۲)	حضرت ابوبکر راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس جسم کی پرورش حرام غذا سے ہوئی ہے وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا۔

فقہاء کرام نے حلال کی تعریف کی ہے:

الحلال فی الشرع ما اباحہ الکتاب والسنۃ ای ما اباحہ اللہ وضدہ الحرام (التعریفات الفقہیۃ)	شریعت میں حلال وہ ہے جسے اللہ کی کتاب اور رسول کی سنت نے مباح قرار دیا ہے یعنی جس کی حلت اللہ کی طرف سے ثابت ہے، حلال کے مقابل حرام ہے۔

حرام کی تعریف میں فرمایا:

الحرام ضد الحلال قال الراغب الحرام الممنوع منہ۔ (ایضاً)	حرام وہ ہے جو حلال کے مخالف ہو اور امام راغب نے کہا حرام وہ ہے جس سے منع کیا گیا ہے

مباح کے متعلق لکھا:

المباح ھو ما یستوی طرفاہ یعنی مالیس بفعلہ ثواب ولا لترکہ عقاب۔ (ایضاً)	مباح کہتے ہیں جس کے دونوں طرف برابر ہوں۔ کہ جس کے کرنے پر نہ ثواب ہو اور جس کے چھوڑنے پر نہ کوئی سزا متعین ہو۔

یہ اپنی جگہ درست ہے کہ یہ ساری کائنات انسانوں کے لئے پیدا ہوئی

ہے اور انسانوں کو اس سے فائدہ اٹھانے کا پورا حق ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حلال و حرام کی تمیز اٹھادی جائے اور جائز و ناجائز کی راہ چھوڑ دی جائے۔

هوالذی خلق لکم ما فی الارض جمیعاً وسخر لکم ما فی السموات وما فی الارض جمیعاً (وہ ذاتِ باری ہی ہے جس نے دنیا کی ساری چیزیں تمہارے لئے پیدا فرمایا اور آسمان و زمین کی تمام چیزوں کو تمہارے تابع کر دیا۔)

پھر حرام میں کچھ اشیاء حرام لذاتہ ہیں اور کچھ حرام لغیرہ۔ کسی کی حرمت بڑھی ہوئی ہے کسی کی کم مگر حرام بہر حال حرام ہے، جس کی حرمت دلیل قطعی یقینی سے ثابت ہو اور اس میں کسی تاویل کا احتمال نہ ہو اس کا چھوڑ دینا فرض ہوتا ہے اور ایسے حرام کا منکر دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے، جس طرح فرض قطعی کا منکر کافر ہوتا ہے۔ البتہ اگر کوئی حرام کو حرام سمجھ کر کریگا وہ گنہ گار تو ہوگا مگر اسلام کے دائرہ سے خارج نہیں ہوگا۔

موجودہ دور مادی دَور ہے، روحانیت عنقا رہے۔ لوگوں میں عقائد کی پختگی، معاملات کی صفائی اور اخلاق و اعمال کی پاکیزگی ناپید ہوتی جارہی ہے۔ دوسری طرف خدا بیزاری کا فتنہ پورے عروج پر ہے اس لئے ضرورت ہے کہ دینی مسائل کی اشاعت پر توجہ دی جائے اور حرام و حلال کو بیان کیا جائے تاکہ یہ مسائل مسلمانوں کی نگاہوں سے اوجھل نہ رہیں۔

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ مدارسِ دینیہ کا سلسلہ پورے ملک میں پھیلا ہوا ہے اور ان سے بڑی تعداد میں علماء و مشائخ پیدا ہو رہے ہیں اور ان کی تعلیم و تبلیغ سے برصغیر کا ہر خطہ معمور ہے اور عوام و خواص ان سے مستفید ہو رہے ہیں۔

عرصہ سے اس کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ حلال وحرام کے مسائل جو مختلف فقہ وفتاویٰ کی کتابوں میں بکھرے پڑے ہیں ان کو یکجا کر کے اُردو زبان میں ایک کتاب کی صورت میں شائع کر دیا جائے۔

اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا کرے برادرِ عزیز مولانا خالد سیف اللہ رحمانی سلمہٗ کو کہ ان کی نظر اس طرف مبذول ہوئی اور انہوں نے محنت کر کے یہ قیمتی سرمایہ یکجا کر دیا جن کی اس سے پہلے بھی کئی کتابیں شائع ہو کر مقبول عام ہو چکی ہیں۔ مولانا موصوف ماشاء اللہ نوجوان علماء کرام میں اپنی ایک امتیازی شان رکھتے ہیں اور انہیں فقہ وفتاویٰ سے کافی مناسبت ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے فاضل اور ایک علمی خاندان کے چشم وچراغ ہیں۔ کتاب ہر پہلو سے جامع ہے، زبان سلیس و شگفتہ ہے، مستند مراجع سے مستفاد ہے، مسائل واحکام کا بصیرت مندانہ انتخاب ہے اور ترتیب عمدہ ہے۔ امید ہے یہ کتاب شائع ہو کر امت کے لئے مفید ثابت ہوگی، اور مسلمانوں میں رہبری کا فریضہ ادا کرے گی۔

اس موقع سے ہمارا خوشگوار فرض ہے کہ دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد اور اس کے ناظمِ عزیز مکرم مولانا محمد رضوان القاسمی زید مجدہٗ کا شکریہ ادا کریں جن کے ایماء سے یہ مہتم بالشان کام انجام پایا اور جسے دارالعلوم سبیل السلام اپنے اخراجات سے شائع کر رہا ہے۔

اخیر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مؤلف وناشر کی اس گرانقدر خدمت کو قبول فرمائے اور مسلمانوں کو اس کتاب کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچائے۔

ربنا تقبل منا انك أنت السميع العليم ———

طالبِ دعا: محمد ظفیر الدین غفرلہ

مفتی دارالعلوم دیوبند،

۸ ربیع الثانی ۱۴۱۲ھ ———

ابتدائیہ

راقم الحروف کو عرصہ سے خیال تھا کہ اُردو میں ایک ایسی تحریر مرتب ہو جائے جس میں "کتاب الحظر والاباحۃ" کے عنوان سے فقہاء جن مسائل کو درج کرتے ہیں ان میں سے بہ کثرت پیش آنے والے مسائل یکجا ہو جائیں۔ نیز اس بات کا بھی اہتمام ہو کہ روزمرہ کے معمولات میں پیغمبر اسلامؐ کی سنتیں اور پاک طریقے مستند کتابوں کے حوالوں کے ساتھ لکھ دیئے جائیں کہ مسلمان کی زندگی کا خلاصہ یہی اتباعِ سنت اور اپنے نبیؐ کے نقشِ قدم کی پیروی ہے۔ مختلف مصروفیات کی وجہ سے کئی دفعہ جی میں آیا کہ اپنے بعض عزیزوں اور خصوصیت سے تخصص فی الفقہ کے کسی طالبِ علم سے یہ کام لیا جائے لیکن چونکہ ان حضرات کو دوسرے کاموں کے ساتھ اسے انجام دینا مشکل تھا اس لئے طے کیا کہ مختلف ابواب پر مختلف طلبہ سے کام کرایا جائے۔

ادھر ایک ایسا موقعہ نکل آیا کہ جس نے خود قلم اٹھانے کی ہمت دی۔ میرا معمول ہر سال رمضان المبارک میں تصنیفی، تالیفی کاموں کا ہے، رمضان میں جو کام باقی بچ رہتا ہے اس کو تھوڑا تھوڑا کر کے سال بھر میں مکمل کرتا ہوں اور اسی لئے ماہِ مبارک میں کوئی سفر نہیں کرتا لیکن گذشتہ رمضان المبارک میں حرمین شریفین کی زیارت کا موقع نکل آیا، یہ ایسی سعادت تھی کہ طبیعت اس سے محرومی پر آمادہ نہ تھی اور اس بات پر افسوس بھی تھا کہ امسال کوئی تصنیفی کام نہ ہو سکے گا۔ پہلے سے ارادہ تھا کہ اسی رمضان میں "قاموس الفقہ" کے حصہ سوم کا کام کروں گا، اچانک ذہن میں یہ بات آئی کہ سفر میں

قاموس الفقہ کا کام تو نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ خیال جو عرصہ سے دل و دماغ میں پرورش پا رہا تھا شرمندۂ تعبیر ہو سکتا ہے، چنانچہ دو تین دنوں کتابوں کی ورق گردانی کی اور ضروری عبارتیں کچھ تو نوٹ کروائیں اور کچھ کی فوٹو اسٹیٹ اور دورانِ سفر ہی اس کام کو شروع کیا بلکہ دو یا تین ابواب قیام حجاز ہی کے درمیان لکھے گئے، تبرکاً ایک دو صفحہ مقامِ ابراہیم پر اور مسجد نبویؐ میں صُفّہ میں بھی لکھے گئے کہ شاید ان مقامات کی برکت و سعادت اس مرد گنہ گار کی اس تحریر کے قبول کا باعث ہو جائے۔

وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ۔

سفر کے درمیان خاصا کام ہو جاتا، لیکن اندازہ ہوا کہ مجھ جیسے محرومانِ لذتِ ذکر و عبادت اور خوگرانِ معصیت کو بھی وہاں پہنچکر چوکھٹِ یار پر جبینِ گناہ خم کرنے کے سوا کسی اور کام میں کم لطف آتا ہے، چنانچہ اواخرِ رمضان المبارک میں واپسی ہوئی اور کام بہت تھوڑا ہوا۔ پھر بعض اسفار اور مدرسہ کی انتظامی ذمہ داریوں کی وجہ سے اوائل ذیقعدہ تک مسودہ یونہی پڑا رہا، وسط ذوقعدہ سے ختم ذی الحجہ تک اس کام کو پورا کیا کہ آغازِ سال ہونے کی وجہ سے ان دنوں تدریسی مصروفیات کم رہتی ہیں اَب یہ تحریر جیسی کچھ مرتب ہو سکی قارئین کے سامنے ہے۔

میں نے اس تحریر میں کتاب و سنت کی نصوص اور فقہاء کی نصوص دونوں کو ملحوظ رکھا ہے اور اس بات کا بھی خیال رکھا ہے کہ خدا اور رسُولؐ کی ہدایات کو فقہاء کے اجتہادات اور شارحین کی تشریحات پر اولیت حاصل رہے۔ کتبِ فقہ میں بہت سی ایسی جزئیات مل جاتی ہیں جو ان کے زمانہ کی ضروریات یا اس عہد کے سماجی یا اخلاقی حالات کے تحت لکھی گئی تھیں، موجودہ حالات میں اس کو جوں کا توں نقل کر دینا بعض موقعوں پر اباحیت اور بعض صورتوں میں حرج و تنگی کا باعث ہوگا۔ ان احکام کے مطابق فتویٰ دینا تو کجا، حق یہ ہے کہ عوام میں ان کا بیان کرنا بھی صحیح نہیں۔ میں نے ایسے مسائل

کو نقل کرنے سے گریز کیا ہے اور ہر باب کے منتخب ضروری اور کثیر الوقوع مسائل ذکر کئے ہیں۔

مسائل و احکام اور آداب کے ساتھ قرآن و حدیث سے اس کا مأخذ بھی نقل کردیا ہے اور فضائل و رذائل بھی بیان کردیئے گئے ہیں تاکہ یہ تحریر صرف تحقیق نہ ہو بلکہ دعوت و تذکیر بھی ہو، جہاں ضرورت محسوس ہوئی حکمت و مصلحت بھی واضح کردی گئی ہے اور ہر باب کے شروع میں اس باب سے متعلق اسلام کی اصولی ہدایات اور شریعت کے عمومی مزاج و مذاق پر بھی اختصار کے ساتھ روشنی ڈال دی گئی ہے، نیز ہر باب سے متعلق معمولاتِ نبویؐ کے نقل کرنے کا بھی اہتمام کیا گیا ہے۔ کوشش کی گئی کہ بات مستند اور معتبر مأخذ سے لی جائے اور ان کی صراحت کے ساتھ ذکر کی جائے۔ زبان سہل اور عام فہم ہو اور فقہ و قانون کی خشکی کے ساتھ دعوت و نصح کی حلاوت بھی قارئین کے لئے سامانِ لذت بنے۔

کتاب کے بعض حصے میری دوسری کتابوں قاموس الفقہ، جدید فقہی مسائل، طلاق و تفریق، کے بعض مضامین کی تلخیص پر مشتمل ہے۔ میرا ایک کتابچہ "مزدور کے حقوق" سے متعلق تھا اور عرصہ سے دستیاب نہیں تھا نیز ایک اور رسالہ "بچوں کی تربیت" سے متعلق تھا اور جس کے مختلف حصے جنوبی ہند کے مختلف علاقوں میں لوگوں نے پمفلٹ کی شکل میں بھی شائع کئے تھے، تھوڑی تبدیلی اور حذف و اضافہ کے ساتھ قریب قریب مکمل اس کتاب میں آگیا ہے۔

بہت سے مقامات پر میں نے حافظہ سے حوالہ جات لکھدیئے تھے، بعض مواقع پر کتب حدیث سے براہِ راست مراجعت کرنے کی بجائے مشکوٰۃ شریف کے ذریعہ بالواسطہ حوالہ دیدیا تھا، ان حوالہ جات کی تخریج میں طلبہ تخصص عزیزان مولوی کمال الدین قاسمی مولوی محمد ابراہیم صدیقی سبیلی، مولوی حبیب الرحمٰن قاسمی، مولوی مجیب الرحمان قاسمی

مولوی عبداللہ حامد رشادی اور بالخصوص مولوی اشرف علی قاسمی (زادہم اللہ علماً وتوفیقاً) نے بڑا تعاون کیا ہے، چوں کہ عجلت کی وجہ سے مطالعہ، مواد کی یکجائی اور پھر تسوید و تبییض کا موقعہ نہیں تھا اس لئے ایک ہی دفعہ کتابوں کو سامنے رکھ کر املا کرایا گیا اور وہی کاتب کے حوالہ کیا گیا، اس سلسلہ میں بھی عزیز القدر مولوی اشرف علی سلمہٗ استاذ دارالعلوم سبیل السلام نے بڑی مدد کی اور کتاب کے اکثر حصے انہی کے ذریعہ لکھائے گئے۔ سفر کے درمیان جو کچھ لکھا گیا تھا، عجلت میں لکھنے اور تحریر کے صاف نہ ہونے کی وجہ سے ان کی تبییض ضروری تھی، عزیزی مولوی احمد عبدالمجیب قاسمی ندوی سلمہٗ استاذ دارالعلوم سبیل السلام نے پوری سعادتمندی کے ساتھ اس کی تبییض کا کام کیا، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان تمام عزیزوں کو علمِ نافع، عملِ صالح اور توفیق سے حظ وافر عطا فرمائے اور اپنے دین اور علمِ دین کی خدمت کے لئے قبول کرے۔ واللہ المستعان۔

دارالعلوم سبیل السلام میں بحمداللہ متعدد اصحابِ علم اور اصحابِ ذوق کا اجتماع ہے اور علمی اور فقہی مسائل پر باہمی تبادلۂ خیال کا سلسلہ بھی ہے، راقم الحروف کا معمول بھی ہے کہ جب بھی کوئی اہم چیز لکھی تو یا تو اس کی اجتماعی خواندگی کرلی یا ان حضرات کے حوالہ کردیا کہ نظرِ ثانی ہو جائے، پیشِ نظر کتاب چوں کہ بڑی عجلت میں مرتب ہوئی اس لئے کئی آدمیوں کی نظر سے نہ گذر سکی، لیکن مدرسہ کے ایک ممتاز استاذ حدیث و فقہ و صدر شعبۂ تخصص فی الدعوۃ اور زبان وادب کے مزاج شناس حضرت مولانا محمد مصطفیٰ صاحب مفتاحی کے حوالہ کیا کہ وہ اس پر نظرِ ثانی کردیں، موصوف نے بحمداللہ بالاستیعاب اور بنظرِ غائر دیکھا۔ ایک دو جگہ بعض ضروری مسائل کے اضافہ کی رہنمائی بھی فرمائی، راقمِ سطور تہِ دل سے ان کا ممنون ہے۔

اس موقعہ پر ناسپاسی ہوگی اگر حضرت مولانا محمد رضوان القاسمی صاحب ناظم دارالعلوم سبیل السلام کا شکریہ نہ ادا کروں جن کی علم پروری اور علمی کاموں کی

حوصلہ افزائی نیز اہلِ علم کے ساتھ سیر چشمی اور التفاتِ خاص ہی کی وجہ سے اس "دار العلوم" میں جس کی عمر زیادہ نہیں اور وسائل محدود ہیں، بہت کچھ کام ہو رہا ہے۔ حفظہ اللہ وجزاہ عنا خیر الجزاء ——————— مولانا موصوف ہی کی خواہش پر یہ کتاب اس وقت دار العلوم سبیل السلام سے شائع بھی ہو رہی ہے۔

ناسپاسی ہوگی اگر اس موقعہ پر اپنے بزرگ حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب کی عنایت فرمائی کا ذکر نہ کروں جن کی شفقت و محبت ہمیشہ شریکِ حال رہی ہے۔ موصوف گرامی نے اپنے بیش قیمت پیشِ لفظ کے ذریعہ اس حقیر تالیف کی قدر افزائی فرمائی ہے۔ متعنا اللہ بطول بقاءہٖ۔

اس کتاب کی ترتیب سے میرا مقصدِ خاص مسلمانوں کے سماج میں اسلامی تہذیب و تمدن اور پیغمبر اسلامؐ کے اسوۂ حسنہ اور سننِ مبارکہ کا احترام اور محبت پیدا کرنا اور اس پر عمل کی دعوت و ترغیب ہے۔ اگر واقعی اس کتاب سے کچھ لوگوں کو فائدہ پہنچے اور دو چار سنتیں بھی دو چار مسلمانوں کی زندگی میں آجائیں تو یہی ہماری محنت کا ثمرہ، ہماری کوششوں کا حاصل اور آخرت میں ہمارے لئے شعاعِ امید ہے۔

وباللہ التوفیق ———————

خالد سیف اللہ رحمانی
(صدر مدرس دار العلوم سبیل السلام)

بیت العلم، کوتہ پیٹ، حیدرآباد دکن
۱۴ محرم الحرام ۱۴۱۳ھ

پہلا باب

شریعت کے بنیادی اصول و قواعد

اسلامی شریعت اور اسلامی قانون کی بسم اللہ ہی اس امر سے ہوتی ہے کہ خدا جو تمام کائنات کا رب، اس کا پروردگار، روزی رساں اور مالک ہے، وہی اس کا حاکم بھی ہے، قانون قدرت تمام تر اس کے احکام کی تعمیل سے عبارت ہے۔ مہر و ماہ کی گردش، بادلوں کی حرکت، سمندر کا بہاؤ، موسموں کا تغیر، زمین کا نشیب و فراز، پہاڑوں کا جماؤ، یہ سب کا سب اضطراری طور پر حکمِ خداوندی کی تعمیل اور مشیتِ الٰہی کی تکمیل میں لگے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اسی مقصد کے لئے انسان کو بھی دنیا میں بھیجا لیکن چونکہ اس کا امتحان بھی مقصود تھا اسلئے ارادہ و اختیار کی قوت بھی اس کے سپرد کی کہ کیوں کر یہ اپنی قوتِ ارادی کا صحیح استعمال کر کے خدا کی مرضیات پر ثابت قدم رہتا ہے اور شریعت کی ممنوعات سے اپنے دامنِ عمل کو بچاتا اور محفوظ رکھتا ہے لیکن فرض منصبی اس کا بہرحال یہی ہے کہ وہ اپنے آپ کو بھی نظم کائنات کے ساتھ جوڑ دے اور اس راہ کو اختیار کرے جو اس کے رب کی خوشنودی کا ذریعہ ہو۔ ان الحکم الا للہ (الانعام ـ ۵۷)

الا لہ الحکم۔ (الانعام: ۶۲)

حکمِ خداوندی کے مطابق فیصلہ نہ ہو تو کہیں اس کو کفر (مائدہ ۔۴۴) کہیں فسق (مائدہ ۔۴۷) اور کہیں ظلم (مائدہ :۴۵) قرار دیا گیا اور حکم و فیصلہ اور حلال و حرام کرنے میں کسی اور کے شریک و سہیم بنانے کو شرک کے لفظ سے تعبیر کیا گیا (کہف ۔ ۲۶) یہودیوں اور عیسائیوں نے اپنے علماء اور فقہاء کے اقوال کو حکمِ خداوندی کا درجہ دے رکھا تھا ۔ اور حرام و حلال کی کلید ان کے حوالے کردی تھی، قرآن نے اسے احبار و رہبان کو رب قرار دینے کے مرادف قرار دیا ۔ اتخذوا احبارھم و رھبانھم اربابا من دون اللّٰہ ۔ (توبہ ۔ ۳۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض چیزیں اپنے اوپر عملی طور پر ممنوع کرلی تھیں تو اللہ تعالیٰ نے اس پر ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا، اور ارشاد ہوا : لم تحرم ما احل اللّٰہ لک (سورۂ تحریم : ۱)

اس لئے جس طرح کسی حرام کو حلال اور جائز کو ناجائز قرار دینا بد دینی اور گمراہی ہے ۔ اسی طرح کسی حلال کو بطور خود حرام کرلینا بدعت اور اللہ تعالیٰ کے حقوق اور اختیارات میں دست اندازی ہے اور گناہ و معصیت ہونے میں اصولی اعتبار سے دونوں ہی ہم درجہ ہیں ۔

حرام ـــــ فقہاء کی اصطلاح میں

حرام کے معنی روکنے کے ہیں "حریم" اس احاطہ کو کہتے ہیں جو کنویں میں کسی چیز کو گرنے سے روکے ـــــ فقہ کی اصطلاح میں ان باتوں کو کہتے ہیں جن کے ارتکاب سے منع کردیا گیا ہو، اس مفہوم کی ادائیگی کے لئے مختلف اہلِ علم نے جو تعبیریں اختیار کی ہیں ان میں معمولی سا تفاوت پایا جاتا ہے ۔ اس سلسلہ میں سب سے چست اور جامع تعبیر غالباً وہ ہے جو

آمدی نے اختیار کیا ہے ۔

ماینتھض منہ سَبباً للذم شرعاً بوجہ ما من حیث ھو فعل لہٗ ۔	جو بحیثیت اپنے فعل ہونے کے کسی بھی طرح شرعاً مذمت کا باعث ہو ۔

"ماینتھض سبباً للذم" (جو شرعاً مذمت کا باعث ہو) کی قید نے واجبات مستحبات کو حرام کے دائرہ سے نکال دیا کہ وہ شریعت کی نگاہ میں قابلِ مدح ہیں نہ کہ قابلِ مذمت ۔

"بوجہٍ ما" (بہر صورت مذموم) ہوگی ۔ تعبیر سے مباحات کو مستثنیٰ کرنا مقصود ہے کہ مباحات کا ارتکاب بعض صورتوں میں ضرور قابلِ مذمت ہوتا ہے، لیکن ہمیشہ نہیں، حرام بہر طور مذموم ہوتا ہے ۔

"مِن حَیث ھُو فعل لہ" (بحیثیت اپنے فعل ہونے کے مذموم ہو) اس کا مقصد یہ ہے کہ کبھی ایک مباح کسی واجب کے ترک کرنے کو مستلزم ہوتا ہے، وہ اس حیثیت سے ضرور مذموم ہوتا ہے، فی نفسہٖ مذموم نہیں ہوتا ہے جب کہ حرام کا ارتکاب فی نفسہٖ مذموم ہوتا ہے (۱)

امام رازی کا بیان ہے کہ حرام کے لیے چار اصطلاحیں ہیں، حرام (محرّم)، محظور، معصیت اور ذنب (۲)

حرام کیلئے کتاب و سنت کی تعبیرات

مختلف اسالیب اور تعبیرات ہیں کہ نصوص میں ان کا استعمال حرمت کو بتلاتا ہے، اور وہ یہ ہیں :

---

(۱) الاحکام فی اصول الاحکام ۱/۱۵۶ ۔ (۲) المحصول فی علم الاصول ۱/۱۹ ۔

۱۔ نہی اور ممانعت کا صیغہ، جیسے ارشادِ خداوندی ہے: لا تاکلوا الربا اضعافا مضاعفة (آل عمران: ۱۳۰) ——— یا جیسا کہ آپ ﷺ نے فرمایا لایبع بعضکم علیٰ بیع بعض۔ (مسلم)

۲۔ حرام اور حرام سے نکلنے والے الفاظ مثلاً اللہ تعالیٰ نے فرمایا:
حرمت علیکم المیتة (مائدہ: ۳)

۳۔ حلال اور جائز نہ ہونے کی صراحت، جیسے ارشادِ خداوندی ہے:
لا یحل لکم ان تاخذوا مما اٰتیتموھن شیئاً۔ (بقرہ: ۲۲۹)

۴۔ کسی فعل پر حدِّ شرعی مقرر کی گئی ہو، مثلاً: السّارق والسارقة فاقطعوا ایدیھما (مائدہ: ۳۸)

۵۔ کسی فعل پر کفارہ واجب قرار دیا گیا ہو۔

۶۔ کسی فعل پر عذاب اخروی کی دھمکی دی گئی ہو۔

۷۔ کسی فعل پر ایمان کی نفی کی گئی ہو۔

۸۔ کسی فعل کو گناہ قرار دیا گیا ہو۔

۹۔ کوئی بھی ایسی تعبیر اختیار کی گئی ہو جو ممانعت اور اجتناب کو بتاتی ہو جیسے اجتنبوا قول الزور (حج: ۳۰)

۱۰۔ صیغۂ نہی کے بجائے صراحۃً نہی کا لفظ استعمال ہوا ہو، مثلاً: نَھی اللہ، نھی الرسول، ینھون، وغیرہ۔

البتہ بعض اوقات نہی کا صیغہ، نہی کا لفظ، اجتناب و ممانعت کو بتلانے والی تعبیر یا کسی فعل کو گناہ قرار دینے کی عبارت کا مقصود حرمت کی بجائے "کراہت" کا اظہار ہوتا ہے، جس کا اندازہ قرائن، ممانعت کے اسباب اور شریعت کے مجموعی مزاج سے کیا جاتا ہے، گو کہ امر اصل میں

کسی بات کو واجب قرار دینے کے لئے ہے۔ کہیں مباحات اور مستحبات کو بھی امر کے صیغہ سے تعبیر کر دیا جاتا ہے۔

حرام اور مکروہ

حرام سے قریب ایک اور لفظ "مکروہ" ہے۔ جن چیزوں کی ممانعت پر دلیل قطعی موجود ہوتی ہے۔ ان کے لئے فقہاء صریحاً لفظ حرام کا استعمال کرتے ہیں۔ جن چیزوں کی ممانعت پر کوئی نص قطعی موجود نہیں ہوتی ہے۔ ان کو از راہ احتیاط حرام کے بجائے مکروہ کہہ دیا کرتے ہیں (۱) گویا کہ مکروہ کا درجہ حرام کے مقابلہ میں ویسا ہی ہے جیسے فرض کے مقابلہ میں واجب، جیسے واجب قریب بہ فرض ہوتا ہے اور اس کا ترک باعثِ گناہ۔ اسی طرح مکروہ قریب بہ حرام ہوتا ہے اور اس کا مرتکب مستحق گناہ؛ البتہ یہ حکم مکروہ تحریمی کا ہے اور فقہاء جہاں مطلق مکروہ بولتے ہیں وہاں یہی مکروہ تحریمی مقصود ہوتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں "مکروہ تنزیہی" ہے جو جائز کے قریب ہوتا ہے، گویا جو بات خلاف مستحب اور خلافِ اَولیٰ ہو وہ فقہاء کی زبان میں مکروہ تنزیہی ہے (۲)

کچھ ضروری اصول و قواعد

کچھ چیزیں تو ایسی ہیں کہ شریعت میں ان کے حلال یا حرام ہونے کی صراحت موجود ہے لیکن انسانی زندگی میں پیش آنے والے بہت سے حالات و واقعات اور معاملات وہ ہیں کہ کتاب و سنت میں

---

(۱) ردالمحتار ۲۱۴/۵۔ (۲) درمختار علیٰ ہامش الرد ۲۱۴/۵، کتاب الحظر والاباحۃ۔

ان کے بارے میں صریح حکم موجود نہیں بلکہ ایسے اصول وقواعد کی طرف رہنمائی کردی گئی ہے کہ ان کو سامنے رکھ کر پیش آمدہ واقعات اور نوپید مسائل کے بارے میں حلال یا حرام ہونے کا حکم متعین کیا جاسکتا ہے اور یہ فطری بات ہے کہ ایک ایسا دین جس کو قیامت تک کے لئے باقی رہنا تھا وہ صرف جزوی واقعات اور ان کی تفصیلات پر مشتمل نہیں ہوسکتا، ان کا احاطہ دشوار بھی ہے اور اکثر اوقات مستقبل میں پیش آنے والے جزئی واقعات کا اظہار انسان کی عقلِ کوتاہ کے لئے نامناسب بھی ہے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ ایک ایسے دین میں بنیادی خطوط، مقاصد اور شریعت کے مزاج و مذاق کی بنیادوں کو اس طرح واضح کردیا جائے کہ ہر دور میں پیش آنے والے مسائل کو ان پر منطبق کیا جاسکے اور ان رہنما اصولوں کو فیصلوں کی بنیاد واساس بنایا جاسکے۔

قرآن وحدیث میں ایسے بے شمار اصول وقواعد موجود ہیں۔ بعض جگہ ان کی صراحت کردی گئی ہے اور بعض جگہ اہلِ علم نے اجتہاد و استنباط کے ذریعہ ان کو دریافت کیا ہے ——— حلال وحرام کے سلسلہ میں بھی فقہاء کے یہاں بعض قواعد ملتے ہیں جو بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ مناسب ہوگا کہ ان میں سے بعض اہم اور ضروری قواعد کا ذکر کردیا جائے۔

۱۔ چیزیں اصلاً مباح وحلال ہیں

قرآن مجید میں متعدد مواقع پر ارشاد فرمایا گیا ہے کہ خدا نے

اس کائنات کو انسان کے لئے پیدا کیا ہے (بقرہ: ۲۹) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جیسے انسان کا مقصود خدا کی بندگی اور عبادت ہے اسی طرح کائنات کا مقصد انسان کی خدمت اور راحت ہے، دنیا میں بہت سی چیزیں ہیں کہ انسان ان سے بغیر اس کے فائدہ نہیں اٹھا سکتا کہ وہ اس کے لئے مباح ہوں، اسی لئے فقہاء کا خیال ہے کہ اشیاء میں اصل مباح اور جائز ہونا ہے الاصل فی الاشیاء الاباحۃ (۱) کسی شئی کے ناجائز اور حرام ہونے پر جب تک کوئی دلیل نہ آجائے اس کو مباح ہی سمجھا جائے گا۔ امام شافعیؒ کی تو یہ رائے ہے ہی، محققین مثلاً امام کرخی اور صاحبِ ہدایہ وغیرہ کی بھی یہی رائے ہے (۲)

اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ نے جن چیزوں کو اپنی کتاب میں حلال قرار دیا ہے وہ حلال ہیں، جن اشیاء کو حرام قرار دیا وہ حرام ہیں، کچھ اشیاء ہیں کہ ان کے متعلق خاموشی اختیار کی گئی ہے، وہ ایسی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے سلسلہ میں درگذر سے کام لیا ہے (۳) گویا جن امور کی بابت کتاب و سنت خاموش ہے وہ مباح ہیں۔

نو پید مسائل میں خصوصیت کے ساتھ اس قاعدہ سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ ایسے جانور جن کی حلت و حرمت کی قرآن و حدیث میں صراحت نہ ہو اور نہ کتاب و سنت کے بیان کئے ہوئے کسی اصول کے

---

(۱) الاشباہ للسیوطی ۱۳۳۔ (۲) الاشباہ لابن نجیم ۶۶۔

(۳) ترمذی، باب ما جاء فی لبس الفراء۔ ابن ماجہ، باب اکل الجبن والسمن۔

تحت وہ آتے ہوں، حلال سمجھے جائیں گے۔ یہی حکم اس قسم کے پودوں اور پھلوں کا بھی ہوگا (۱) موجودہ زمانہ کی ایجادات و اختراعات اور آلات و اکتشافات کے احکام پر اس قاعدہ کو خصوصیت کے ساتھ منطبق کیا جا سکتا ہے۔

عصمتِ انسانی میں اصل حرمت ہے

انسانی عِصمت و عفت اور عزت و آبرو کا مسئلہ چوں کہ نہایت نازک ہے اس لئے فقہاء نے ایک استثنائی قاعدہ یہ مقرر کیا ہے کہ عصمت کے معاملہ میں اصل حرمت ہے، الاصل فی الا بضاع الحرمۃ (۲) مثلاً ایک شخص کی کئی بیویاں ہیں۔ اس نے ان میں سے ایک کو طلاق دیدی لیکن کونسی بیوی مطلقہ ہے؟ یہ یاد نہیں رہا تو جب تک اس مطلقہ کی تعیین نہ کرلے وہ سب اس پر حرام ہوں گی، اسی طرح بلاتعیین کسی ایک کو طلاق دیدی تو جب تک اس خاص عورت کی تعیین نہ کر دے ان عورتوں میں سے کسی سے بھی مقاربت جائز نہ ہوگی۔

مگر یہ اس وقت ہے کہ حرمت ثابت ہو، محض حرمت کا شک ہو تو صرف شک کی وجہ سے حرمت ثابت نہ ہوگی، جیسے ایک عورت نے اپنا پستان بچہ کے منھ میں رکھا مگر دودھ کا نکلنا مشکوک ہے اور اس عورت کا خیال ہے کہ دودھ نہیں نکلا ہے تو محض شک کی وجہ سے دودھ والی حرمت (حرمتِ رضاعت) ثابت نہ ہوگی (۳)

---

(۱) الاشباہ للسیوطی: ۱۳۴۔

(۲) الاشباہ لابن نجیم: ۶۷۔

(۳) حوالۂ مذکور: ۶۸۔

۳- مجبوری ناجائز کو جائز کردیتی ہے

حرام وحلال سے متعلق فقہاء نے جو قواعد مقرر کئے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ اعذار اور مجبوریوں کی وجہ سے ناجائز اور حرام حلال ہوجاتا ہے: "الضرورات تبیح المحذورات (۱) ـــــ اس قاعدہ کی بنیاد قرآن وحدیث دونوں میں موجود ہے۔ قرآن نے اضطرار کی حالت میں مُردار اور خنزیر وغیرہ کے استعمال کی اجازت دی ہے بہ شرطیکہ صرف اتنا کھائے کہ رمق حیات باقی رہے (سورہ بقرہ: ۱۷۳) حدیث میں ہے کہ نہ نقصان اٹھایا جائے اور نہ پہونچایا جائے لاضرر ولاضرار (۲) ـــــ یہی ضرورت انسانی اور ہنگامی وغیر معمولی حالات کا تقاضا بھی ہے، اسی لئے فقہاء کے ہاں اس کو احکام کی تطبیق وتشریح کے لئے ایک مستقل اصل مانا گیا ہے۔

مشہور شافعی عالم علامہ سیوطی نے اس پر اس احتیاطی شرط کا بھی اضافہ کیا ہے کہ وہ ضرورت اس ناجائز فعل سے کم درجہ کی نہ ہو مثلاً اگر کسی شخص کو دوسرے شخص کے قتل کرنے یا کسی عورت سے زنا کرنے پر مجبور کیا جائے تو اس کے لئے دوسرے کا قتل یا زنا جائز نہ ہوگا کہ اپنی جان جانے کا اندیشہ دوسرے کے قتل یا زنا سے کم تر بات ہے (۳)

---

(۱) الاشباہ والنظائر لابن نجیم، ۸۵۔

(۲) سیوطی نے مؤطا امام مالک، بیہقی، مستدرک، حاکم اور دارقطنی کے حوالہ سے حضرت ابوسعید خدری سے اور ابن ماجہ کے حوالہ سے عبداللہ بن عباس اور عبادہ بن صامت سے یہ روایت نقل کی ہے۔ (الاشباہ والنظائر، ۱۷۳)۔ (۳) الاشباہ للسیوطی: ۸۴، ۱۷۳۔

ہماری فقہ کی کتابوں میں سیکڑوں احکام ہیں جو اسی قاعدہ پر مبنی ہیں مثلاً حلق میں لقمہ اٹک جائے اور شراب کے سوا کوئی سیال چیز نہ ہو جس کے ذریعہ لقمہ حلق سے اُتارا جا سکے تو شراب کا استعمال کیا جا سکتا ہے۔ جان بچانے کے لئے زبان سے کلمۂ کفر کا تلفظ کر سکتا ہے (۱) بھوک سے جان جانے کی نوبت ہو اور رفیق سفر کے پاس کھانا موجود ہو تو بلا اجازت اس کا کھانا کھا سکتا ہے (۲)۔ صرف ریشمی کپڑا ہی ہو، کوئی اور کپڑا موجود نہیں ہو تو بے لباس رہنے، یا اس طرح نماز پڑھنے کے بجائے یہی کپڑا پہن لے (۳) حرام و ناپاک اشیاء کے بطور علاج جائز ہونے کا مسئلہ بھی اسی قاعدہ سے متعلق ہے۔

جو مجبوریاں ناجائز کو وقتی طور پر جائز کر دیتی ہیں وہ یا تو ایسی ہوں کہ ان سے چارہ نہ ہو، مثلاً ان کے بغیر ہلاکت کا اندیشہ ہو یا ایسی ہوں کہ ان کی رعایت نہ کی جائے تو شدید مشقت اور دشواری پیدا ہو جائے پہلی صورت کو اصطلاح میں "ضرورت" اور دوسری صورت کو "حاجت" کہا جاتا ہے (۴) اسی لئے فقہاء کے یہاں قاعدہ ہے کہ حاجت کا بھی وہی حکم ہوتا ہے جو ضرورت کا۔ الحاجة تنزل منزلة الضرورة (۵)

اس قاعدہ کے ساتھ بنیادی شرط یہ ہے کہ ضرورت کے بہ قدر ہی ایسی ناجائز باتیں جائز رہیں گی۔ مثلاً ڈاکٹر نے کسی اجنبی عورت کو علاج

---

(۱) الاشباہ للسیوطی، ۴۷-۱۷۳۔

(۲) عالمگیری ۵/۲۳۸۔

(۳) تاتارخانیہ ۱/۴۱۸۔

(۴) الاشباہ للسیوطی ۱۷۶۔

(۵) الاشباہ لابن نجیم ۹۱۔

کی غرض سے دیکھا تو اتنا ہی حصہ کھولے جتنا ناگزیر ہے، اس سے زیادہ نہ کھولے اور پورا جسم چھپائے رکھے (۱)

۴۔ حرمت و حلّت میں احتیاط

شریعت میں حلال و حرام کے باب میں خاص حزم واحتیاط برتی گئی ہے اور جہاں حلال و حرام دونوں پہلو جمع ہو جائیں وہاں حرام ہونے کو ترجیح دی گئی ہے۔ ما اجتمع الحلال والحرام الاغلب الحرام الحلال (۲)

بعض حضرات نے اسی مضمون کی ایک روایت خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کی ہے لیکن علامہ عراقی نے اس کو بے اصل قرار دیا ہے۔ صحیح یہ ہے کہ یہ افقہ الامت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا قول ہے (۳) اور اتنی ہی بات اس کی اہمیت و اعتبار کے لئے کافی تھی لیکن اس کے علاوہ دین کا مجموعی مزاج و مذاق بھی اس کی تائید میں ہے۔

فقہاء کے اس قاعدہ پر اس ارشاد نبویؐ سے بھی روشنی پڑتی ہے جس میں آپؐ نے فرمایا کہ حلال و حرام تو کھلا ہوا ہے اور اس کے درمیان ایسی چیزیں ہیں جن کی حلت و حرمت مشکوک ہے (۴) پس ان مشتبہات سے بھی بچنا ضروری ہے کہ جو شخص کھیت کی آڑ پر جانور چرائے گا اس کا جانور کھیت میں اتر سکتا ہے، جو مشکوک اور مشتبہ چیزوں سے نہ بچے وہ حرام کا بھی مرتکب ہو سکتا ہے۔

---

(۱) الاشباہ للسیوطی۔ ۱۷۵۔ (۲) الاشباہ لابن نجیم، ۱۰۹۔

(۳) حوالۂ مذکور۔

(۴) الاشباہ للسیوطی: ۲۰۹۔

دو حلال و حرام جانور کے اختلاط سے جو بچہ پیدا ہو، اس کو احتیاطاً حرام ہی سمجھا جائے گا۔ شکار پر تیر پھینکا گیا اور وہ پہلے پہاڑ پر اور پھر اس سے زمین پر گرا تو احتمال اس کا بھی ہے کہ موت تیر سے واقع ہوئی ہو، ایسی صورت میں اسے حلال ہونا چاہیئے۔ امکان یہ بھی ہے کہ پہاڑ سے گرنا موت کا باعث بنا ہو، اگر ایسا ہو تو شکار حرام ہوگا، فقہاء نے دونوں احتمالات میں حرمت کے پہلو کو ترجیح دیا اور ایسے شکار کو حرام کے زمرہ میں رکھا (۱) چھری مسلمان کے ہاتھ میں ہو اور کوئی مشرک اس کا ہاتھ تھام کر جانور کے حلقوم پر چلائے تو ذبح میں اس مشرک کی شرکت کی وجہ سے احتیاطاً اسے حرام ہی قرار دیا جائے گا (۲) اس طرح کے بہت سے مسائل ہیں جن کی بنیاد اسی قاعدہ پر ہے۔

۵۔ ذرائع حرام کا سدِّ باب

اگر کسی بات سے منع کرنا اور روکنا مقصود ہو تو فطری بات ہے کہ ان اسباب و ذرائع کو بھی منع کرنا ہوگا جو اس ممنوع بات کا ذریعہ بنتے ہوں۔ اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی بری بات ہے۔ معبودانِ باطل کی مذمت کی جائے تو ضرور ہے کہ خدا ناشناس کفار خود خدائے برحق کی شان میں گستاخی کریں گے۔ اسی لئے قرآن پاک نے معبودان باطل کو بھی برا بھلا کہنے سے منع فرمایا (۳) زنا سے روکنا مقصود ہے۔ لیکن زنا کے سدِ باب کے لئے اجنبی مرد و عورت کی خلوت، نیز بے پردگی کو بھی منع فرمایا۔ اصل ممانعت شراب یا سود کی ہے۔

---

(۱)

(۲) الاشباہ لابن نجیم، ۱۱۰۔ (۳) الانعام۔ ۱۰۸۔

لیکن آپؐ نے ان ذرائع کو بھی حقدار لعنت ٹھیرایا جن کے ذریعہ شراب نوشی یا سود خواری کی حوصلہ افزائی ہوتی ہو اور اس میں مدد ملتی ہو ـــــ فقہاء کی زبان میں کسی فساد کو روکنے کیلئے اس کے ذرائع اور اسباب کے منع کردینے کو "سدِ ذریعہ" کہا جاتا ہے جو بظاہر جائز و مباح ہوتے ہیں لیکن ایسے نتائج تک پہنچاتے ہیں جو شرعاً ناجائز ہیں (۱)

تاہم سوال یہ ہے کہ کس درجہ کا ذریعہ ممنوع ہوگا اور کس درجہ کا ممنوع نہیں ہوگا؟ کیونکہ ذریعۂ بعید اور دروا سطہ ذرائع بھی ممنوع قرار دیئے جائیں تو بڑی دقت اور مشکلات پیدا ہو جائیں گی ـــــ علماء اصول نے اس سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے ان کا خلاصہ یہ ہے کہ ذریعہ کے چار درجات ہیں:

۱۔ اس "ذریعہ" کا فساد کا سبب بننا یقینی ہو ـــــ ایسے ذرائع بالاتفاق ممنوع ہوں گے۔ اگر یہ ذرائع خود بھی ممنوع ہوں تب تو ظاہر ہے کہ ممانعت کے دوسرے اسباب بھی موجود ہیں۔ ورنہ ممنوع کا ذریعہ بننا بجائے خود اس کی ممانعت کے لئے کافی ہے۔

۲۔ جس کا فساد کا سبب بننا یقینی تو نہ ہو لیکن اس کا غالب گمان ہو اس صورت کا بھی وہی حکم ہے جو پہلی صورت کا ہے کیوں کہ عملی احکام میں غالبِ گمان بھی "یقین" کے درجہ میں ہے۔

۳۔ جو شاذ و نادر کسی مفسدہ کا سبب بن جاتا ہو ـــــ ایسے ذرائع معتبر نہیں ہیں اور ان پر ممانعت کا حکم نہیں لگے گا۔ یہ تینوں صورتیں متفق علیہ ہیں۔

---

(۱) دیکھئے: الموافقات ۴/۱۹۸ و اعلام الموقعین ۳/۱۳۶ مابعدہ۔

۴۔ جو کام بکثرت فساد کا ذریعہ بنتا ہو لیکن اکثر نہیں یعنی جو دوسرے اور تیسرے درجہ کے درمیان ہو —— یہاں دو اصل متعارض ہیں، ایک پہلو یہ ہے کہ شریعت نے اس کی اجازت دی ہے۔ اس کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ جائز ہو۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ وہ بکثرت مفاسد کا ذریعہ بنتا ہے۔ اس اعتبار سے اس کو ممنوع ہونا چاہئے تھا۔ احناف وشوافع نے پہلی اصل کو پیشِ نظر رکھا اور اس درجہ کے ذریعہ کو ممانعت کے لئے کافی نہیں مانا۔ مالکیہ نے دوسری اصل کو سامنے رکھا اور اس ذریعہ کو بھی ممنوع قرار دیا —— مثلاً ایک مہینہ کی مہلت پر کوئی چیز دس درہم میں فروخت کی اور پھر اسی سامان کو مکمل ہونے سے پہلے پانچ درہم میں خرید کر لیا، پس بیچنے والے نے اپنا سامان جوں کا توں واپس لیا۔ پانچ درہم دیئے اور دس درہم حاصل کئے۔ اس طرح یہ بالواسطہ ربا کا ذریعہ بن گیا —— امام ابو اسحاق شاطبی کا بیان ہے کہ اسی اصولی اختلاف کے پیشِ نظر احناف اور شوافع نے اس نام نہاد بیع کی اجازت دی اور مالکیہ نے اس کو ناجائز قرار دیا ہے[1]۔

مالکیہ کا نقطۂ نظر ہے کہ صورتِ واقعہ اصل نہیں ہے۔ اصل قابلِ توجہ بات اس سے پیدا ہونے والے نتائج اور صاحب معاملہ کے مقاصد ہیں۔ دوسرے ایک طرف اذنِ شرعی ہے اور دوسری طرف ایک انسان کو دوسرے انسان کے ضرر سے بچانا ہے اور یہ دوسری مصلحت اس پر مرتب ہونے والے مفاسد کے اعتبار سے زیادہ قوی ہے۔ تیسرے صحیح روایات بہت سی ایسی باتوں کی حرمت پر شاہد ہیں جو اصلاً جائز ہیں،

---

(۱) حقیقت یہ ہے کہ احناف بھی اس قسم کی بیع کو ناجائز ہی کہتے ہیں۔ دیکھئے ہدایہ ۳/۱۴۱

لیکن بہ کثرت مفاسد کا ذریعہ بننے کی وجہ سے ممنوع قرار دی گئی ہیں جیسے اجنبی عورت کے ساتھ تنہائی، غیر محرم کے ساتھ عورت کا سفر، قبروں پر مساجد کی تعمیر اور خرید و فروخت کے معاملہ کے ساتھ قرض کو متعلق کرنا (۱) اس لئے اس درجہ کا ذریعہ بھی معتبر ہے اور میرے خیال میں یہی صحیح ہے ۔

۶۔ معصیّت میں تعاون

سدّ ذریعہ کا جو اصول اوپر ذکر کیا گیا اسی سے یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ گناہ کے کاموں میں اعانت کا کیا حکم ہوگا ؟ ۔ اس قاعدہ کے تحت معصیت میں تعاون کو مطلقاً معصیت ہونا چاہیے کہ یہ " لا تعاونوا علی الاثم والعدوان" (مائدہ : ۲) گناہ اور ظلم پر تعاون نہ کرو ــــــــ کے خلاف ہے لیکن سوال یہ ہے کہ گناہ کا بعید ترین تعاون بھی ممنوع ہو تو خصوصیت سے معاملات کے باب میں اتنی دشواریاں پیدا ہو جائیں گی کہ خلقِ خدا سخت تنگی میں مبتلا ہو جائے گی اور شریعت کا مزاج یہ ہے کہ وہ انسان کے لئے سامانِ حرج و تنگی نہیں بلکہ باعث سکون و سہولت ہے ــــــــ ان دونوں باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے فقہاء نے تعاون کی بعض صورتوں کو ممنوع اور بعض صورتوں کو جائز قرار دیا ہے ۔

اس سلسلہ میں فقہاء کی تصریحات اور قیاسات میں خاصا اختلاف بھی ہے اور تعارض بھی ۔ فقہاء کی مختلف جزئیات اور بعض تصریحات کو سامنے رکھ کر خیال ہوتا ہے کہ معصیت میں تعاون کی تین صورتیں ناجائز اور گناہ ہیں :
ایک یہ کہ وہ ایسا کام کر رہا ہو جس کا مقصود اور جس کی وضع کا منشاء

---

(۱) ملخصاً از : الموافقات للشاطبی ۲/۲۵۳۔

ہی کوئی گناہ کی بات ہو مثلاً ایسے آلات اور اسباب کی تجارت، جن کا مقصد ہی لہو ولعب ہو جیسے بُت فروشی، بُت گری اور گانے بجانے کے سامان، فلمی گانوں کے ریکارڈ کیسٹ، فحش تصاویر اور لٹریچر کی طباعت اور اشاعت وغیرہ۔

یہ چیزیں بذاتِ خود گناہ کا ذریعہ ہیں اور ان کا مقصد گناہ و معصیت کی اشاعت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اس لئے ان کی حرمت میں تو کوئی کلام ہی نہیں ہو سکتا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ اس کا عمل بذاتِ خود درست ہو اور اس کی نیت بھی یہ نہیں ہو مگر بعض ایسے قرائن موجود ہوں جو اس بات کو بتلاتے ہوں کہ اس کے عمل سے کسی معصیت اور گناہ کو تقویت اور مدد حاصل ہوگی اور وہ قرائن اس کے علم میں بھی ہوں، یہ صورت بھی معصیت میں اعانت سمجھی جائے گی اور اس کی نظیر یہ ہے کہ فقہاء نے اس بات کو مکروہ قرار دیا ہے کہ کسی ایسے شخص سے غلام کی بیع کی جائے جس کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ لواطت کا مریض ہے، یا ایسے ملک کے ہاتھ اسلحہ فروخت کیا جائے جو عالمِ اسلام سے جنگ کے درپے ہے (۱) جس کو فقہ کی اصطلاح میں دارالحرب کہا جاتا ہے۔

اس لئے کہ ایک لواطت کے خوگر آدمی کا اَمرد کو خرید کرنا اور ایک ایسے ملک کا اسلحہ خرید کرنا جو مسلمانوں سے برسرِ عداوت ہے اس بات کا واضح قرینہ ہے کہ وہ اس کا استعمال معصیت و گناہ اور عالمِ اسلام کو ضرر پہنچانے کے لئے کرے گا۔

---

(۱) ردالمحتار ۵/۲۸۷۔

تیسری صورت یہ ہے کہ کوئی کام اس نیت سے کرنا کہ اس سے معصیت میں مدد ملے، گوکہ وہ کام اپنی اصل اور موقع کے لحاظ سے معصیت کیلئے نہ ہو۔ البتہ اس کا استعمال گناہ کے لئے بھی کرلیا جاسکتا ہو ـــــ یہ صورت بھی جائز نہ ہوگی، اس لئے کہ کسی کام کے مذموم ہونے کی دو ہی صورتیں ہیں۔ یا تو وہ کام خود مذموم اور گناہ کا ہو۔ یا وہ اپنی ذات کے اعتبار سے تو درست ہو، البتہ اس کے پیچھے جو جذبہ اور جو نیت کارفرما ہے وہ مذموم اور ناپسندیدہ ہو۔ پہلی دونوں صورتوں میں یہ عمل بذاتِ خود مذموم تھا، اس لئے وہ معصیت میں تعاون شمار ہوگا۔ چاہے نیت اچھی ہو یا بری، جب کہ زیر بحث صورت میں کام اپنی جگہ درست ہے مگر نیت نے اس کو مذموم کردیا ہے۔

۷۔ حیلہ کی شرعی حیثیت

حلال و حرام کے سلسلہ میں ایک اہم اور ضروری بحث حیلوں کی ہے حیلہ کے اصل معنی "مہارت تدبیر" کے ہیں۔ فقہاء کی اصطلاح میں حرمت و معصیت سے بچنے کے لئے ایسی خلاصی کی راہ اختیار کرنے کا نام ہے جس کی شریعت نے اجازت دی ہو۔[1] اسی لئے بعض لوگوں نے حرام سے بھاگنے کو حیلہ قرار دیا ہے: انما ھو الھرب من الحرام[2] غرض کہ حیلہ حرام سے بچنے کا نام ہے نہ کہ حرام کا ارتکاب کرنے اور دوسروں کو اور اپنے آپ کو دھوکہ دینے کا۔

---

(۱) المبسوط ۳۰/۲۱۰۔

(۲) الاشباہ لابن نجیم ص ۴۰۶۔

اس میں شبہ نہیں کہ فقہ کی کتابوں میں بعض ایسے حیلوں کا ذکر آ گیا ہے جو شریعت کے مزاج و مذاق سے میل نہیں کھاتا لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ فقہاء اس طرح کے حیلوں کو جائز قرار دیتے ہوں اور اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوں، مقصود محض یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ایسا کر ہی گذرے تو کیا حکم ہوگا؟ اور اس کے کیا اثرات مرتب ہوں گے؟ اسی کی طرف علامہ ابن نجیم مصری نے بعض لوگوں کے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے اشارہ کیا ہے کہ:

انما المعنی انہ لو فعل کذا لکان حکمہ کذا (۱) ——— امام سرخسیؒ نے حیلہ کی جائز اور ناجائز صورت پر گفتگو کرتے ہوئے خلاصہ بحث یوں لکھا ہے:

"حاصل یہ ہے کہ وہ حیل جن کے ذریعہ انسان حرام سے خلاصی، یا حلال تک رسائی کا خواہاں ہو بہتر ہے، ہاں کسی کے حق کا ابطال، یا باطل کی ملمع سازی مقصود ہو تو ناپسندیدہ ہے ...... غرض حیلہ کی یہ راہ نادرست اور پہلے ذکر کی گئی صورت جائز ہے" (۲)

فقہاء نے جس طرح کے حیلے ذکر کئے ہیں۔ ان کے مجموعی مطالعہ سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے، مثلاً کوئی عورت کسی مرد سے نکاح کی مدعی ہو اور وہ انکار کرتا ہو۔ ثبوت فراہم نہ ہو تو اب یہ دقت ہے کہ چوں کہ مرد اس سے نکاح کا منکر ہے اس لئے اس سے طلاق دلوائی نہیں جاسکتی اور عورت نکاح کی مقر ہے۔ اس لئے دوسرا نکاح نہیں کر سکتی۔ ایسی صورت میں یہ حیلہ بتایا گیا کہ مرد سے کہلایا جائے کہ اگر میں نے اس سے نکاح کیا ہے تو اس پر طلاق واقع ہو تاکہ عورت کے لئے دوسرے نکاح کا راستہ نکل آئے (۳)

---

(۱) الاشباہ والنظائر لابن نجیم، ص: ۶-۴۔

(۲) المبسوط ۳۰/۲۱۰۔ (۳) الاشباہ لابن نجیم، ص: ۴۰۷۔

یا اگر کسی نے کہہ دیا کہ اگر تم نے ایسی ہانڈی نہ پکائی جس کا نصف حلال اور نصف حرام ہو تو تم پر طلاق واقع ہو جائے۔ ایسی صورت میں ایسے سر پھرے شخص کی بیوی کو شراب کی ہانڈی میں چھلکا سمیت انڈا ڈال کر پکانا چاہیئے کہ انڈے کے پوست کی وجہ سے شراب کا اثر انڈے کے اندر نہ پہونچ پائے گا اور اس طرح وہ ایسی چیز پکانے کی مصداق ہو گی جو آدھا حلال اور آدھا حرام ہے اور وہ اپنے آپ کو طلاق جیسی ابغض المباحات سے بچا کر خاندان کے شیرازہ کو محفوظ رکھ سکے گی (۱)

غور کیا جائے کہ حیلہ کی ان صورتوں میں گناہ اور حرام سے بچنے، معصیت کا دروازہ بند کرنے اور شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے حلال کو طلب کرنے اور حاصل کرنے ہی کا جذبہ تو کار فرما ہے، اس لئے اس بات کو اچھی طرح ذہن نشیں رکھنا چاہیئے کہ انسان حیلہ کی آڑ میں حرام اور معصیت کا ارتکاب کرنے لگے اور ظلم و عدوان پر اسلام کا غلاف چڑھانے کی کوشش کرے تو یہ قطعاً حرام اور معصیت ہے اور خدا کو دھوکہ دینے کی سعی ہے: یُخادِعُونَ اللّٰہَ وَالَّذِینَ آمَنُوا وَمَا یَخدَعُونَ اِلَّا اَنفُسَہُم۔

قرآن مجید نے بنی اسرائیل کے ایک طبقہ پر خاص اسی وجہ سے عذاب خداوندی کے نازل ہونے کا ذکر کیا ہے کہ وہ حدود اللہ کو توڑتے ہوئے ہفتہ کے دن بھی شکار کیا کرتے تھے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس سے منع کر دیا تھا اور اس حرام کے ارتکاب کے لئے ایک خاص طرح کا حیلہ اختیار کرتے تھے۔

---

(۱) الاشباہ والنظائر لابن نجیم، ص: ۴۰۹۔

حِیَل کا باب عوام اور بالخصوص علماء کیلئے بڑا نازک اور پُرخطر ہے اور بغیر ضرورتِ شدیدہ کے کبھی اس دروازہ پر دستک نہیں دینی چاہیئے اور یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ حیلہ کا مقصد سلف صالحین کے نزدیک حرام سے بچنا ہے نہ کہ اس کو حلال وطیب بنانا۔
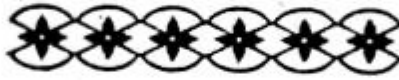
دوسرا باب

عقیدہ وایمان

اسلام میں اعتقادات کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی توحید پر ہے، اسلام کا تصورِ توحید سب سے زیادہ کامل ومکمل اور جامع ہے کہ خدا اپنی ذات کے اعتبار سے بھی ایک ہے۔ اپنی صفات واختیارات کے اعتبار سے بھی یکتا ہے اور اپنے مخصوص حقوق عبادت، دعا، سجدہ، نذر وقربانی وغیرہ میں بھی کوئی اس کا شریک وسہیم نہیں۔ اس نے صرف کائنات کو وجود ہی نہیں بخشا بلکہ کائنات کا تمام نظام ہر لمحہ اور ہر آن اس کے حکم کی پابندی میں مصروف ہے وہ رب ہے اور وہ تمام معاملات کو براہِ راست دیکھتا اور سنتا ہے، اس کی بادشاہت وزیروں کی محتاج نہیں اور اس تک رسائی کے لئے واسطوں کی ضرورت نہیں۔ خدا کو سب سے زیادہ جو چیز ناپسند ہے وہ اس کی ذات کے ساتھ کسی اور کو شریک ٹھہرانا ہے۔ غیرت مند شوہر کو اپنی ہرجائی بیوی پر جو غیرت آسکتی تھی، خدا کی آتشِ غضب بندوں کے مشرکانہ اعمال وافعال پر اس سے زیادہ بھڑکتی ہے۔

اسلام کا یہ تصور توحید انسانی مساوات وبرابری کے تصور کو اُجاگر کرتا ہے، انسان کو ناامیدی سے بچاتا ہے اور خدا کی رحمانیت کی آس

دلاتا ہے، اس کی جبر و قہر کی صفت انسان کو جرائم سے باز رکھتی ہے، خدا تک بلا واسطہ رسائی اور خدا سے نسبتِ بندگی عظمتِ انسانی میں اضافہ کرتی ہے۔ واقعہ ہے کہ اسلام کا تصورِ توحید ایک انقلابی تصور ہے، جس کا فکر و خیال اور قول و عمل سے گہرا رشتہ ہے، شریعت میں جتنے اعمال ہیں غور کیا جائے تو وہ سب اسی عقیدہ کی بازگشت اور اسی کے اقرار و اعتراف کی تجدید سے عبارت ہے، نماز خدا کی کبریائی سے شروع ہوتی ہے اور اسی کی توحید کی شہادت پر ختم ہوتی ہے۔ روزہ اسی کے حکم کی تعمیل ہے اور بندہ جب اسے مکمل کرتا ہے تو کہتا ہے کہ خدایا! میں نے تیرے ہی لئے روزہ رکھا ہے: "اَللّٰھُمَّ لَکَ صُمْتُ" زکوٰۃ مال پر خدا کی سُلطانی کا اعتراف ہے، حج خانۂ خدا کی زیارت ہے، قربانی خدا کے لئے جان دینے کا عہد ہے۔ نکاح سے پہلے خطبہ اس بات کا اظہار ہے کہ حلال و حرام کی کلید خدا ہی کے ہاتھوں ہے اور اسی کے حکم سے یہ دو مرد و زن ایک دوسرے کے لئے حلال ہوئے ہیں، اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، چلتے پھرتے، کھاتے پیتے اور خوشی و غم کے موقع پر جتنی دُعائیں ہیں اور جو بھی اذکار منقول ہیں وہ سب خدا کی قدرت کے اعتراف، اس کی نعمت پر شکر اور مصیبت میں اسی کی طرف رجوع اور اسی سے مدد خواہی اور استعانت کے سوا اور کیا ہے؟

افسوس کہ عقیدۂ توحید جو مسلمانوں کے لئے سب سے بڑا سرمایۂ فخر تھا، اقوامِ عالم جس کی معقولیت پر رشک کرتی رہی ہے اور انہوں نے دیکھا دیکھی بگڑی ہوئی شکل میں سہی اپنے یہاں توحید کے لئے جگہ پیدا کی ہے، وہی امتِ مرحومہ آج شرک کے دام ہم رنگ میں پھنسنا چاہتی ہے

آج اس کی جبین انسانوں اور انسانی قبروں اور مزاروں اور آستانوں کی خاکِ مذلت کو اپنے لئے تمغۂ امتیاز اور طغرۂ افتخار بنائے ہوئی ہے
فیا عجباہ ویا اسفاہ۔

جیوتشیوں کے پاس جانا

اسلام کا تصور یہ ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی غیب کی باتوں سے باخبر ہے۔ خدا کے سوا کوئی انسانوں کے مستقبل میں پیش آنے والے واقعات اور حالات سے باخبر نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو کسی کاہن کے پاس آیا اور اس کی باتوں کی تصدیق کی، اس نے قرآن مجید کو جھٹلایا: فقد کفر بما انزل علیٰ محمد (۱)۔ اس میں وہ تمام لوگ داخل ہیں جو قسمتوں کا حال بتاتے ہیں، پنڈت ہوں، جیوتشی ہوں، جھوٹے درویش ہوں، سڑکوں پر بیٹھ کر تماشا کرنے والے ہوں اور ان کو اجرت کے بطور کچھ دینا بھی حرام ہے اور ان کی خبروں پر یقین کرنا اور اس پر اعتقاد رکھنا بقول ملا علی قاری کفر ہے (۲)

بدعت اور اس کی پہچان

بحیثیتِ مسلمان ہم اس بات کا عقیدہ رکھتے ہیں کہ خدا نے اپنے آخری پیغمبرؐ کے ذریعہ اپنی رضا و خوشنودی اور خیر کی تمام باتیں بتادی ہیں۔ آپؐ نے جو کچھ بتایا وہ خیر ہے اور جو کچھ خیر کی باتیں تھیں اس کو

---

(۱) شرح فقہ اکبر ص: ۲۲۱۔
(۲) ومنہا ان تصدیق الکاہن بما یخبرہ من الغیب کفر، شرح فقہ اکبر ص: ۲۲۱۔

آپؐ نے صراحتاً یا اصولاً واضح فرما دیا ہے۔ اس لئے اب دین میں کسی بات کا اضافہ اور کمی بیشی کرنا جائز نہیں اور غضبِ خداوندی کا باعث ہے۔ اسی کو شریعت کی اصطلاح میں "بدعت" کہتے ہیں۔ پس بدعت دین میں شریعت کے مشابہ ایسا خود ایجاد کردہ عمل ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی عبادت اور رضا جوئی میں مبالغہ مقصود ہو (۱)

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہر بدعت گمراہی ہے (۲) ایک روایت میں ہے کہ جو شخص کسی بدعت کو جنم دے یا بدعتی کو پناہ دے اس پر خدا، ملائکہ اور تمام انسانیت کی لعنت ہو (۳) صحابہؓ اور سلفِ صالحین نے بھی بدعت کے بارے میں ایسی ہی شدت برتی ہے۔ صوفیاء جن کے نام پر بدعت کی جاتی ہے، بدعت کے سخت مخالف تھے اور اس کی مذمت کیا کرتے تھے۔ حسن بصریؒ فرمایا کرتے: بدعتی کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا نہ رکھو، یہ دل کو بیمار کرتا ہے۔ فضیل بن عیاضؓ فرماتے جو بدعتی کے ساتھ بیٹھے وہ حکمتِ دین سے محروم رہے گا (۴) حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اپنے خطبات میں بدعات سے بطورِ خاص منع فرماتے تھے (۵) حضرت مجدد الف ثانیؒ بدعت سے پناہ مانگتے تھے (۶) فقہاء نے لکھا ہے کہ بدعتی کی اقتداء مکروہ ہے۔(۷)

---

(۱) الاعتصام ۱/۳۷۔
(۲) مسلم عن جابر بن عبداللہ۔
(۳) بخاری، باب حرم المدینۃ۔
(۴) دیکھئے: الاعتصام ۱/۸۹ تا ۹۹۔
(۵) فیوض یزدانی، ص ۵۰۷۔
(۶) دفتر اول مکتوب، ۱۸۹۔
(۷) عالمگیری ۱/۸۴۔

بدعات جو ہمارے یہاں مروج اور ذہن نشین ہیں، افسوس کہ ان کی فہرست بہت طویل ہے اور ناسمجھی اور خدا ناترسی کی وجہ سے طویل تر ہوتی جاتی ہے، ان میں بعض تو اعتقادی بدعات ہیں جو درجۂ کفر کو پہنچی ہوئی ہیں اور بعض عملی بدعات ہیں اور ان کا ارتکاب کبائر میں داخل ہے۔

یہاں ان میں سے ایک ایک کو ذکر کرنا مقصود نہیں۔ البتہ کچھ علامات ذکر کی جاتی ہیں جو اصولی حیثیت کی حامل ہیں اور ان کے ذریعہ کسی چیز کے بارے میں صحیح رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے۔

۱۔ جو عبادتیں انفرادی طور پہ ثابت ہوں، ان کو اجتماعی طور پر انجام دینا جائز نہیں (۱)۔

۲۔ جو سنت سے "خفا" کے ساتھ ثابت ہو، اس کو آہستہ ہی پڑھنا چاہیئے، زور سے پڑھنا بدعت ہے، اسی لئے فقہاء نے لکھا ہے: رفع الصّوت بالذکر بدعة (۲)

۳۔ شریعت میں کسی عمل کیلئے کوئی مخصوص وقت مقرر نہ ہو۔ اب اگر کسی وقت خاص ہی میں اس کو کیا جائے اور اس کو اہمیت دی جائے تو یہ بھی بدعت ہوگا، چنانچہ شاطبی نے آپ ﷺ کے یوم پیدائش پر خصوصیت سے خوشیاں منانے کو بدعت قرار دیا ہے (۳)

۴۔ کسی عمل کے لئے کوئی خاص کیفیت اور ہیئت ثابت نہ ہو اور اس کا التزام کیا جائے تو یہ بھی بدعت ہے۔ امام مالکؒ کے زمانہ میں

---

(۱) ردالمحتار ۲/۲۳۵۔

(۲) بزازیہ علیٰ ہامش الہندیہ ۳/۳۷۵۔ (۳) الاعتصام ۱/۳۹۔

اسکندریہ کے لوگ ایک جگہ جمع ہو کر قرآن مجید کی ایک سورہ کی اجتماعی قرآت کیا کرتے تھے، حضرت امام مالکؒ نے اس کو بدعت قرار دیا (۱)

۵۔ ایسا عمل جس سے دین کے کسی کام میں کمی یا اضافہ کا وہم ہو سکتا ہو، یا نسبتہً کم اہم امر کے متعلق زیادہ اہمیت کا اظہار ہوتا ہو تو یہ بھی ممنوع ہے اور علماء نے اس کو بھی بدعت میں شمار کیا ہے، تاکہ یہ عام لوگوں کے لیئے غلط فہمی کا موجب نہ بن جائے (۲)

۶۔ دین میں جو چیز واجب نہ ہو، اس کا اس درجہ التزام کہ اگر اسے نہ کیا جائے تو لوگ اسے مطعون کرنے لگیں اور اس کے ضروری ہونے کا وہم ہونے لگے، بدعت ہے۔

۷۔ جو عمل خیر کسی خاص کام کے لیئے ثابت نہ ہو، اس کا کرنا بھی بدعت سے خالی نہیں، چنانچہ ہشام بن عبد الملک نے عیدین کیلئے اذان و اقامت کا سلسلہ جاری کیا تو علماء نے اس کو بدعت اور مکروہ قرار دیا (۳) کہ اذان اس موقع خاص پر ثابت نہیں۔

۸۔ غیر مسلموں سے دینی امور میں تشبہ بھی بدعت ہے۔ مثلاً غیر مسلموں کے مختلف طبقات، مخصوص رنگ کے لباس استعمال کرتے ہیں، اب بعض صوفیاء زور نے بھی مخصوص رنگ جیسے سبز یا زرد لباس کے استعمال کا خود کو پابند کر لیا ہے، علماء نے اس کو بھی بدعت قرار دیا ہے (۴)

یہ چند اصول ذکر کر دیئے گئے، جن سے بدعت کی شناخت میں

---

(۱) الاعتصام ۲/۲۔
(۲) دیکھیئے: الاعتصام ۲/۲۲۔
(۳) الاعتصام ۲/۱۸۔
(۴) حوالہ مذکور ۲/۲۲۹۔

سہولت ہو تفصیل کے لئے علامہ شاطبی کی مایۂ ناز تالیف "الاعتصام" اور مولانا محمد سرفراز خاں کی "راہِ سنت" نیز راقم سطور کی "مروجہ بدعات فقہائے اسلام کی نظر میں" کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے ــــــــ تاہم یہ بات واضح رہے کہ بدعات میں حسنہ اور سیئہ کی تقسیم اور کچھ بدعتوں کو جائز قرار دینا محض ایک دھوکہ اور مغالطہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ امورِ دین میں جو بھی بدعت ہو، سب مذموم اور گمراہی ہے، کہ آپؐ کی زبانِ حق ترجمان کا ارشاد ہے کہ ہر بدعت گمراہی ہے: کل محدثۃ بدعۃ وکل بدعۃ ضلالۃ۔ امام شاطبی کا بیان ہے کہ حسنہ اور سیئہ کی اس تقسیم پر کوئی دلیلِ شرعی موجود نہیں(۱) اور مجدد الف ثانیؒ نے اپنا مکاشفہ بیان کیا ہے کہ کسی بدعت میں نور نہیں (۲) تفصیل کیلئے مذکورہ کتابیں دیکھی جائیں۔

صحابہؓ کا مقام

دین جن واسطوں سے ہم تک پہنچا ہے، ان میں سب سے پہلا واسطہ حضراتِ صحابہؓ کا ہے۔ یہ صحابہ اللہ تعالیٰ کے وہ منتخب بندے ہیں جن کو خدا نے اپنے رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور رفاقت کے لئے منتخب کیا ہے اور واقعہ ہے کہ جو شخص بھی دیانت و راستی کے ساتھ تاریخِ عالم کا مطالعہ کرے گا وہ اس کا اعتراف کرے گا کہ اپنے پیشوا سے والہانہ محبت، ایثار و فدا کاری، مادی قربانی، اطاعت و فرماں برداری اور جاں بازی و جان نثاری نیز خدا ترسی، احساسِ جواب دہی، خوفِ

---

(۱) الاعتصام: ۱۹۱/۱۔

(۲) مکتوبات: ۳۲/۲۔

آخرت، اپنے پیغمبر کی زندگی کے ایک ایک حرف کی حفاظت اور دین کی ہر ضرورت پر نصرت و مدد اور اپنی عمومی زندگی میں بے نفسی، نمائش و ریا سے دُوری اور عہدہ و جاہ سے بہ رضا و رغبت مہجوری اور اسلام کی دعوت و اشاعت کے لئے بے پناہ سرگرمی اور کاوش وسعی، اخلاقی بلندی اور وسیع القلبی، زبان و دل کی رفاقت اور نفاق و ظاہرداری سے اجتناب وغیرہ اوصاف میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی کوئی نظیر و مثال نہیں ملتی۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم ورضوا عنہ۔

ان صحابہؓ پر بے اعتمادی کا اظہار اور ان کے بارے میں زبان کھولنا، یا ان کے اختلافات و مشاجرات پر بحث کرنا محض اساس دین کو نقصان پہنچانے کے مرادف ہے اور خود اسلام کے نام پر اسلام کی بیخ کنی ہے۔ کیوں کہ جب اس دیوار کی خشتِ اول ہی کمزور ٹھہرے تو اس بنا، ناپائدار پر کون بھروسہ کرے گا۔ اسی لئے سلف صالحین نے صحابہؓ کے بارے میں اور ان کے اختلافات پر گفتگو کو منع کیا ہے اور اہلِ سنت والجماعت کا اجماع ہے کہ خلفاء اربعہ حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے بعد اسلام میں تقدم و تاخر اور کم و بیش قربانیوں کے اعتبار سے درجات کا تفاوت تو ضرور ہے لیکن پوری جماعتِ صحابہؓ تمام امت سے افضل ہے (۱) اور ان کا اختلاف اصل میں فکر و اجتہاد کا اختلاف ہے، ان میں جو صائب ہو وہ تو "صائب" ہی ہے اور جس سے غلطی ہوئی ہو تو وہ بھی محض خطاء اجتہادی ہے، نہ کہ خدانخواستہ ضلالت و گمراہی۔

ادھر گذشتہ نصف صدی میں بعض ایسے لٹریچر اُردو زبان میں

---

(۱) شرح فقہ اکبر، ص: ۱۷۸۔

آئے کہ ان کی وجہ سے کچھ آوارہ خیال لوگوں نے اپنے ہاتھ میں میزانِ انصاف لے رکھی ہے وہ بزعم خود کچھ صحابہ کو مدعی اور کچھ کو مدعا علیہ بنا کر انصاف کے لئے بیٹھ گئے ہیں اور ان کی زبان صحابہ کے بارے میں نقد و احتساب کے لئے کھل جاتی ہے، یہ ایک شدید قسم کی گمراہی ہے۔ خود آپؐ نے اپنے صحابہ کے بارے میں جس احتیاط کی ہدایت فرمائی ہے اس کی خلاف ورزی ہے اور دین کو نقصان پہونچانے میں دانستہ یا نادانستہ شریک ہونا ہے اللہ ہماری حفاظت فرمائے۔

اسی طرح بعض صحابہؓ کے بارے میں اہلِ تشیع کے طریق پر مبالغہ اور غلو سے کام لینا جائز نہیں مثلاً "مولا علی"، "المدد یا علی" یا خود "یا علی" کا نعرہ —— کہ اس طرح کی باتوں میں کفر تک کا اندیشہ ہے۔ اسی طرح خاص کر حضرت علی یا حضرت حسین کے ساتھ علیہ السلام کا لفظ لکھنا بھی مناسب نہیں۔ خود امام ابو حنیفہؒ سے اس کی ممانعت منقول ہے۔

انکارِ حدیث

ہمارے زمانہ کے فتنوں میں ایک بڑا فتنہ انکار حدیث بھی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کا حجت ہونا قرآن کی صراحتوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بے غبار ارشادات و فرمودات سے ثابت ہے۔ کسی حدیث کے سند یا متن میں ضعف کی وجہ سے حضور اکرمؐ کی طرف اس کی نسبت کو صحیح نہیں ماننا، یا مختلف معانی کے احتمال پائے جانے کی صورت میں کسی خاص قرینہ کی بنا پر ظاہری معنی سے انحراف کرنا اور توجیہ و تاویل کی راہ اختیار کرنا اور بات ہے اور یہ عہد صحابہؓ سے جاری و ساری ہے

یہ اختلاف صواب خطا کا اختلاف ہے، ہدایت و ضلالت کا اختلاف نہیں لیکن کسی شخص کا حدیث کی حجیت ہی سے انکار کر دینا، دین میں اس کو مستند یا قابلِ عمل نہیں ماننا یا استہزاء اور انکار کرنا ـــــ جیسا کہ ہمارے زمانہ کے بعض خدا ناترس اور اباحیت پسند نام نہاد مسلمان دانشوروں اور بزعم خود ترقی پسندوں نے کیا ہے ـــــ شدید گمرہی اور دین میں تحریف و تصحیف کے مترادف ہے۔ حدیث بحیثیتِ حدیث واجب التعمیل بھی ہے اور واجب التعظیم بھی ہے ـــــ راقم الحروف کا خیال ہے کہ ایسا کرنے میں یا تو کفر ہے یا کم از کم اندیشۂ کفر۔

ملا علی قاریؒ نے خلاصۃ الفتاویٰ سے نقل کیا ہے:

من رد حديثاً قال بعض مشائخنا يكفر وقال المتأخرون ان كان متواتراً كفر ـ اقول هذا هو الصحيح الا اذا كان رد حديث الاحاد من الاخبار على وجه الاستخفاف والاستحقار والانكار (۱)	جو کسی حدیث کو رد کر دے ہمارے مشائخ نے کہا کہ اسکی تکفیر کی جائے گی، متاخرین نے کہا ہے کہ اگر حدیثِ متواتر کو رد کر دے تب تکفیر کی جائیگی، میں کہتا ہوں یہی صحیح ہے سوائے اس کے کہ خبر واحد کو بطور استہزاء اور تحقیر و انکار کے رد کر دے تو اس کو کافر قرار دیا جائے گا۔

اس لئے مسلمانوں کو اس فتنۂ کبریٰ سے آگاہ رہنا چاہیے کہ انکارِ حدیث دراصل دین کی اساس اور بنیاد پر حملہ اور اسلام کی جڑیں کھودنے کے مترادف ہے۔

---

(۱) شرح فقہ اکبر ص: ۲۴۷۔

ختمِ نبوّت کا انکار

رسول للہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے میں یہ بات داخل ہے کہ سلسلۂ نبوت کو آپؐ پر ختم سمجھے، اس پر تمام امّت کا اجماع ہے۔ مُلا علی قاری کا بیان ہے: ودعوی النبوۃ بعد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کفر بالاجماع (۱) (آپؐ کے بعد دعوی نبوت بالاجماع کفر ہے) الاشباہ والنظائر میں لکھا ہے کہ جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری نبی نہ جانے وہ مسلمان نہیں (۲) عالمگیری میں بھی لکھا ہے کہ اگر کوئی آپ کے بعد نبوت کا دعویٰ کرے تو اس کی تکفیر کی جائے گی۔ فقہاء، مفسرین و محدثین اور متکلمین کے یہاں یہ بات اس صراحت سے منقول ہے کہ سلیم الفکر انسان کے لئے مجال انکار نہیں۔

اس لئے کوئی بھی شخص آپؐ کے بعد دعوئ نبوت کرے تو بظاہر متقی و پرہیز گار ہی کیوں نہ ہو، صاحبِ ایمان نہیں ہوسکتا اور اس کا اپنے آپ کو مسلمان کہنا محض فریب اور دھوکہ ہے ——— گذشتہ صدی میں پنجاب کے ایک مرد کذاب مرزا غلام احمد قادیانی نے بہت سے دعاوئی کئے اور منجملہ ان کے ایک دعوئ نبوت بھی ہے، ظاہر ہے کہ شخص مذکور مرتد، زندیق و بددین تھا اور اس کی نبوت پر ایمان لانے والے اور اس کو نیک و صالح سمجھنے والے دونوں ہی کافر ہیں۔ نہ ان سے شادی بیاہ کا معاملہ جائز ہے اور نہ ان کے ساتھ موالات وارتباط، کہ ایسے لوگوں سے بے تعلقی خدا سے تعلق کا اظہار ہے اور ایسے لوگوں کے ساتھ موالات و دوستی دینی غیرت وحمیت کے مفقود ہوجانے کا ثبوت اور حبّ

---

(۱) شرح فقہ اکبر ۲۰۲۔ (۲) الاشباہ والنظائر ۱۳۸۔

نبویؐ سے محرومی کی شہادت۔

بعض لوگ یہ دھوکہ دیتے ہیں کہ قادیانی بھی اہلِ قبلہ ہیں اور اہلِ قبلہ کی تکفیر سے منع کیا گیا ہے مگر یہ محض مغالطہ ہے —— اہلِ قبلہ سے وہ لوگ مراد ہیں جو ضروریاتِ دین یعنی دین میں قطعی طور پر ثابت شدہ باتوں کے منکر نہ ہوں۔ ملا علی قاریؒ کا بیان ہے:

المراد باھل القبلۃ الذین اتفقوا علی ما ھو من ضرورات الدین... وان المراد بعدم تکفیر احد من اھل القبلۃ عند اھل السنۃ انہ لا یکفر ما لم یوجد شئ من امارات الکفر و علاماتہ۔ (۱)

اہلِ قبلہ سے وہ لوگ مراد ہیں جو ضروریاتِ دین سے متفق ہوں.... اہلِ سنت کے نزدیک اہلِ قبلہ میں سے کسی کی تکفیر نہ کرنے سے مراد ہے کہ اس وقت تک تکفیر نہیں کی جائے گی جب تک کفر کی علامات اور نشانیاں نہ پائی جائیں۔

علامہ شامیؒ نے بھی لکھا ہے کہ جو ضروریاتِ دین کا منکر ہو، تو گو اہلِ قبلہ میں سے ہو، اس کی تکفیر کی جائے گی اور اس میں کسی کا اختلاف نہیں (۲) —— اس لئے قادیانی بہرحال کافر، زندیق اور خارج از اسلام ہیں۔ ھذا اھم اللہ و باللہ التوفیق۔

تکفیر کے اصول اور افراط و تفریط سے اجتناب

کفر و ایمان کا مسئلہ نہایت نازک اور اہم ہے، نہ یہ صحیح ہے کہ کوئی شخص کیسے بھی اعتقادی فساد میں مبتلا ہو، دین اور احکامِ دین کا

---

(۱) شرح فقہ اکبر، ص: ۲۳۰۔ (۲) رد المحتار: ۱/۱۳۴ کتاب الصلوٰۃ۔

استہزاء کرتا ہو، شریعت کے بعض مسلمہ حقائق کا منکر ہو اور اپنے قول یا عمل کے ذریعہ کفر کی سرحد میں داخل ہو چکا ہو مگر مسلمان ہوں کہ مصر ہوں کہ ہم ان لوگوں کو بہر حال کافر ہونے نہ دیں گے۔ اس لئے کہ اسلام مخصوص قسم کے نام اور آبائی اور خاندانی روایات کا نام نہیں بلکہ کچھ حقیقتوں سے عبارت ہے، جن پر یقین کرنا ایمان کیلئے شرط اولیں ہے۔

اسی طرح یہ افراط بھی صحیح نہیں کہ انسان ہر وقت کفر کی شمشیر برہنہ اپنے ہاتھ میں لئے رہے اور ہر چھوٹے بڑے اختلافات پر مخالف کو کافر قرار دینے سے کم پر راضی نہ ہو، پھر قرآن پاک نے اس بات کو منع کیا ہے کہ تحقیق و تفتیش کے بغیر کسی کے کافر ہونے کا فیصلہ کر دیا جائے۔ اس کی اس درجہ تاکید کی گئی کہ عین میدان جنگ میں دشمن زیر ہوتے ہوتے دعویٰ ایمان کرے تو گو شبہ اس کے جھوٹے ہونے پر موجود ہے لیکن اب بھی تحقیق کے بغیر قدم نہ اٹھایا جائے (نساء — ۹۴) اسی لئے فقہاء نے اس پر مستقل بحث کی ہے کہ کون سے الفاظ و افعال کفر کا باعث ہوں گے اور انسان ان کی وجہ سے دائرۂ ایمان سے نکل جائے گا۔

اس لئے کفر کے سلسلہ میں کچھ ضروری اصول درج کئے جاتے ہیں:

۱۔ کوئی بھی ایسا عمل جس کے ذریعہ دین کا استہزاء یا استخفاف ہوتا ہو، کفر کا باعث ہے۔ مثلاً کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ میری سمجھ میں نہیں آتا، اللہ نے قرآن میں یہ بات کیوں لکھ دی؟ تو یہ باعث کفر ہے[1]۔

اسی طرح قرآن مجید کے بے محل اور مزاحاً استعمال سے خوب بچنا چاہیئے کہ مبادا قرآن کے ساتھ استہزاء نہ ہو جائے اور ایسی

---

(۱) شرح فقہ اکبر ص: ۲۴۹۔ نیز دیکھئے رد المحتار ۳/۲۸۴۔

صورت میں اس کا یہ عمل کفر و ارتداد نہ قرار پائے، قرآنی آیات کو بطورِ ہزل و مزاح کے پڑھنا کفر ہے اور کسی آیتِ قرآنی کو بے محل پڑھنا، مثلاً لوگوں کا اژدحام ہو اور کہا جائے "فجمعناھُم جمعاً"، تو یہ خلاف احتیاط ہے اور اندیشۂ کفر ہے (۱)

۲۔ کسی جبر و اکراہ کے بغیر زبان پر کلمۂ کفر کا اجراء، خواہ دل ایمان پر مطمئن ہو، کفر ہے (۲)، اس لئے کہ صرف جبر و اکراہ کی حالت میں جان بچانے ہی کے لئے کراہت خاطر کے ساتھ کفریہ کلمات کا تکلم کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔

۳۔ اللہ تعالیٰ کی ایسی صفت جو آپ ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ غیر اللہ کے لئے اس کو ثابت کرنا بھی کفر کا باعث ہے۔ مثلاً علم غیب کا مسئلہ ہے عالم الغیب ہونا اللہ ہی کا وصفِ خاص ہے۔ اگر کوئی شخص حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی عالم الغیب سمجھے تو سلف نے اس کو کافر قرار دیا ہے۔ ملا علی قاری کا بیان ہے :۔

وذکر الحنفیۃ تصریحاً بالتکفیر باعتقاد ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یعلم الغیب لمعارضۃ قولہ تعالیٰ قل لایعلم من فی السمٰوٰت والارض الغیب الا اللہ (۳)	حنفیہ نے اس عقیدہ کو صراحۃً باعثِ کفر قرار دیا ہے کہ رسول اللہؐ علمِ غیب رکھتے تھے، اسلئے کہ یہ آیت قل لایعلم من فی السموات والارض الغیب الا اللہ کے خلاف ہے۔

---

(۱) شرح فقہ اکبر ص : ۲۵۰۔

(۲) رد المحتار علیٰ ہامش ۲/۲۸۳۔

(۳) شرح فقہ اکبر : ۲۲۵۔

اگر کوئی شخص آپؐ کے عالم الغیب ہونے کی تاویل کرتا ہو اور علم ذاتی اور علم عطائی کا فرق کرتا ہو تو بھی یہ قرآن کی اطلاع صریح کے خلاف ہونے کی وجہ سے ضلالت وگمراہی ہی ہے اور اگر ہم ایسا عقیدہ رکھنے والوں کو کافر نہ بھی کہیں تو اتنا کہنا ہی ہوگا کہ اندیشۂ کفر ضرور ہے۔

———— اعاذنا اللہ منہ۔

۴۔ اسی طرح کوئی معصیت خواہ کبیرہ ہو یا صغیرہ ان کو معمولی سمجھنا اور جائز و حلال قرار دینا باعثِ کفر ہے (۱) کیوں کہ وہ ایک ایسی بات کا انکار کر رہا ہے جو دین میں قوی اور بے ریب دلیلوں سے ثابت ہے۔ امام سرخسی نے لکھا ہے کوئی شخص حائضہ عورت سے وطی کو جائز قرار دے تو یہ بھی کفر ہے۔(۲)

۵۔ کوئی شخص ضروریات دین کا منکر ہو، یعنی ایسے کسی حکم کا منکر ہو جو اجماع یا دلیلِ قطعی سے ثابت ہو تو کافر سمجھا جائے گا۔ علامہ ابن ہمامؒ نے موجباتِ کفر کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے: وکذا مخالفۃ ما اجمع علیہ وانکارہ بعد العلم (۳)

اسی طرح ملا علی قاری کا بیان ہے:

وفی جوهر الفقه من جحد فرضاً مجمعا علیه کالصوم والصلوٰة والزکوٰة والغسل من الجنابة کفر. قلت وفی معناه من انکر حرمة	جواہر الفقہ میں ہے کہ جو کسی اجماعی فرض جیسے روزہ، نماز، زکوٰۃ، غسلِ جنابت کا انکار کر جائے وہ کافر ہے، میں کہتا ہوں جو کسی اجماعی حرام کی حرمت کا انکار کر جائے

---

(۱) شرح فقہ اکبر ص: ۲۲۵۔

(۲) حوالۂ مذکور ص: ۲۲۷۔

(۳) حوالۂ مذکور ص: ۲۲۶۔

محرم مجمع علیہ (۱) اس کا بھی یہی حکم ہے۔

خاص طور پر احکام دین کے ساتھ استہزاء اور کسی حکم شرعی کے انکار سے خوب ڈرنا چاہیئے کہ باتوں باتوں میں اور ہنسی مذاق کی مجلسوں میں اس طرح کی باتیں نکل جاتی ہیں جو موجبِ کفر ہیں اور آدمی کو اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔ جیسے ڈاڑھی، مسواک وغیرہ کی تضحیک، یا روزہ وغیرہ کے بارے میں یہ کہنا کہ مجھے اشیاء خورد و نوش کی کمی تھوڑا ہی ہے کہ میں روزہ رکھوں وغیرہ کہ ان ساری باتوں میں کفر کا اندیشہ ہے۔

جیسے زبان سے کفریہ باتوں کا کہنا انسان کو دائرۂ ایمان سے خارج کر دیتا ہے اسی طرح کوئی ایسا کام کرنا جو صریحاً کفر کا ہو، یہ بھی موجبِ کفر ہے، مثلاً ایک شخص زبان سے کچھ نہیں کہتا لیکن بت کو سجدہ کرتا ہے۔ غیر اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہوتا ہے تو یہ عمل بھی کفر ہی کا ہوگا (۲)

فقہ کی کتابوں میں ایسی جزئیات کثیر تعداد میں موجود ہیں جن کی وجہ سے کسی شخص کے کافر ہونے کا فیصلہ کیا جائے، فقہاء نے ارتداد کے باب میں بالعموم اس مسئلہ کا ذکر کیا ہے —— یہاں راقم سطور نے ان جزئیات کو ایک ایک کر کے ذکر کرنے کے بجائے بنیادی اصول و قواعد مقرر کر دیئے ہیں جن کی روشنی میں پیش آنے والی جزئیات کے احکام جانے جا سکتے ہیں تاہم چوں کہ تکفیر کا مسئلہ نہایت نازک ہے اور ممکن حد تک اہلِ قبلہ کی تکفیر سے بچنا ضروری ہے اسلئے عوام کو بطور خود کسی کے کفر و ایمان کا فیصلہ نہیں کرنا چاہیئے، بلکہ محتاط اور مستند علماء اور مفتیوں سے رجوع کرنا چاہیئے۔

---

(۱) شرح فقہ اکبر ص: ۲۵۷۔ (۲) حوالۂ مذکور، ص: ۲۲۶۔

تیسرا باب

صفائی ستھرائی اور امورِ فطرت

طہارت و پاکیزگی اور صفائی ستھرائی انسانی فطرت ہے اور اس کا اثر نہ صرف جسمانی صحت بلکہ اخلاقی حالت اور فکر و خیال پر بھی پڑتا ہے جس کا اندازہ ان قوموں اور طبقوں کی پستی خیال اور فکری انحطاط سے کیا جاسکتا ہے جو گندی حالت میں رہنے، گندی چیزیں کھانے اور گندے کام کرنے کی خوگر ہیں، اسلام نے قدم قدم پر پاکی اور صفائی کا حکم دیا ہے، ہر دن پانچ وقت کی نماز فرض کی اور ان کے ساتھ وضوء کو ضروری قرار دیا، نفلی عبادت اور قرآن مجید کو چھونے کے لئے بھی وضوء کا حکم دیا، اس طرح جسم کے وہ اعضاء جو کھلے رہتے ہیں اور نسبۃً زیادہ غبار آلود ہوتے ہیں ہاتھ، پاؤں، چہرہ اور سر کے بال، وہ بار بار دھلتے رہتے ہیں۔ سارے کام ہاتھ سے کئے جاتے ہیں اس لئے ہاتھ کی صفائی پر زیادہ توجہ کی ضرورت تھی اس لئے وضوء میں کہنیوں تک دھونے کا تو حکم دیا ہی گیا گٹے تک کا حصہ خاص طور پر مزید تین دفعہ دھلوایا گیا۔ ناک کی صفائی کے لئے ناک میں پانی ڈالنے کا حکم ہوا اور منھ کی صفائی کے لئے کلی کا، دانتوں کی صفائی مسواک کے ذریعہ مؤکد کی گئی، سو کر اٹھا جائے تو خصوصیت سے تین بار ہاتھ دھویا جائے کہ معلوم نہیں رات میں کہاں کہاں ہاتھ پہونچا (۱)

---

(۱) ترمذی عن ابی ہریرۃ باب ما جاء اذا استیقظ من منامہ ۱/۱۳۔

پورے جسم کا دھونا بھی ضروری تھا اس لئے ہفتہ میں ایک بار پورے جسم کے دھونے کی تدبیر کی گئی کہ اس کو جمعہ کے لئے مسنون قرار دیا گیا اور آپؐ نے خاص اہتمام کے ساتھ اس کی تاکید فرمائی (۱)، جوان اور نوجوان جو زیادہ محنت اور مشقت کرتے ہیں اور ان کے جسم سے زیادہ پسینہ نکلتا ہے اور بدن میں میل جمع ہوتا ہے ان کے لئے ایک ایسی بات کو غسل کا سبب قرار دیا گیا کہ خواہی نہ خواہی بار بار غسل کی نوبت آئے یعنی جماع اور انزال، ان دونوں کی وجہ سے غسل واجب قرار پایا، کپڑے صاف رکھنے کا حکم فرمایا گیا، بال میں کنگھی کرنے کی تلقین کی گئی۔
خوشبو کے استعمال کو پسند فرمایا گیا، موئے زیر ناف اور بغل کے بال کی صفائی کی سنت جاری کی گئی۔ کپڑا یا جسم پر کہیں پیشاب، پائخانہ وغیرہ ناپاک چیزیں لگ جائیں تو ان کا دھونا ایسا لازم قرار دیا گیا کہ اس کے ساتھ نماز ہی صحیح نہ ہو۔ اس طرح اسلام نے صرف صفائی ستھرائی کا حکم ہی نہ دیا بلکہ اس کے لئے ایک مکمل عملی نظام قائم کر دیا اور پیغمبر اسلام ؐ نے اپنے عمل اور اسوۂ مبارکہ کے ذریعہ اس کو پوری طرح واضح اور بے غبار نیز سہل و آسان بھی فرما دیا۔

قضاء حاجت اور استنجاء کے آداب

انہیں احکام میں سے ایک استنجاء اور قضاء حاجت ہے، آپؐ نے اس سلسلہ میں وہ ہدایات دیں جن میں صفائی ستھرائی کا لحاظ بھی ہے، شرم و حیا کا پاس و خیال بھی اور صحت و تندرستی کی رعایت بھی۔
شرم و حیا کے باب میں عرب اس درجہ پست ہو چکے تھے کہ قضاء حاجت کے وقت ستر کو مضحکہ خیز تصور کرتے تھے۔ آپؐ نے اس کو ضروری قرار دیا اور فرمایا کہ

---

(۱) ترمذی عن اوس بن اوس باب فی فضل الغسل یوم الجمعۃ ۱/۱۱۱۔

اگر کچھ اور سامانِ ستر نہ ہو تو کم سے کم ریت کا ایک ڈھیر ہی بنا کر اس کی اوٹ میں بیٹھے کہ بے پردگی نہ ہو (۱) خود آپؐ کا معمول تھا کہ قضاء حاجت کے لئے دور نکل جاتے (۲) اور کھجور کے بن وغیرہ میں تشریف لے جانے کو زیادہ پسند فرماتے (۳) بیٹھنے کے قریب ہوتے تو کپڑے اٹھاتے (۴) موجودہ زمانہ کے تعمیر شدہ بیت الخلاء کی طرح مکانی بیت الخلاء میں بھی قضاء حاجت ثابت ہے (۵) اس بات کو بھی منع فرمایا کہ دو آدمی قضاء حاجت کرتے ہوئے باہم گفتگو کریں اور فرمایا کہ اس پر اللہ غضبناک ہوتے ہیں (۶) آپؐ پیشاب کر رہے تھے ایک گذرنے والے نے سلام کیا تو آپؐ نے جواب مرحمت نہیں فرمایا (۷) کہ اس حالت میں گفتگو بھی تقاضاء حیا کے خلاف ہے۔

بیت الخلاء میں داخل ہو اور اس کے پاس کوئی ایسی شئ ہو کہ جس میں اللہ تعالیٰ کا ذکر ہو تو اس کو نکال کر باہر رکھ دینا مستحب ہے (۸) حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ آپؐ جب ضرورت کو جاتے تو اپنی انگوٹھی رکھ جاتے (۹) کیوں کہ آپؐ کی انگوٹھی میں "محمد رسول اللہ" کندہ تھا۔ اگر باہر چھوڑنے میں حفاظت دشوار ہو اور اپنے پاس جیب میں رکھ لے تو بھی حرج نہیں، چنانچہ فقہاء نے اس بات

---

(۱) ابوداؤد عن ابی ہریرۃ، باب الاستتار فی الخلاء ۱/۶۔

(۲) ابوداؤد عن مغیرہ باب التخلی عند قضاء الحاجۃ ۱/۲۔

(۳) ابن ماجہ عن عبد اللہ بن جعفر، باب الارتیاد للغائط والبول ص: ۲۸۔

(۴) ترمذی باب فی الاستتار عند الحاجۃ ۱/۱۰۔

(۵) نسائی شریف ۱/۱۰۔

(۶) ابوداؤد عن ابی سعید خدری، باب کراہیۃ الکلام عند الخلاء ۱/۳۔

(۷) ابوداؤد باب فی الرجل یرد السلام وھو یبول ۱/۳۔ (۸) المغنی ۱/۱۰۷۔

(۹) ابوداؤد ۱/۴ عن انس باب الخاتم یکون فیہ ذکر اللہ یدخل بہ الخلاء۔

کی اجازت دی ہے کہ انگوٹھی کا نگینہ اندر کی طرف موڑ لے یا اس چیز کو جس پر اللہ کا ذکر ہو اس طرح محفوظ کر لے کہ گرنے کا اندیشہ نہ ہو تو یہ بھی درست ہے (۱)، اسی لئے اگر سکہ وغیرہ پر آیت لکھی ہو تو اس کو ساتھ لے کر بیت الخلاء جا سکتے ہیں (۲)۔

پیشاب کرتے ہوئے چھینٹ وغیرہ سے بچنے کی حتی المقدور سعی کی جائے اسی لئے آپ نے بیٹھ کر پیشاب کرنے کو پسند فرمایا، حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ کوئی شخص آپ کا کھڑے ہو کر پیشاب کرنا نقل کرے تو اس کی تصدیق نہ کرو (۳) ہاں کوئی عذر ہو تو حرج نہیں، چنانچہ بعض مواقع پر غالباً کسی عذر کی وجہ سے آپ نے کھڑے ہو کر بھی پیشاب کیا ہے (۴) نرم جگہ کا پیشاب کیلئے انتخاب کرے تاکہ چھینٹ نہ پڑے، خود آپ نے اس کی ہدایت فرمائی ہے (۵)۔ اسی طرح ہوا کے رُخ پر پیشاب نہ کیا جائے کہ اس میں بھی نجاست سے آلودگی کا اندیشہ ہے (۶) —— آجکل ایسی وضع کے پیشاب خانے عوامی مقامات پر بنائے گئے ہیں کہ کھڑے ہو کر ہی وہاں پیشاب کیا جا سکتا ہے، یہاں چوں کہ مجبوری ہے اس لئے حرج نہیں لیکن عام حالات میں سنتِ نبوی بیٹھ کر پیشاب کرنا ہے۔

جہاں قضاء حاجت مکروہ ہے:

ایسے مقامات پر بھی قضاء حاجت نہیں کرنی چاہیے جس سے دوسروں

---

(۱) المغنی ۱/۱۰۸۔ (۲) حوالۂ سابق۔

(۳) رواہ الترمذی وقال ہذا اصح شئی فی الباب ۱/۹۔

(۴) ترمذی عن مغیرہ بن شعبہ، باب ماجاء من الرخصۃ ۱/۹۔

(۵) ابوداؤد عن ابی موسیٰ ۱/۲۔

(۶) المغنی ۱/۱۰۷۔

کو دقت ہو اور لوگ بُرا بھلا کہنے پر مجبور ہوں، رہگذر پر کہ چلنے والوں کو پریشانی ہوگی، سایہ دار جگہ میں کہ مسافرین ٹھہر سکیں، تالاب، چشمے، حوض اور پانی کی جگہ (موارد) پر (۱) کہ یہ بھی عامۃ الناس کے لئے تکلیف کا باعث ہے، اسی طرح لوگوں کے بیٹھنے اور بیٹھ کر گفتگو وغیرہ کرنے کے مقامات پر بھی قضاء حاجت مکروہ ہے (۲)

آپؐ کی رحمتِ عامہ نے صرف انسان ہی کا نہیں دوسری مخلوقات کا بھی لحاظ رکھا ہے، چنانچہ سوراخ میں پیشاب کرنے سے منع فرمایا (۳) کہ اس سے حشرات الارض کو اذیت ہوگی اور ممکن ہے کہ خود انسان کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے کہ کوئی کیڑا مکوڑا ڈس لے ——— پھلدار درخت کے نیچے بھی اس سے اجتناب کرے (۴) قبر پر اور قبر کے پاس استنجاء کرنا مکروہ ہے، مسجد میں بھی استنجاء کرنا حرام ہے گو مخصوص برتن میں کیا جائے اور مسجد آلودہ نہ ہو (۵) ہاں گھر میں استنجاء کے لئے کوئی برتن مخصوص رکھا جائے اور اس میں پیشاب کیا جائے تو ضرورۃً ایسا کیا جا سکتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھی اس طرح کا ایک برتن رہتا تھا (۶)۔

پانی کو نجاست سے بچانے کا اہتمام کیا جائے۔ اس کی آپ صلعم نے خصوصیت سے تاکید فرمائی ہے۔ ارشاد ہوا کہ ٹھہرے ہوئے پانی میں ہرگز پیشاب نہ کیا جائے (۷) منشا یہ نہیں ہے کہ بہتے ہوئے پانی میں پیشاب کیا جا سکتا ہے بلکہ

---

(۱) اتقوا الملاعن الثلاث: البراز فی الموارد وقارعۃ الطریق والظل، ابوداؤد عن معاذ ۱/۵۔

(۲) فتح العزیز مع شرح مہذب ۱/۴۶۱۔

(۳) نہی ان یبال فی الجحر، نیل الاوطار ۱/۸۴ بحوالہ ابوداؤد عن عبداللہ بن سرجس۔

(۴) فتح العزیز ۱/۴۶۵۔

(۵) الفقہ الاسلامی وادلتہ ۱/۲۰۶۔

(۶) المغنی ۱/۱۱۰۔ (۷) بخاری ۱/۳۷۔

ٹھہرے ہوئے کم پانی میں پیشاب کرنے سے پانی بہر طور ناپاک ہو جائے گا، اس لئے زیادہ تاکید مقصود ہے، یوں پیشاب زیادہ اور جاری پانی میں بھی کرنا کراہت سے خالی نہیں کہ طبعی نظافت کے خلاف ہے اور کثرت کی وجہ سے اگر پانی کے اوصاف (رنگ، بو، مزا) بدل جائیں تو پانی ناپاک بھی ہو جائے۔[1] اسی طرح غسل خانہ میں بھی استنجار کرنے کو آپؐ نے بہ تاکید منع فرمایا (۲)

مستحب ہیئت

قضاء حاجت کی حالت میں نشست ایسی ہو کہ آسانی سے اجابت ہو جائے اور پیشاب پوری طرح باہر آجائے، ایک روایت میں ہے کہ بائیں پہلو پر بیٹھا جائے اور دائیں پہلو کو سیدھا رکھا جائے (۳) اور آبدست کرتے ہوئے جسم کو ڈھیلا رکھا جائے اور دونوں ٹانگوں کے درمیانی حصہ کو فراخ (۴) ضرورت سے زیادہ اس جگہ نہ بیٹھے کہ اس سے بعض بیماریوں کے بھی پیدا ہونے کا اندیشہ ہے اور اس کی وجہ سے دوسرے اہلِ ضرورت کو زحمت انتظار بھی ہوتی ہے (۵) فی زمانہ بیت الخلاء کا جو مغربی طرز کا بیسن ایجاد ہوا ہے اس میں قضاء حاجت مسنون طریقہ پر بیٹھ کر نہیں کی جاسکتی اور مجھے تو خیال ہوتا ہے کہ یہ خلافِ فطرت بھی ہے اس لئے اس سے بچنا چاہئے جہاں مجبوری ہو وہاں اس سے استفادہ کے سوا چارہ نہیں۔

---

(۱) المغنی ۱/۱۰۸۔

(۲) ابوداؤد عن بن مغفل ۱/۵۔

(۳) المغنی ۱/۱۰۸ بحوالہ طبرانی عن سراقہ بن مالک۔

(۴) خلاصۃ الفتاویٰ ۱/۲۴۔

(۵) المغنی ۱/۱۰۹۔

قضاء حاجت کی حالت میں سر ڈھکنا چاہیے کہ حضرت ابوبکر رضؓ سے ایسا ہی مروی ہے اور جوتا یا چپل وغیرہ بھی پہنے کہ پاؤں آلودہ نہ ہو (۱) جاتے ہوئے پہلے بایاں پاؤں رکھے اور نکلتے ہوئے پہلے دایاں قدم نکالے (۲) کہ دائیں حصہ کو بائیں حصہ پر جو شرف بخشا گیا ہے اس کا یہی تقاضا ہے۔ استنجاء میں دائیں ہاتھ کو شرمگاہ سے نہ لگائے کہ آپؐ نے منع فرمایا ہے (۳)۔

دعائیں :

آپؐ سے اس موقع کیلئے دعا بھی منقول ہے، قضاء حاجت سے پہلے یہ دعا پڑھے :

اعوذ باللہ من الخبث والخبائث میں نر و مادہ جنات سے خدا کی پناہ میں آتا ہوں۔

اس میں "خبث" ب کے سکون کے ساتھ بھی پڑھا جا سکتا ہے اور پیش کے ساتھ "خُبُث" بھی، دونوں طرح روایت کیا گیا ہے (۴) اور معنی میں بھی فرق نہیں ہے۔ "خبث" سے شیطان ذکور اور "خبائث" سے شیاطینِ اناث مراد ہیں (۵) دراصل گندگی کے ایسے مقامات شیاطین کی خاص قیام گاہیں ہیں اس لئے اس موقعہ پر ان سے پناہ چاہی گئی۔

اگر صحرا اور میدان میں قضاء حاجت کرے تو کپڑے کھولنے اور اٹھانے سے پہلے دعا پڑھ لے۔ تعمیر شدہ بیت الخلاء میں جائے تو داخل ہونے سے

---

(۱) المغنی ۱/۱۰۹۔

(۲) حوالۂ سابق۔

(۳) ترمذی، باب کراہیۃ الاستنجاء بالیمین عن ابی قتادۃ ۱/۱۰۔

(۴) ترمذی ۱/۷، باب مایقول اذا دخل الخلاء۔

(۵) حاشیہ ابی داؤد ص: ۲۔

پہلے پہلے نہ پڑھ سکا اور بیٹھنے یا داخل ہونے کے بعد یاد آیا تو دل ہی دل میں پڑھ لے، زبان سے تلفظ نہ کرے کہ ایسی حالت میں اللہ کا نام لینا مکروہ ہے چھینک بھی آئے تو دل ہی دل میں الحمد للہ کہے، زبان سے نہ بولے (۱)

ضرورت سے فراغت اور بیت الخلاء سے نکلنے کے بعد آنحضورؐ سے دو دعائیں منقول ہیں:

غفرانک (۲) — آپ تعالیٰ کی مغفرت کا طلبگار ہوں۔

اور

الحمد للہ الذی اذھب عنی الاذی وعافانی (۳) — تمام تعریف خدا کے لئے جس نے مجھ سے ایک تکلیف دہ شئی کو دور فرمایا اور عافیت عطا فرمائی۔

دونوں میں سے ایک دعا بھی کافی ہے، دونوں کو جمع کرلینا بہتر ہے۔ مغفرت اس لئے طلب کی گئی کہ اتنا وقت خدا کے ذکر سے خالی گذرا اور شکر تو ظاہر ہے کہ غذا کا فاسد حصہ اگر جسم سے باہر نہ نکلے تو ایسی اذیت ہے کہ شاید اس سے بڑھ کر اذیت کا تصور بھی مشکل ہے، یہ خدا ہی کی قدرت اور اس کا بے پایاں احسان ہے کہ اس نے کسی انسانی محنت کے بغیر از خود اس کو اس تکلیف سے نجات بخشی ہے اور صحت وعافیت اور سکون وراحت سے سرفراز فرمایا ہے۔

قبلہ کا استقبال واستدبار

جو چیزیں فی الجملہ کسی خاص نسبت کی وجہ سے قابلِ احترام ہیں،

---

(۱) المغنی ۱/۱۰۹۔

(۲) ترمذی ۱/۷ باب مایقول اذا خرج من الخلاء۔

(۳) ابن ماجہ ص: ۲۶ باب مایقول اذا خرج من الخلاء۔

شریعت نے استنجاء کی حالت میں ان کی طرف رُخ کرنے سے منع فرمایا ہے اور خود پیغمبر اسلام ہی نے بہ نفسِ نفیس ان کی تعیین بھی فرمادی ہے ان میں سب سے اہم قبلہ کا استقبال اور استدبار ہے۔ استقبال سے مراد قبلہ کی طرف چہرہ کرنا ہے اور استدبار سے اس کی طرف پشت کرنا مراد ہے۔ حضرت ابو ایوب انصاریؓ سے مروی ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ جب تم ضرورت کو جاؤ تو پیشاب پائخانہ کرتے ہوئے نہ قبلہ کی طرف رُخ کرو اور نہ پشت (۱)۔

بعض فقہاء نے استقبال اور استدبار میں فرق کیا ہے اور بعضوں نے عمارت کے اندر استقبال اور استدبار کی اجازت دی ہے، صحرا میں منع کیا ہے (۲) مگر صحیح یہی ہے کہ ہر حال میں مکروہ ہے کہ ایک تو آپؐ نے مطلق منع فرمایا ہے اور کوئی فرق اپنے ارشادات میں ظاہر نہیں فرمایا، دوسرے مقصود احترامِ قبلہ ہے اور وہ بہر صورت قابلِ احترام ہے، اس میں شبہ نہیں کہ بعض روایات میں خود آپؐ کا عمل استقبال و استدبار کا نقل کیا گیا ہے مگر اول تو وہ روایات اس درجہ قوی نہیں ہیں۔ دوسرے آپؐ کا یہ عمل ممکن ہے کسی عذر کی بنا پر ہو اس لئے کہ آپؐ کے فرمودات اور زبانی ارشادات سے کہیں اس کا جائز ہونا معلوم نہیں ہوتا۔

حدیث میں تو ذکر نہیں لیکن فقہاء نے چاند اور سورج کی طرف بلا پردہ شرمگاہ کا رخ کرکے استنجاء کرنے سے بھی منع کیا ہے، ہاں اگر سامنے دیوار یا کوئی ساتر شئی موجود ہو تو مضائقہ نہیں (۳)

---

(۱) اس کو سوائے ابن ماجہ کے صحاح ستہ کے تمام مصنفین اور امام مالک نے روایت کیا ہے، ملاحظہ ہو: جامع الاصول الباب الثالث من کتاب الطہارۃ ۷/۱۲۰۔

(۲) ترمذی فی النہی عن استقبال القبلۃ بغائط او بول ۱/۸۔ (۳) المغنی ۱/۱۰۷۔

استنجار کے ذرائع

استنجار بائیں ہاتھ سے کرے، صرف پانی یا صرف پتھر کا استعمال بھی کرسکتے ہیں، پانی سے کرنا بہ مقابلہ پتھر وغیرہ کے بہتر ہے اور اس سے بھی بہتر ہے کہ پہلے پتھر یا ڈھیلوں کا استعمال کیا جائے پھر پانی کا (۱)، فی زمانہ کاغذ کا استعمال جو خاص اسی مقصد کے لئے بنایا جاتا ہے، پتھر کے حکم میں ہے، آبدست میں کم سے کم حصہ کا استعمال ہو۔ تین انگلیوں سے کام چل جائے تو زیادہ بہتر ہے (۲) پتھر ہوں تو تین بار استعمال کرنا زیادہ بہتر ہے، آپؐ نے اس کی ہدایت فرمائی ہے (۳)، لیکن اصل مقصود یہ ہے کہ نجاست زائل ہوجائے، آپؐ نے دو پتھروں پر بھی اکتفا فرمایا ہے (۴)، یہی اصول پانی میں بھی ہے، جتنی بار دھونے میں پوری طرح صاف ہونے کا گمان ہوجائے، اتنی بار دھوئے، تعداد کی کوئی قید نہیں (۵)، استنجار سے پہلے اور استنجار کے بعد ہاتھ دھونا مستحب ہے (۶)

ناپاک چیزوں سے آپؐ نے استنجار کرنے سے منع فرمایا ہے۔ آپؐ نے خاص طور پر جانور کے فضلہ (لید) کا ذکر کیا ہے، ہڈی سے بھی استنجار کرنے سے روکا ہے کہ جنوں کی غذا کا کام دیتی ہے (۷)، چکنے قابلِ تحریر کاغذ سے بھی استنجار نہیں کرنا چاہیے (۸)

---

(۱) خلاصۃ الفتاویٰ ۱/۲۴۔ (۲) حوالۂ سابق

(۳) ترمذی باب الاستنجار بالحجارۃ عن عبدالرحمٰن بن یزید ۱/۱۰۔

(۴) ترمذی باب الاستنجار بالحجرین ۱/۱۰۔ امام شافعی اور امام احمد کے نزدیک کم سے کم تین پتھر ضروری ہیں۔

(۵) خلاصۃ الفتاویٰ ۱/۲۴۔

(۶) حوالۂ سابق۔

(۷) ترمذی باب کراہیۃ ما یستنجی بہ ۱/۱۱۔

(۸) ردالمحتار ۱/۲۲۷۔

استبرار:

استنجار کے بعد بعض اوقات پیشاب کے قطرات پوری طرح نکل نہیں پاتے، ان قطرات کے اخراج کے لئے جو بھی تدبیر کی جائے، فقہار کی زبان میں استبرار کہلاتا ہے، استبرار کی مختلف لوگوں کے لئے ان کی عادت کے مطابق مختلف طریقے ہوسکتے ہیں، کھانسنا، کھڑا ہونا، چند قدم چلنا وغیرہ (۱) ابن قدامہ نے یہ طریقہ بھی لکھا ہے کہ فوطوں کے نیچے کے حصہ پر ہاتھ رکھے اور اوپر کی طرف لے جائے اور تین بار عضو تناسل کو حرکت دے (۲) خواتین اپنے ہاتھ کی انگلیاں مثانہ کے حصہ پر رکھیں (۳)

استبرار کے سلسلہ میں ایک خاص بات کی طرف توجہ دلانی مناسب ہوگی جس میں عام طور پر دیندار حضرات بھی مبتلا ہیں اور جو بظاہر ناشائستہ طریقہ محسوس ہوتا ہے یعنی پیشاب کے بعد جسم سے ڈھیلے لگا کر اور پائجامہ میں ہاتھ رکھ کر ٹہلنا، علامہ مرتضیٰ زبیدی نے اس کے بارے میں لکھا ہے :-

واذا قام لیستبرئ فلا یخرج	استبرار کیلئے کھڑا ہو تو لوگوں کے درمیان
بین الناس وذکرہ فی یدہ وان کان	اس طرح نہ نکلے کہ اس کا عضو مخصوص اس کے
تحت ثوبہ فان ذلک مثلۃ	ہاتھ میں ہو، گو کپڑے کے اندر ہو کہ یہ
وشوہ، فکثیرا ما یفعل بعض الناس	ایک طرح کا مثلہ اور مجموعی ہیئت کا بگاڑ
ھذا۔ وقد نھی عنہ فان کانت لہ	ہے، بہت سے لوگ ایسا کرتے ہیں آپ
ضرورۃ فی الاجتماع بالناس اخ	نے اس سے منع فرمایا ہے، اگر لوگوں کی

---

(۱) درمختار ۱/۲۳۰۔

(۲) المغنی ۱/۱۰۳۔

(۳) تمۃ الاسلامی وادلتہ ۱/۱۹۵۔

ذالك فليجعل على فرجه خرقة لیشدھا علیه ثم يخرج الناس فاذا فرغ من ضرورته منظف اذذالك ۔ (۱)

موجودگی میں استبراء کی ضرورت پڑ جائے تو اپنے عضو مخصوص پر کوئی کپڑا باندھ لے پھر جب لوگ چلے جائیں تو اپنی ضرورت سے فارغ ہونے کے بعد اس جگہ کو صاف کرلے ۔

موجودہ زمانہ میں جانگیہ اس کپڑے کی ضرورت کو پورا کرتا ہے ۔

استنجاء کے بعد اگر وسوسہ پیدا ہوتا ہو اور یہ شبہ عادۃً ستاتا رہتا ہو کہ شاید پیشاب کے قطرات نکل گئے ہوں تو مستحب ہے کہ شرمگاہ اور پائجامہ پر پانی کی چھینٹ ماردیں کہ خود حدیث میں اس کا ذکر موجود ہے[۲]۔

استنجاء کا حکم

اگر نجاست اپنے مخرج پر محدود رہے تو امام ابوحنیفہ کے نزدیک استنجاء واجب نہیں صرف سنت ہے ۔۔۔ ایک درہم کی مقدار سے بڑھ جائے تو واجب ہے ، مقدار درہم سے ہتھیلی کا گہرا حصہ مراد ہے ، دوسرے فقہاء کے ہاں کم ہو تب بھی واجب ہے (۳) اگر نجاست مخرج سے بڑھ جائے تو اکثر فقہاء کے نزدیک پتھر اور ڈھیلوں کا استعمال کافی نہیں ، پانی ہی کا استعمال ضروری ہے (۴)

مسواک :

---

(۱) الاتحاف علی الاحیاء ۲/ ۳۴۵ ۔

(۲) ترمذی باب فی النضح بعد الوضوء ۱/ ۱۷ ۔

(۳) فتح العزیز مع المجموع ۱/ ۴۵۶ ۔

(۴) دیکھئے المغنی ۱/ ۱۰۵ ، خلاصۃ الفتاوی ۱/ ۲۴ ۔

مسواک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اہم ترین سنتوں میں سے ہے۔
آپؐ نے اس کی غایت درجہ تاکید فرمائی ہے، آپؐ نے فرمایا کہ اگر مجھے اپنی امت پر دشواری کا خیال نہ ہوتا تو میں ان کو مسواک کا حکم دیتا (۱) یعنی واجب قرار دیتا۔ خود آپؐ کا معمول کثرت سے مسواک کرنے کا تھا۔ وفات سے چند ساعت قبل جب اتنی قوت بھی نہ تھی کہ خود مسواک کر سکیں، آپؐ کی نگاہ شوق کا اشارہ بھانپ کر ام المؤمنین حضرت عائشہؓ نے مسواک نرم کر کے دندانِ مبارک پر پھیر دی (۲) اسی لئے مسواک کے مسنون ہونے پر علماء کا اتفاق ہے۔

مسواک کے مواقع

یوں تو جس قدر مسواک کی جائے باعث اجر ہے لیکن پانچ مواقع پر مسواک کی اہمیت زیادہ ہے، نماز سے پہلے فرض ہو یا نفل اور وضو کر کے نماز ادا کی جائے یا تیمم کر کے۔ دوسرے جب دانت زرد ہو جائیں، تیسرے وضو سے پہلے، چوتھے قرآن مجید کی تلاوت کے وقت، پانچویں جب منہ میں خلو معدہ، کسی خاص چیز کے کھانے یا کسی اور وجہ سے بُو پیدا ہو جائے (۴) اذرعی نے دو اور صورتوں کا اضافہ کیا ہے۔ سونے سے پہلے اور نیند سے بیدار ہونے کے بعد (۵) زبیدی نے دو اور صورتیں بڑھائی ہیں، ہم بستری سے پہلے اور باہر سے گھر واپس آنے کے بعد (۶)، تاہم نماز اور وضوء کے موقعوں پر مسواک کی آپؐ نے خاص ہدایت

---

(۱) ترمذی باب ما جاء فی السواک ۱۲/۱۔
(۲) بخاری باب مرض النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن عائشہ ۲/۴۰-۶۔
(۳) المغنی ۶۹/۱۔ (۴) شرح مہذب ۲۷۳/۱ – ۲۷۲۔
(۵) حاشیہ اذرعی علی ہامش المجموع ۲۷۲/۱۔
(۶) الاتحاف ۵۵۹/۲، کان اذا دخل بیتہ بدأ بالسواک، مسلم عن عائشہؓ۔

فرمائی ہے۔ وضوء سے پہلے مسواک کا مطلب یہ ہے کہ وضوء شروع کرنے سے پہلے مسواک کی جائے بلکہ مسواک ہی سے وضوء شروع کیا جائے۔(۱)

مسواک کیسی ہو؟

مسواک کی لکڑی نرم ہونی چاہیئے جس سے دانت وغیرہ صاف ہوسکیں اور مسوڑھوں پر خراش نہ آئے (۲) پیلو (اراک) کی مسواک آپؐ کو زیادہ پسند تھی (۳) مسواک کے نہ ہونے یا کسی وجہ سے نہ کرنے کی صورت میں انگلیاں بھی کافی ہیں، حضرت انسؓ نے آپؐ سے نقل کیا ہے کہ وضوء کے وقت تمہاری انگلیاں بھی مسواک کے قائم مقام ہیں" اصبعیك سواك عند وضوءك (۴)۔

موجودہ زمانہ کے برش وغیرہ کا حکم یہ ہے کہ فعل مسواک کے اعتبار سے ان کے ذریعہ سنت ادا ہو جائے گی البتہ خود مسواک کی سنت اس کے ذریعہ ادا نہ ہوسکے گی، اسی طرح مسواک نہ کرنے کی وجہ سے جو کراہیت پیدا ہوتی ہے اس سے بچنے کے لئے یہ برش وغیرہ کافی ہو جائیں گے۔ واللہ اعلم۔

طریقے اور آداب

مسواک کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو طولاً اور عرضاً دونوں طرح کیا جائے گا (۵) بہتر یہ ہے کہ زبان پر طولاً کرے اور دانتوں پر عرضاً (۶) دانتوں پر

---

(۱) احیاء العلوم مع الاتحاف ۳۵۴/۲۔ (۲) المغنی ۷۰/۱۔
(۳) مجمع الزوائد باب بای شئ یستاک ۱۰۰/۲۔
(۴) المغنی ۷۰/۱۔
(۵) المغنی ۶۹/۱، احیاء العلوم مع الاتحاف ۳۵۸/۲۔
(۶) شرح مہذب ۲۸۰/۱۔

عرضاً مسواک کرنے کے سلسلہ میں ایک روایت بھی ہے (۱) مسواک دانت کے اندرونی، بیرونی اور داڑھوں پر کی جائے، حلق کے بالائی حصہ پر بھی آہستہ ملی جائے (۲) دائیں طرف سے شروع کی جائے، دوبارہ مسواک کرنے سے پہلے دھولی جائے، بچوں کو بھی اس کی عادت ڈالی جائے مسواک کرتے ہوئے ادا رسنت کی نیت رکھی جائے (۳) ——— حدیث میں مسواک کی کوئی خاص دعا منقول نہیں مگر سلف سے بعض معمولات منقول ہیں مثلاً مسواک سے پہلے یہ دعا :-

اللّٰھم بیض بہ اسنانی وشد بہ لثاتی وثبت بہ لھاتی وبارك لی فیہ یاارحم الراحمین۔ (۴)

اے اللہ اس کے ذریعہ میرے دانتوں کو صاف وسفید بنا، میرے داڑھوں کو مضبوطی عطا کر اور میرے حلق کے کوے کو قائم رکھ اور اے ارحم الراحمین! اس میں مجھے برکت مرحمت فرما۔

وضع قطع

وضع قطع اور انسانی شکل وصورت کے معاملہ میں بھی اسلام نے اعتدال اور توازن کی راہ اختیار کی ہے، بعض مذاہب (جو انبیاء کی حقیقی تعلیمات اور الہامی ہدایات سے دور ہو چکے تھے) نے ظاہری تجمل اور زیبائش و آرائش کو خدا تک رسائی کے لئے رکاوٹ، مذہبیت اور دینداری کے خلاف

---

(۱) الاتحاف ۵۵۸/۲ ۔
(۲) شرح مہذب ۲۸۱/۱۔
(۳) ملخصاً شرح مہذب ۸۳/۱ ـ ۲۸۲۔
(۴) حوالہ سابق، الاتحاف ۵۶۰/۲ ۔

ع ٦ حلال و حرام

اور دین کی بے رغبتی کے یکسر مغائر سمجھ رکھا تھا، ایران اور ہندوستانی مذاہب میں تو اس تصور کی بہتات رہے ہی، خود عیسائیت نے جس دور میں رہبانیت کا پیرہن پہنا اس میں بھی ٹھیک یہی کیفیت پیدا ہوئی، انہوں نے بال کی تراش و خراش، چہرے کے خدوخال کی اصلاح، غسل اور صفائی ستھرائی، اچھے کپڑوں کا استعمال اِن سب کو شجرِ ممنوعہ جانا ———— پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم جو دینِ فطرت کے داعی تھے اور جن کی تعلیمات نے ایک طرف خدا طلبی کا ذوق پیدا کیا اور دوسری طرف یہ بھی بتایا کہ یہ کائناتِ رنگ و بُو خدا نے انسان ہی کی خدمت کے لئے پیدا کی ہے، نے وضع قطع، صفائی ستھرائی، لباس و پوشاک اور طور وطریق میں ہر جگہ ان دونوں تصورات کو دوش بدوش جگہ دی ہے، نہ انسان کے نفس کو آزاد چھوڑا کہ وہ اپنی مرضی اور خواہش کا غلام بنے اور نہ ایسی قدغنیں عائد کیں جو انسانی فطرت اور جبلت کے خلاف ہوں، قارئین آئندہ سطور میں اس کی عملی تصویر دیکھ سکیں گے۔

سر کے بال

اس کا آغاز ہم سر کے بال سے کرتے ہیں۔ سر پر بال خدا کی ایک نعمت ہے جو ایک طرف گرمی اور سردی سے اس کی حفاظت کرتی ہے دوسری طرف اس کے سراپا کو تجمل و خوبصورتی اور ایک خاص قسم کی جاذبیت اور کشش عطا کرتی ہے۔ انسان چاہتا ہے کہ عام حالات میں بال رکھے، کبھی بتقاضائے صحت اور بہ تفاوت مذاق و مزاج بال کی کثرت سے گرانی کا احساس بھی ہوتا ہے۔ اسلام نے دونوں کی رعایت کی، بال مونڈانے کی بھی اجازت دی اور بال رکھنے کو بھی پسند کیا، خود پیغمبر اسلام ؐ نے اکثر اوقات بال رکھے ہیں لیکن زندگی

میں چند بار مونڈا یا بھی ہے جس کا ذکر آگے آتا ہے۔ ایک موقع پر آپؐ نے حضرت جعفر بن ابی طالب کے صاحبزادوں کے بال بنفسِ نفیس مونڈوائے ہیں (۱)۔

لیکن اس میں بھی تہذیب و شائستگی کے اصول مقرر فرمائے، ارشاد فرمایا کہ بال رکھو تو اس کا حق بھی ادا کرو۔ من کان له شعر فلیکرمه (۲)۔ آپؐ نے گو کنگھی اور بال کی آرائش میں مبالغہ کو پسند نہیں فرمایا لیکن مناسب وقفہ کے ساتھ کنگھی کرنے کو کہا نهى عن الترجل الاغبا (۳) حضرت ابو قتادہؓ کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بال بڑے تھے۔ آپؐ نے ان کو روزانہ کنگھی کرنے کی تلقین فرمائی (۴) حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ آپؐ سرِ مبارک میں تیل بھی بہ کثرت رکھتے تھے (۵) بعض اوقات ازواجِ مطہرات بھی آپؐ کو کنگھی کیا کرتی تھیں (۶) آپؐ سر میں خوشبو کا بھی استعمال فرماتے (۷) جس سے خوشبودار تیل کا سر میں استعمال کرنا سنت سے قریب معلوم ہوتا ہے۔

اسلام سے پہلے عربوں میں بال رکھنے کا ایک عجیب طریقہ رائج تھا جس کو قزع کہتے تھے، پیشانی اور دونوں کناروں کے بال چھوڑ دیتے اور باقی پورا سر مونڈ دیتے، کبھی صرف پیشانی ہی کا بال باقی رکھتے (۸) بعض روایات میں

---

(۱) ابوداؤد عن حسن بن سعد باب فی حلق الرأس ۲/۵۷۷۔
(۲) ابوداؤد عن ابی ہریرہ باب فی اصلاح الشعر ۲/۵۷۳۔
(۳) ابوداؤد اول کتاب الترجل ۲/۵۷۳۔
(۴) نسائی کتاب الزینۃ من السنن الفطرۃ ۲/۲۹۱۔
(۵) ترمذی فی الشمائل عن انس باب ماجاء فی تقنع رسول اللہؐ۔
(۶) بخاری عن عائشہ باب ترجیل الحائض زوجہا ۱/۴۳۔
(۷) بخاری عن عائشہ باب الطیب فی الرأس واللحیۃ ۲/۸۷۷۔
(۸) بخاری عن ابن عمر باب القزع ۲/۸۷۷۔

مطلق سر کے کچھ حصہ کے مونڈنے اور کچھ حصہ چھوڑ دینے کا ذکر آتا ہے (۱) اس سے انسان کی صورت جیسی کچھ مضحکہ خیز اور وحشت انگیز بن جاتی ہوگی وہ محتاجِ اظہار نہیں۔ اس کا کچھ اندازہ ان ہندو بھائیوں کی ہیئت سے لگایا جا سکتا ہے جو شمالی ہند میں پورا مونڈ کر سر کے وسط میں چند بال چھوڑ دیتے ہیں ـــــ آپؐ نے قبل اسلام کی اس رسم کو منع فرمایا، اسی لئے امام نووی نے قزع کے مکروہ ہونے پر امت کا اجماع نقل کیا ہے بشرطیکہ علاج و بیماری کے لئے نہ ہو، ہاں البتہ یہ کراہت تنزیہی ہے (۲)

یہ بات تو ظاہر ہے کہ آپؐ نے جس مقدار میں بال رکھا ہے اس مقدار میں بال رکھنا مسنون اور سب سے بہتر ہے کہ سنتِ رسولؐ کے بعد نہ کسی کی سنت قابلِ اعتنا ہے اور نہ کوئی رائے قابلِ توجہ، رہ گیا یہ کہ مطلق بال رکھنا بہتر ہے یا بال کا مونڈانا۔ فقہاء احناف کا رجحان اس طرف ہے کہ اگر زلف نہ رکھ رہا ہو تو حلق و بال کا مونڈانا بہتر ہے، امام طحاوی۔ نے اس کو سنت قرار دیا ہے اور اس کی نسبت امام ابو حنیفہ اور آپ کے دونوں ممتاز شاگرد قاضی ابو یوسف اور امام محمد کی طرف کی ہے بلکہ فقہاء احناف کی کتابوں میں یہ بھی نقل کیا گیا ہے کہ ہر جمعہ کو بال مونڈانا مستحب ہے (۳)

جب کہ امام احمد کے نزدیک بال کو استرے سے مونڈانا مکروہ ہے۔ خود امام احمد کا معمول یہ تھا کہ بال ترشوایا کرتے تھے اور متوسط انداز کا بال رکھتے تھے۔ امام احمد کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ قینچی سے بال تراشنا خواہ جڑ تک تراشا

---

(۱) ابو داؤد عن ابن عمر باب فی الصبی لہ ذوابۃ ۵۷۷/۲۔

(۲) عمدۃ القاری ۵۸/۲۲۔

(۳) عالمگیری ۳۵۷/۵ الباب التاسع عشر فی الختان الخ۔

جائے، مکروہ نہیں (۱)

خیال ہوتا ہے کہ امام احمد کا نقطۂ نظر حدیث اور سنت کے زیادہ قریب ہے اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سوائے حج وعمرہ کے ہمیشہ بال رکھا ہے، بال رکھنا مستقل آپ کی ایک سنت ہے اور بال کی مقدار ماثور مستقل سنت ہے۔ مشہور حنفی محدث ملا علی قاری کا رجحان بھی اسی طرف محسوس ہوتا ہے کہ بال کا رکھنا بال کے مونڈانے سے بہتر ہے، آپؐ نے حضرت جعفر کے صاحبزادوں کا بال کیوں مونڈایا؟ حالانکہ بال کا رکھنا افضل ہے بمقابلہ بال مونڈانے کے، اس کا ذکر کرتے ہوئے علامہ عینی لکھتے ہیں:

وانما حلق رؤسهم مع ان ابقاء الشعر افضل الا بعد فراغ احد النسكين (۲)

سر کے بال میں سنتِ نبویؐ

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا عام معمول زلف رکھنے کا تھا، زلف مبارک کبھی کانوں کے لَو تک ہوتی کبھی اس سے نیچے گردن تک اور کبھی کاندھے تک (۳)، پہلی صورت کو "وفرہ"، دوسری کو "لمۃ"، تیسری کو "جمۃ"، کہا جاتا ہے۔

حضرت انس کی ایک روایت میں نصف کان تک موئے مبارک کا ذکر ہے (۴) لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ تر موئے مبارک کانوں سے نیچے اور مونڈھوں سے اوپر ہوتا تھا فوق الجمۃ ودون الوفرۃ (۵)

---

(۱) المغنی ۱/۶۵

(۲) مرقاۃ ۴/۴۷۲ باب الترجل الفصل الثانی۔

(۳) مرقاۃ المفاتیح ۴/۴۷۰

(۴) ابوداؤد باب ماجاء فی الشعر ۲/۵۷۶

(۵) ترمذی عن عائشہ /۳ باب ماجاء فی شعر رسول اللہؐ۔

اور جیسا کہ ذکر کیا گیا کہ تیل، خوشبو اور کنگھے کے استعمال کا بھی معمول تھا۔
آپ صلی اللہ علیہ وسلم ابتداءً سیدھے بال رکھا کرتے تھے پھر بعد کو مانگ نکالنے لگے (۱)، جو سر کے بیچ میں ہوتی (۲)

آپؐ سر اور داڑھی میں خضاب کا استعمال کرتے تھے یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے، حضرت ابوہریرہ کی روایت میں ہے کہ آپؐ نے خضاب لگایا ہے حضرت ابورمثہ و حضرت انس کی ایک روایت میں بھی ایسا ہی منقول ہے۔
حضرت انس کی ایک اور روایت میں آپؐ کا خضاب نہیں استعمال کرنا منقول ہے اور اس کو اس سے بھی تقویت ہوتی ہے کہ سر مبارک میں چند ہی بال پکے ہوئے تھے، غالباً تیل کی کثرت اور خوشبو کے استعمال کی وجہ سے یہ پکے ہوئے بال لال نظر آتے تھے اور اسی کو بعض حاضرین خضاب خیال کرتے تھے (۳)

مونچھ:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مونچھ کے تراشنے کو امور فطرت میں سے قرار دیا ہے (۴)، حدیث میں مونچھ کے تراشنے کے سلسلہ میں مختلف تعبیرات ذکر کی گئی ہیں قص الشوارب، احفوا الشوارب، جزوا الشوارب، انھکوا الشوارب۔
قص کے علاوہ یہ تمام الفاظ مبالغہ کے ساتھ بال تراشنے کو بتلاتے ہیں (۵) انہی تعبیرات کو سامنے رکھ کر احناف، شوافع اور حنابلہ مطلقاً تراشنے کو مسنون اور اس میں مبالغہ کو بہتر سمجھتے ہیں (۶) امام مالکؒ مونچھ کے کاٹنے میں

---

(۱) ابوداؤد باب ما جاء فی الفرق عن ابن عباس ۲/۵۷۶۔
(۲) ھو قسمته فی المفرق وھو وسط الرأس، عون المعبود ۱۱/۴۱۔
(۳) دیکھئے زاد المعاد ۱/۶۲ فصل فی ھدیہ فی الفطرۃ وتوابعھا۔
(۴) بخاری عن ابن عمر باب قص الشارب ۲/۸۷۴۔
(۵) فتح الباری ۱۰/۴۲۵۔ (۶) دیکھئے شرح مھذب ۱/۲۸۷، فتح الباری ۱۰/۴۲۵۔

مبالغہ کو ناپسند کرتے تھے بلکہ قرطبی کے بیان کے مطابق اتنا تراشے کہ کھانے میں تکلیف نہ ہو اور میل جمع نہ ہو پائے، امام مالک کے یہاں اس بارے میں اتنی شدت تھی کہ مبالغہ کے ساتھ مونچھ تراشنے والے کو مستحق سرزنش تصور کرتے اور مونچھ مونڈانے کو بدعت قرار دیتے (۱) ہاں مجاہدین رعب پیدا کرنے کے لئے بڑی مونچھ رکھیں تو بہتر ہے (۲) حضرت عمر مونچھ کے دونوں کنارے بڑے رکھتے تھے (۳) بہر حال مونچھ کو معمولی طور سے تراشنا بہتر ہے یا مبالغہ کے ساتھ تراشنا؟ اس سلسلہ میں اہلِ علم کی رائیں مختلف ہیں اور ان کے پاس اپنی رائے کیلئے مناسب بنیادیں بھی موجود ہیں لیکن حدیث کے مجموعی الفاظ سے اسی کی تائید ہوتی ہے کہ معمولی طور پر مونچھیں تراشی جائیں (قص)۔ اور ابن عباس کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ معمولِ مبارک بھی یہی تھا (۴) ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ کم سے کم چالیس دنوں میں ایک بار مونچھیں ضرور تراش لی جائیں (۵) ——— امام نووی نے مونچھ تراشنے میں مستحب قرار دیا ہے کہ دائیں جانب سے شروع کرے اس لئے کہ آپؐ ہر کام دائیں سے شروع کرنے کو پسند فرماتے تھے (۶)

داڑھی:

داڑھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اہم ترین سنت اور شعائر میں سے ہے۔ موجودہ دور میں بعض اہلِ علم کا یہ خیال کہ یہ رسول اللہ

---

(۱) فتح الباری ۱۰/۳۴۵۔
(۲) عالمگیری ۵/۳۵۷۔ (۳) شرح مہذب ۱/۲۸۸۔
(۴) زاد المعاد ۱/۶۲ فصل فی ہدیہ فی قص الشارب۔
(۵) ابو داؤد عن انس باب فی اخذ الشارب ۲/۵۷۷۔
(۶) شرح مہذب ۱/۲۸۸۔

صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتِ طبعی تھی اور عربوں کے رواج کے مطابق آپؐ نے داڑھی رکھ لی تھی، نری گمراہی اور کھلا ہوا مغالطہ ہے، داڑھی کے تاکید کے سِلسلہ میں کثرت سے روایات موجود ہیں جن میں آپؐ نے دَاڑھی رکھنے کی تاکید فرمائی ہے مثلاً ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ وفر ا اللحی واحفوا الشوارب بھرپور داڑھی رکھو اور مونچھیں خوب پست کر دو (۱) ظاہر ہے کہ اگر داڑھی کی شرعی حیثیت نہ ہوتی تو اس درجہ تاکید واہتمام کی ضرورت نہ ہوتی، پس داڑھی کا مونڈانا حرام اور داڑھی کا رکھنا واجب ہے

مِقدار :

ایک مشت داڑھی رکھنی مسنون ہے۔ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم داڑھی کے عرض وطول سے تراشا کرتے تھے (۲) ——— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی داڑھی کی مقدار کیا ہوتی تھی؟ اس کی تفسیر ووضاحت حضرات صحابہؓ کے عمل سے ہوتی ہے۔ چنانچہ امام بخاریؒ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے نقل کیا ہے کہ وہ حج وعمرہ کے موقعہ پر ایک مشت سے زیادہ داڑھی تراش لیا کرتے تھے (۳) تاہم حافظ ابن حجر کا خیال ہے کہ ابن عمر کا یہ عمل کچھ حج وعمرہ ہی کے ساتھ مخصوص نہیں تھا بلکہ جب بھی داڑھی کی لمبائی یا چوڑائی کی وجہ سے صورت غیر متوازن ہوتی تھی، بال تراشا کرتے تھے (۴) حضرت عمرؓ کے بارے

---

(۱) بخاری باب تقلیم الاظفار ۸۷۵/۲۔

(۲) ترمذی بسندٍ ضعیفٍ باب ماجاء فی الاخذ من اللحیۃ، عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہٖ ۱۰۵/۲۔

(۳) بخاری باب تقلیم الاظفار ۸۷۵/۲

(۴) فتح الباری ۴۲۹/۱۰۔

میں منقول ہے کہ انہوں نے ایک شخص کی بڑی داڑھی دیکھی تو ایک مشت سے زیادہ کو کاٹ دیا، حضرت ابوہریرہؓ سے بھی اسی طرح کا عمل منقول ہے (۱)

انہی روایات کو سامنے رکھتے ہوئے ہمارے فقہاء نے ایک مشت داڑھی کو مسنون قرار دیا ہے (۲)

دین میں سنت کی اہمیت وعظمت کس درجہ ہے؟ اس سلسلہ میں علامہ حصکفیؒ نے ایک ایسی بات لکھی ہے جو ہر مسلمان کو لرزا دینے کیلئے کافی ہے، وہ فرماتے ہیں:

"سنت کے ترک سے گو انسان دوزخی نہیں ہوتا مگر وہ شفاعتِ نبویؐ سے محروم ہوگا (۳) اور کون مسلمان اس محرومی پر خود کو آمادہ کر سکتا ہے؟؟"

داڑھی کے بعض اور احکام

آپؐ نے داڑھی چڑھانے کو بھی منع فرمایا ہے یہاں تک ارشاد فرمایا کہ جس نے داڑھی چڑھائی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس سے بری ہیں من عقد لحیته فان محمدا منه بریٔ (۴) خطابی نے اس کی شرح میں داڑھی چڑھانے اور گرہ لگانے کے علاوہ بہ تکلف داڑھی کے بال میں

---

(۱) عمدۃ القاری ۲۲/۴۷۔

(۲) فتاویٰ ہندیہ ۵/۳۵۸۔

(۳) رد المحتار، کتاب الحظر والاباحۃ۔ اوائل باب۔

(۴) ابوداؤد عن رویفع ۱/۶۔

شکن پیدا کرنے کو بھی شامل کیا ہے (۱) اسی طرح داڑھی کے سفید بال نکالنا بھی مکروہ ہے (۲) تاکہ مصنوعی طور پر اپنی جوانی کو بچائیں، آپ نے فرمایا کہ یہ بال نہ نکالو کہ یہ قیامت کے دن مسلمانوں کے لئے نور ہوگا (۳) داڑھی کو بالکل چھوڑ دینا یا پراگندہ رکھنا کہ لوگ اس کو زاہد اور دنیا سے بے رغبت سمجھیں، بھی مکروہ ہے بلکہ مشہور صوفی بشر حافی نے ریا کی وجہ سے ان دونوں باتوں کو شرک (خفی) قرار دیا ہے (۴)

نچلے ہونٹ کے نیچے جو بال ہیں، ان کو بھی اکھاڑنا مکروہ ہے (۵) بلکہ عالمگیری میں تو بدعت قرار دیا گیا ہے (۶) امام احمد اور امام ابو یوسف حلق کا بال صاف کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔ عام فقہاء احناف مکروہ کہتے ہیں (۷) چہرہ یعنی رخساروں کا بال کاٹنے میں بھی مضائقہ نہیں (۸)

خضاب کا استعمال

بال کے سلسلہ میں ایک اہم مسئلہ خضاب کے استعمال کا ہے، آپ نے فرمایا کہ چوں کہ یہود و نصاریٰ خضاب کا استعمال نہیں کرتے ہیں اس لئے تم کیا کرو (۹) فتح مکہ کے موقع سے حضرت ابو بکر کے والد حضرت ابو قحافہ اس

---

(۱) شرح مہذب ۲۹۲/۱۔
(۲) احیاء علوم الدین مع الاتحاف ۶۷۸/۲۔
(۳) ابوداؤد ۵۷۸/۲۔
(۴) احیاء العلوم مع الاتحاف ۶۸۲/۲۔ (۵) شرح مہذب ۲۹۱/۱۔
(۶) عالمگیری ۳۵۸/۵۔
(۷) حوالہ سابق۔
(۸) عالمگیری ۳۵۸/۵۔
(۹) بخاری باب الخضاب ۸۷۵/۲۔ ابوداؤد باب فی الخضاب ۵۷۸/۲۔

حال میں لائے گئے کہ سر اور داڑھی کے بال بالکل سفید تھے، ارشاد ہوا کہ سیاہ رنگ سے بچتے ہوئے کسی رنگ کا خضاب استعمال کیا جائے (۱) خود آپ کے خضاب استعمال کرنے اور نہ کرنے کی بابت گو راویوں کی رائیں مختلف ہیں لیکن یہ بہرحال ثابت ہے کہ حضرت ابوبکر و عمرؓ نے خضاب کا استعمال فرمایا ہے (۲) و کفی بھما قدوۃ۔ اسلئے خضاب کا استعمال بہتر ہے (۳)

لیکن اصل قابل توجہ بات یہ ہے کہ کس رنگ کا خضاب استعمال کیا جائے؟ عبداللہ بن عمر سے زعفرانی رنگ کا استعمال ثابت ہے (۴) ابن عباس کی روایت میں ہے کہ آپ نے حنا اور کسم نیز زرد خضاب کے استعمال کو پسند فرمایا ہے اور اس پر تحسین کی ہے (۵) طبرانی کی ایک روایت میں آپ نے انصار کو سرخ رنگ کے خضاب استعمال کرنے کی تلقین فرمائی ہے (۶) ——— البتہ سیاہ خضاب کے استعمال کو آپ نے منع فرمایا ہے۔ ایک روایت میں سیاہ خضاب لگانے والوں کے بارے میں ارشاد ہوا کہ وہ جنت کی بو سے بھی محروم رہیں گے لا یریحون رائحۃ الجنۃ (۷) ایک روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی طرف نگاہ (توجہ) نہیں فرمائیں گے، طبرانی کی ایک روایت میں زبانِ حق ترجمان سے بددعائیہ کلمات بھی منقول ہیں کہ خدا اس کے چہرہ کو سیاہ

---

(۱) ابوداؤد عن جابر باب فی الخضاب ۲/۵۷۸۔
(۲) حوالہ مذکور عن انس۔
(۳) المغنی ۱/۶۶۔
(۴) ابوداؤد، باب فی خضاب الصفرۃ ۲/۵۷۸۔
(۵) حوالہ مذکور
(۶) فتح الباری ۱۰/۳۵۴۔
(۷) ابوداؤد باب ما جاء فی خضاب السواد ۲/۵۷۸۔

کر دے (۱)

تاہم بعض سلفِ صالحین سے سیاہ خضاب کا استعمال بھی ثابت ہے، حضرت حسن و حسین، تابعین میں خود ابن شہاب زہری، ابن سیرین، عروہ بن زبیر اور عبداللہ بن عباس کے صاحبزادہ کے بارے میں سیاہ خضاب لگانا منقول ہے۔ حضرت عثمان غنی کی طرف بھی اس کی نسبت کی گئی ہے، اور حضرت عقبہ بن عامر کی طرف بھی۔ حضرت عمر کے بارے میں نقل کیا جاتا ہے کہ سیاہ خضاب کو بیوی کی تسکین اور دشمن کی مرعوبیت کا ذریعہ[۲] بتاتے تھے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اوپر خود جناب رسالت مآب کے جو ارشادات سیاہ خضاب کی مذمت میں گذر چکے ہیں وہ ایک صاحب ایمان کو لرزا دینے کے لئے کافی ہیں اور حقیقت یہی ہے کہ سیاہ خضاب کا استعمال مکروہ ہے، نووی نے لکھا ہے کہ فقہاء اس پر متفق ہیں (۳) البتہ بعض فقہاء نے مجاہدین کے لئے اجازت دی ہے (۴) امام اسحاق نے عورت کو اجازت دی ہے کہ شوہر کیلئے آراستہ ہونے کی غرض سے استعمال کر سکتی ہے (۵) امام زہری غالباً ان جوانوں کو اجازت دیتے تھے جن کے بال طبعی وقت سے پہلے سفید ہو جائیں (۶)

---

(۱) عمدۃ القاری ۲۲/۵۱، گو ابوداؤد کی اول الذکر روایت کے علاوہ عام روایات کی صحت محدثین کے ہاں متفق علیہ نہیں، خود آخر الذکر روایت کے بارے میں ابن حجر کا بیان ہے "اسنادہ لین" فتح الباری ۱۰/۴۳۴۔

(۲) عمدۃ القاری ۲۲/۵۱۔

(۳) شرح مہذب ۱/۲۹۴۔ (۴) حوالہ سابق۔

(۵) المغنی ۱/۶۷۔

(۶) چنانچہ اس عبارت پر غور کیا جائے: کنا نخضب بالسواد اذ کان الوجہ جدیدا فلما نغض الوجہ والاسنان ترکناہ، فتح الباری ۱۰/۴۳۴۔

قاضی ابو یوسف کی طرف منسوب ہے کہ اس وقت اجازت دیتے جب بیوی نوجوان ہوں(۱) ــــــــــــ لیکن غور کیا جائے تو ان میں سے کوئی بھی عذر ایسا نہیں جو صریح ارشاداتِ نبوی کے مقابلہ میں قابل توجہ ہو، سوائے جہاد والی صورت کے کہ یہ ایک دینی ضرورت ہے۔ رہ گئے صحابہ کے آثار تو ایسی واضح حدیثوں کی موجودگی میں اس کے سوا چارہ نہیں کہ یا تو ان نسبتوں کو مشکوک سمجھا جائے یا عذر جہاد پر محمول کیا جائے۔ واللہ اعلم۔

پس خضاب کے سلسلہ میں احکام کا خلاصہ اس طرح ہے:

۱۔ سیاہ کے علاوہ دوسرے رنگ کا خضاب استعمال کرنا مستحب ہے۔

۲۔ خضاب استعمال نہ کیا جائے تو بھی مضائقہ نہیں کہ حضرت علی، ابی بن کعب، انس، سلمہ بن اکوع وغیرہ بہت سے فقہاء صحابہ سے بال کا رکھنا ثابت ہے۔(۲)

۳۔ بلکہ جن علاقوں میں خضاب کا رواج نہ ہو اور خضاب استعمال کرنے کی وجہ سے اس پر انگشت نمائی ہونے لگے تو اس کے لئے خضاب سے گریز ہی بہتر ہے۔(۳)

۴۔ حنا (مہدی) اور کسم کے رنگ کا خضاب مستحب ہے(۴)

۵۔ سیاہ خضاب مکروہ ہے۔

اور ظاہر ہے کہ یہ خضاب پوڈر کی صورت ہو یا سیال صورت میں۔ پیسٹ ہو یا اس کی کوئی خاص قسم کی کنگھی، حکم بہر صورت یکساں ہے۔

---

(۱) عالمگیری ۵/۳۷۔ نیز ۵/۳۹۵ باب العشرون فی الزینۃ واتخاذ الخضاب۔

(۲) فتح الباری ۱۰/۴۳۵۔

(۳) حوالۂ سابق۔

(۴) المغنی ۱/۶۶۔

اپنے بال میں دوسروں کے بال کی آمیزش

زینت وآرائش میں غلو عورتوں کے لئے بھی شریعت میں پسندیدہ نہیں ہے۔ اسی غلو کی ایک صورت فطری ساخت کو چھپانا اور مصنوعی طریقہ پر خود کو زیادہ حسین بنا کر پیش کرنا ہے۔ چنانچہ آپؐ نے اپنے بال کے ساتھ دوسرے بال جوڑنے کو شدت سے منع فرمایا ہے بلکہ لعنت بھی بھیجی ہے لعن الواصلة والمستوصلة (۱) یہاں تک کہ مرض کی بنا پر بھی آپؐ نے اس کی اجازت نہیں دی، اسی لئے بعض فقہاء نے تو بال کے ساتھ کسی بھی شئی کے جوڑنے کو منع کیا ہے، بال ہو یا کپڑا (۲) لیکن عام رائے یہی ہے کہ بجائے بال کے کوئی اور شئی مثلاً ریشمی یا اونی دھاگے وغیرہ کی چوٹی لگائی جائے تو حرج نہیں (۳) یہ علاوہ ابن عباس اور دوسرے صحابہ کے امہات المؤمنین حضرت ام سلمہ اور حضرت عائشہؓ سے (۴) بھی مروی ہے کہ ان سے بڑھ کر خواتین کے شرعی احکام سے اور کون آگاہ ہو سکتا ہے؟ امام طحاوی کا بیان ہے کہ بال کے ساتھ جوڑنے کی ممانعت حضرت عائشہ سے مروی ہے اور خود آپؓ ہی سے یہ بھی ثابت ہے کہ دلہن کے بالوں کے ساتھ اونی دھاگے گوندھنے پر انکار نہیں فرمایا (۵) یہ اس بات کی دلیل ہے کہ منشا اپنے بال کے ساتھ کسی اور کے بال جوڑنے کی ممانعت ہے، چنانچہ فقہاء احناف کی بھی یہی رائے ہے:

---

(۱) بخاری عن عائشہ وعمر، باب وصل الشعر ۲/۸۷۸۔

(۲) فتح الباری ۱۰/۴۵۸۔

(۳) حوالۂ سابق

(۴) عمدۃ القاری ۲۲/۶۴۔

(۵) دیکھئے المعتصر من المختصر ۲/۳۸۸ فی صلۃ الشعر۔

واذا وصلت شعرها بشعر غیرها فھو مکروہ واختلفوا فی جواز الصلوٰۃ منھا فی ھذہ والمختار انہٗ یجوز (۱)

دوسرے کا بال اپنے بال کے ساتھ ملائے تو مکروہ ہے، ہاں ان بالوں کے ساتھ نماز کے جائز ہونے میں اختلاف ہے اور صحیح یہی ہے کہ جائز ہے۔

آدمی کا بال نہ ہو، کسی اور جانور کا بال ہو جو بال کے ساتھ لگا لیا گیا ہو یا بال کے جوڑے میں رکھ دیا گیا ہو تو بھی حرج نہیں (۲)

خواتین کیلئے بال کے بعض ضروری احکام

اگر عورت کو داڑھی یا مونچھ وغیرہ نکل آئے تو ایسے بال کا اکھاڑ لینا مستحب ہے (۳) لیکن اس کے علاوہ چہرے سے بال کا اکھاڑنا مثلاً بھووں کو باریک کرنے یا ان کے درمیان فصل پیدا کرنے کی غرض سے ایسا کرنا مکروہ ہے۔ حدیث میں ایسی عورتوں کو "متنمصات" کہا گیا ہے اور ان پر لعنت کی گئی ہے (۴)، امام ابو داؤد نے اس کی تشریح یہی کی ہے کہ بال کھاڑ کر بھووں کو باریک وخوبصورت بنایا جائے (۵) ہاں خلاف عادت چہرہ پر ایک دو بال نکل آئے تو اس کے دور کر لینے میں مضائقہ نہیں (۶)

احادیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بال کے معاملہ میں بھی

---

(۱) البحر الرائق ۲۰۵/۸۔

(۲) عالمگیری ۳۵۸/۵ بحوالہ قاضی خاں۔

(۳) فتح الباری ۴۶۲/۱۰۔

(۴) بخاری باب المتنمصات ۸۷۹/۲۔

(۵) ابو داؤد، التی تنقش الحاجب حتی ترقہ، باب فی صلۃ الشعر ۵۷۴/۲۔

(۶) ویجوز للمرأۃ ان تلقی الاذیٰ عن وجھھا، البحر الرائق ۲۰۵/۸۔

شریعت نے غیر مسلموں کی مشابہت کو ناپسند کیا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتداءً مانگ نکالنے کو کفار مکہ کے تشبہ کی وجہ سے اور بعد میں سیدھا بال رکھنا (سدل) یہود کے مشابہت کی وجہ سے ترک کردیا تھا ــــــ عورتوں کے بال کے سلسلہ میں ملک میں جو فیشن نکل رہے ہیں اور جن میں عموماً فلمی اداکاراؤں اور مغربی تہذیب کی نمائندوں کی وضع کو اسوہ بنایا جاتا ہے، کا اس پہلو سے جائزہ لینا ضروری ہے۔ آنحضورؐ نے عورتوں کو مردوں کی مشابہت سے بھی منع فرمایا ہے۔ پس عورتوں کے بال اس طرح سے کاٹنا کہ وہ مردوں کی طرح ہوجائیں، کراہت سے خالی نہیں، درمختار میں ہے کہ عورت اگر اپنے سر کا بال کٹائے تو گنہ گار اور مستحقِ لعنت ہوگی (۱) یہی رائے ماضی قریب کے مشہور صاحبِ علم مولانا تھانوی کی بھی ہے (۲)

اسی حکم میں عورتوں کا ٹیڑھی مانگ نکالنا اور بالوں کی کوئی بھی ایسی ساخت داخل ہے جس سے مردوں یا فاسق و فاجر عورتوں سے مشابہت ہوتی ہو۔

بغل کا بال

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بغل کا بال اکھاڑنے (نتف الابط) کو امور فطرت میں سے قرار دیا ہے (۳) چنانچہ اس کے مسنون ہونے پر اتفاق ہے (۴) اگر اکھاڑنے میں اذیت ہو تو بال کا مونڈ لینا یا تراشنا

---

(۱) درمختار ۵/۲۶۱۔

(۲) امداد الفتاویٰ ۴/۲۹۷۔

(۳) ابوداؤد باب فی اخذ الشارب ۲/۵۷۷۔

(۴) شرح مہذب ۱/۸۸۔

یا کسی اور طریقہ پر بال صاف کرلینا بھی کافی ہے (۱) اکھاڑنا اس لئے بہتر ہے کہ اس کی وجہ سے بال کم اگ سکے گا اور گندگی کم جمع ہو سکے گی ۔ بال مونڈنے کی شکل میں بال کی پیدائش بڑھ جائے گی اور اس کی وجہ سے بدبو میں بھی اضافہ ہوگا۔ چالیس روز میں کم از کم ایک بار بغل کی صفائی مستحب ہے (۲) بغل صاف کرتے ہوئے مستحب ہے کہ دائیں بغل سے شروع کیا جائے (۳)

سینے اور پیٹھ کا بال بلا عذر نہیں کاٹنا چاہیئے ۔ فقہاء نے ان کے مونڈنے کو خلافِ ادب قرار دیا ہے (۴) علامہ ابن نجیم مصری نے لکھا ہے کہ معمولی طور پر بھوں کے بال کاٹے جاسکتے ہیں (۵) لیکن یہ غالباً صرف اس صورت میں ہے جب کہ بھوں کے بال غیر معمولی طور پر بڑے ہو جائیں یا بھوں کے بال سے آنکھ میں تکلیف نہ ہو، اس لئے کہ گذر چکا ہے کہ محض آرائش اور زینت کے لئے عورتوں کو بھی بھوں کے بال اکھاڑنے سے منع کیا گیا تو اس جذبہ کے ساتھ بال کا تراشنا اور کاٹنا بھی ممنوع ہونا چاہیئے اور مردوں کیلئے بدرجۂ اولیٰ اس کی کراہت ہونی چاہیئے ۔

موئے زیرِ ناف

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر چھوٹے بڑے اور خلوت وجلوت کے مسائل میں انسانیت کی رہنمائی فرمائی ہے، یہ جامعیت اور ہمہ گیری آپ کی

---

(۱) الاتحاف للزبیدی ۶۵۱/۲ ۔

(۲) احیاء العلوم مع الاتحاف ۶۵۱/۲ ۔

(۳) اتحاف ۶۵۲/۲ ۔

(۴) بحر ۲۰۴/۸ ۔

(۵) ولا باس بان یاخذ حاجبین بحر ۲۰۴/۸ ۔

ایسی سنت ہے کہ کسی پیشوائے مذہب کی زندگی میں اس کو تلاش کرنا محض اپنی محنت کے ضائع کرنے کے مترادف ہے چنانچہ جہاں آپ نے زوجین کے حقوق کو واضح فرمایا اور ازدواجی زندگی کے داخلی مسائل کے بارے میں بھی روشنی عطا فرمائی وہیں ایک باپ کی طرح استنجاء اور قضاءِ حاجت کے اصول بھی بتائے اور صفائی ستھرائی کے طریقے بھی واضح فرمائے۔

انہی تعلیمات میں سے ایک یہ ہے کہ مرد و عورت کو اعضاءِ تناسل کے اِردگرد جو بال نکل آئے انہیں صاف کیا جائے، چنانچہ اس کے لئے بعض روایات میں "حلق العانة" اور بعض میں "استحداد" یعنی لوہے کی چیز سے بال کی صفائی کے الفاظ وارد ہوئے ہیں، اس کے مستحب ہونے پر امت کا اجماع ہے[۱] اور اگر شوہر بیوی سے تقاضہ کرے تو پھر بیوی کیلئے واجب ہوتا ہے (۲)۔ چالیس دن سے زیادہ تاخیر مکروہ ہے، کم سے کم کوئی وقت متعین نہیں بلکہ افزائش بال کے اعتبار سے مختلف لوگوں کے لئے الگ الگ مدت ہوسکتی ہے[۳] مقصود بال کو صاف کرنا ہے چاہے اس کے لئے استرے کا استعمال کیا جائے یا چونے کا (۴)، لیکن عورتوں کے لئے بال کا اکھاڑنا زیادہ بہتر ہے[۵]۔ بہتر ہے کہ اس کام کو خود انجام دے کہ یہی تقاضۂ حیا ہے دوسرے سے یہ کام لینا حرام ہے، ہاں زوجین ایک دوسرے کی مدد کرسکتے ہیں، گو کراہت سے یہ بھی خالی نہیں (۶) موئے زیر ناف کی صفائی میں بہتر ہے کہ اوپر یعنی ناف کی جانب

---

(۱) الاتحاف للزبیدی ۲/۶۵۲۔
(۲) شرح مہذب ۱/۲۸۹۔
(۳) حوالۂ سابق
(۴) عالمگیری ۵/۳۵۸۔
(۵) الاتحاف ۲/۶۵۲۔ (۶) شرح مہذب ۱/۲۸۹۔

سے ابتدا کرے (۱) ـــــــــــ پچھلے حصہ میں جو بال نکل آئیں ان کی صفائی بھی مستحب ہے (۲) البتہ چوں کہ حدیث میں اس کا ذکر نہیں اس لئے اگر چالیس دنوں سے زیادہ بھی ہو جائے تو کراہت پیدا نہیں ہوگی۔ واللہ اعلم۔

ناخن تراشنا

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امور فطرت میں شمار کرتے ہوئے جن باتوں کا حکم فرمایا ان میں سے ایک ناخن کا تراشنا بھی ہے (۳) اس لئے کہ ناخن کے بڑھ جانے کی صورت میں میل پیدا ہو جانے اور اس سے انسانی صحت کو نقصان پہونچنے کا قوی اندیشہ ہے۔ چوں کہ مختلف لوگوں میں اجزاء جسمانی کے نشو و نما کی الگ الگ صلاحیت ہوتی ہے اس لئے ظاہر ہے کہ کوئی ایک قطعی مدت نہیں بیان کی جا سکتی۔ تاہم آپؐ نے فرمایا کہ چالیس دن سے یہ مدت بڑھ نہ جائے اور اس کے اندر ناخن تراش لیا جائے (۴) امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ کم سے کم ہر جمعہ کو ناخن کاٹ لینا چاہیئے (۵) ناخن قینچی وغیرہ سے کاٹنا چاہیئے (۶) اس میں مرد و عورت کا حکم یکساں ہے۔ البتہ فقہاء نے دانت سے ناخن تراشنے کو منع کیا ہے (۷)، ناخن کاٹنے سے پہلے ہاتھ دھو لیا جائے تاکہ ناخن نرم ہو اور بسہولت کاٹ لیا جائے (۸) اور ناخن کاٹنے کے

---

(۱) عالمگیری ۵/۳۵۸۔ (۲) شرح مہذب ۱/۲۸۹۔

(۴) مسلم عن انس ۱/۱۲۹۔ (۳) ابوداؤد باب فی اخذ الشارب ۲/۵۷۷۔

(۵) شرح مہذب ۱/۲۸۷۔

(۶) الاتحاف ۲/۶۵۲۔

(۷) ہندیہ ۵/۳۵۸، الاتحاف ۲/۶۵۷

(۸) اتحاف ۲/۶۵۸۔

بعد بھی اس حصہ کو دھولیا جائے (۱) مختلف دنوں میں ناخن تراشنے پر ثواب و اجر والی روایت جو مشہور ہے وہ ضعیف محض اور ناقابلِ اعتبار ہے (۲)

امام غزالیؒ نے ناخن تراشنے میں مسنون ترکیب یہ بتائی ہے کہ پہلے دائیں ہاتھ کی انگشتِ شہادت، پھر وسطیٰ، بنصر اور خنصر (چھوٹی انگلی) کے ناخن تراشے اس کے بعد بائیں ہاتھ میں خنصر سے شروع کر کے بالترتیب ابہام تک پہنچے پھر اخیر میں دائیں ہاتھ کے ابہام کا ناخن تراشا جائے (۳) لیکن فقہ و کلام کے مشہور امام ابو عبداللہ مالکی نے اس سے اختلاف کیا ہے اور کہا ہے کہ دائیں ہاتھ کے ابہام کا ناخن کاٹنے کے بعد ہی بائیں ہاتھ کا ناخن تراشا جائے (۴) تاہم علامہ زبیدی نے نقل کیا ہے کہ اس سلسلہ میں کوئی قوی روایت موجود نہیں (۵) پاؤں کے ناخن تراشنے کے سلسلہ میں سنت یوں ہے کہ دائیں پاؤں کے خنصر سے شروع کیا جائے اور بائیں پاؤں کے خنصر پر ختم کیا جائے۔ غرض پہلے دائیں پھر بائیں ہاتھ، اسکے بعد دائیں پھر بائیں پاؤں کی ترتیب رکھی جائے (۶)

چار چیزیں ہیں کہ ان کو دفن کیا جانا چاہیے، ناخن، بال (چاہے جہاں کا ہو) حیض کا کرسف اور خون۔ خاص طور پر گندی جگہ پر ان کو ڈالنا مکروہ بھی ہے اور طبی اعتبار سے نقصان دہ بھی (۷) ——— حالتِ جنابت میں بال کا تراشنا یا ناخن کاٹنا مکروہ ہے۔ (۸)

---

(۱) المغنی ۱/۶۴ (۲) المقاصد الحسنہ۔

(۳) احیاء العلوم مع الاتحاف ۲/۶۵۵۔

(۴) شرح مہذب ۱/۲۸۶۔ (۵) اتحاف ۲/۶۵۷۔

(۶) ہندیہ ۵/۳۵۸ (۷) حوالۂ سابق

(۸) ہندیہ ۵/۳۵۸۔

چوتھا باب

خورد و نوش

انسان اس کائنات میں ضرورتوں اور حاجتوں کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے اس کے وجود کا کوئی حصہ نہیں جو اپنی حیات و بقا اور حفظ و صیانت میں احتیاج سے فارغ ہو ——— لیکن سانس کے لئے ہوا اور پیاس کے لئے پانی کے بعد اس کی سب سے بڑی ضرورت خوراک ہے اور یہی احتیاج و ضرورت ہے جس نے زندگی کو متحرک اور رواں دواں رکھا ہے، صبح دم دہقان کا اٹھنا اور زمین کی چھاتی میں دانے بونا۔ دوپہر نیم روز کی تپش میں عرق آلود مزدوروں کا کھیت کی خدمت میں مصروف رہنا، تجارت و کاروبار اور تمام ہنگامہ ہائے حیات کا حاصل سوائے غذائی ضرورت کی تکمیل کے اور کیا ہے؟۔

شریعت اسلامی جو انسانی فطرت کے خالق اور انسانی جذبات سے آگاہ خدا کی نازل کی ہوئی ہے، ممکن نہیں ہے کہ وہ فطرت انسانی کے کسی تقاضہ سے صرف نظر کرے چنانچہ اس باب میں بھی اس کی تعلیمات نہایت متوازن اور معتدل ہیں۔ احادیث نبوی میں اس سلسلہ میں واضح ہدایات موجود ہیں اور فقہاء نے انہی کو سامنے رکھ کر آداب و احکام کی وضاحت فرمائی ہے۔

کھانے کی مقدار

انسانی جسم چوں کہ اللہ کی امانت ہے اور اس کی حفاظت وصیانت اور جائز حدود میں اس کی راحت وعافیت کا سامان بہم پہنچانا انسان کے واجبات میں سے ہے، دوسری طرف خورد ونوش میں اس درجہ کا مبالغہ کہ گویا یہی انسان کا مقصدِ وجود ہے، شرعاً ناپسندیدہ اور قبیح ہے اس لئے فقہاء نے کھانے کے درجات مقرر کئے ہیں اور ان کے الگ الگ احکام ذکر کئے ہیں۔

کھانے کی اتنی مقدار کہ جس کے ذریعہ انسان خود کو ہلاکت سے بچا سکے اور اس کو ترک کرنے میں ہلاکت کا اندیشہ ہو، فرض ہے، کیوں کہ انسان اس کے ذریعہ فرائض واحکامِ خداوندی کی تعمیل پر قادر ہو سکے گا اور اپنا فرض ادا کر کے عند اللہ اجر کا مستحق ہوگا، آپ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ ہر چیز پر اجر عطا فرمائیں گے یہاں تک کہ اس لقمہ پر بھی جس کو بندہ اپنے منہ میں رکھتا ہے۔ ان اللہ لیوجر فی کل شیئ حتی اللقمۃ یرفعھا العبد الی فیہ۔

اس سے زیادہ کھانا تا کہ کھڑے ہو کر نماز ادا کر سکے اور بہ سہولت روزہ رکھ سکے، مستحب ہے اس لئے کہ ایسے افعال جن کے ذریعہ طاعتِ خداوندی کی قوت میسر ہو، بجائے خود طاعت ہے۔ حضرت ابوذر سے دریافت کیا گیا کہ تمام اعمال میں افضل کونسا عمل ہے، فرمایا، نماز پڑھنا اور روٹی کھانا۔

قوتِ جسمانی میں اضافہ کے لئے آسودہ ہونے تک کھانا مباح ہے اس سے زیادہ کھانا جائز نہیں کہ اس میں مال کا ضیاع بھی ہے، اسراف اور فضول خرچی بھی اور یہ صحتِ جسمانی کے لئے ضرر رساں بھی ہے، اس لئے آپ نے فرمایا کہ نہ خوب کھانے میں خیر ہے نہ بھوکے رہنے میں بلکہ اعتدال ومیانہ روی بہتر ہے،

ں اگر آئندہ دن روزہ رکھنے کا ارادہ ہو یا مہمان شریکِ طعام ہو کہ رک جائے تو اس کو خجالت ہو گی تو ایسی صورت میں حسبِ ضرورت آسودگی سے زیادہ بھی کھائے تو مضائقہ نہیں، بھوکے رہنے کی ایسی ریاضت کہ عبادات و فرائض کی انجام دہی میں بھی دقت پیدا ہو جائے، جائز نہیں (۱)

فقہاء کے یہاں خوراک کے سلسلہ میں ان تفصیلات کا حاصل یہ ہے کہ انسان کا بالکل نہ کھانا جو انسان کی ہلاکت کا باعث بن جائے یا اتنا کم کھانا کہ انسان عبادت اور اپنے فرائض کی ادائیگی کے لائق بھی نہ رہے، خدا کی ایک امانت کے ساتھ بے پرواہی اور تغافل ہے، آسودگی سے بھی زیادہ کھانے میں کہ صحت جسمانی کے لئے مضر ہو، بعینہ یہی بات پائی جاتی ہے، کھانا اعتدال کے ساتھ کھایا جائے اور نیت عبادت میں سہولت اور فرائض و حقوق کے ادا کرنے میں آسانی کی ہو تو یہی عملِ دنیا عین عملِ دین اور یہی عادت عین عبادت بن جاتی ہے۔ شریعت اسلامی میں انسانی جان کی اہمیت اس درجہ ہے کہ اگر فاقہ مستی سے جان جانے کا اندیشہ ہو اور مردار کے سوا کچھ اور میسر نہ ہو لیکن مردار نہ کھایا جائے یا مسلسل روزے رکھتا رہے اور خورد و نوش سے گریزاں رہے، یہاں تک کہ موت آجائے تو گنہگار ہوگا (۲)

کھانے کی نوعیت

حلال و طیب غذاؤں میں جو بھی میسر ہو، کھائی جا سکتی ہے، انسانی طبائع اور اذواق کے اختلاف اور حالات و مقامات نیز موسموں کے فرق کی وجہ سے غذا کی نوعیت میں فرق ایک فطری چیز ہے اور اس سلسلہ میں کوئی تعیین و تحدید

---

(۱) مجمع الانہر ۲/۵۲۴۔

(۲) مجمع الانہر ۲/۵۲۵۔

بالکل خلافِ فطرت ہوگی، اسی لئے شریعت نے اس سلسلہ میں کوئی تحدید نہیں کی ہے اور اس کو ذوق و مزاج پر رکھا ہے۔ چنانچہ فقہاء لکھتے ہیں کہ تفکّہاً مختلف قسم کے میوہ جات کے کھانے میں قباحت نہیں کہ یہ بھی "کلوا من طیبات ما رزقناکم" میں داخل ہے (۱) اسی طرح لذیذ غذاؤں اور فالودہ کھانے میں مضائقہ نہیں و لا بأس باکل الفالوذج وانواع الاطعمۃ الشھیۃ (۲)

ہاں یہ ضرور ہے کہ شریعت بحیثیت مجموعی غذا میں سادگی کو پسند کرتی ہے اور مسرفانہ تکلفات اور تفاخر آمیز جذبات و خواہشات کو پسند نہیں کرتی، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں مروی ہے کہ جَو کے آٹے کی روٹی اس طرح پکائی جاتی کہ پیسنے کے بعد چھانا بھی نہ جاتا بلکہ محض پھونکنے پر اکتفاء کیا جاتا جو چھلکا نکل جاتا نکل جاتا اور جو رہ جاتا، رہ جاتا (۳) سرکہ کے بارہ میں آپؐ نے فرمایا کہ یہ بہترین سالن ہے نعم الادام الخل (۴) تلچھٹ اور کھرچن کو مزے لے کر تناول فرماتے (۵) اس طرح کی اور روایات ہیں جو سرپرآرائے عرب و عجم بلکہ تاجدارِ دنیا و عقبیٰ کی کمالِ بندگی اور غایت سادگی کا مظہر ہے۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

ہاتھ دھونا اور دھلانا

اسلام جہاں انسانیت کو آخرت کی سعادت سے بہرہ مند کرتا ہے وہیں دنیا کے معاملات اور مقتضیات و عادات میں بھی تہذیب و شائستگی سکھاتا ہے۔

---

(۱) مجمع الانہر ۲/۵۲۵۔

(۲) ہندیہ ۵/۳۴۱۔

(۳) شمائل ترمذی عن سہل بن سعد۔ باب فی صفۃ خبز رسول اللہ ﷺ ص: ۹۔

(۴) شمائل ترمذی عن عائشہ ص: ۱۰۔

(۵) شمائل ترمذی عن انس بن مالک ص: ۱۲۔

خوردونوش کے باب میں بھی اس کی یہ روشنی موجود ہے، ان میں پہلی چیز کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد ہاتھ دھونا ہے جس کو حدیث میں "وضوءِ طعام" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اس سے کھانے میں برکت پیدا ہوتی ہے، برکۃ الطعام الوضوء قبلہٗ والوضوء بعدہ (۱) صفائی اور نظافت کے علاوہ اس کا بڑا نفع انسانی صحت کا تحفظ ہے۔ ہاتھ ہی جسم کا وہ حصہ ہے جو مختلف افعال میں براہ راست مشغول کیا جاتا ہے، اس سے غیر محسوس طور پر گندگی اور مضرِ صحت چیزوں کے ہاتھ میں لگے رہنے کا غالب امکان ہے جو کھانے کے ساتھ انسان کے جسم میں داخل ہو سکتی ہیں، ہاتھ دھو کر انسان ایسی چیزوں سے اپنی حفاظت کرتا ہے، کھانے کے بعد ایسی اشیاء کا ہاتھ میں لگا رہنا یوں بھی طبعی نظافت کے خلاف ہے، نیز پہلی صورت سے بھی زیادہ صحتِ جسمانی کے لئے نقصان دہ۔

ہاتھ دونوں ہی دھوئے جائیں صرف ایک ہاتھ یا چند انگلیوں کے دھوئے سے سنت ادا نہ ہوگی اور پہنچوں تک دھوئے جائیں (۲) کھانے سے پہلے ہاتھ دھو کر تولیہ کا استعمال نہ کیا جائے، کھانے کے بعد ہاتھ دھو کر تولیہ کا استعمال کرنا چاہیے تاکہ کھانے کا اثر بالکلیہ جاتا رہے (۳) صابون وغیرہ کا استعمال کیا جائے تو قباحت نہیں، بلکہ فقہاء نے اجازت دی ہے کہ کوئی خوردنی شئی تنظیف اور صفائی ستھرائی کے لئے استعمال کی جاتی ہو تو اس سے بھی ہاتھ دھوئے جا سکتے ہیں (۴) امام خطابی نے اس پر اس سے استدلال کیا ہے کہ آپؐ نے ایک خاتون کو خونِ حیض دھونے کے لئے نمک کے استعمال کی اجازت دی تھی (۵)

---

(۱) شمائل ترمذی عن سلمان فارسی ص: ۱۲۔

(۲) ہندیہ ۵/۳۳۷۔ (۳) حوالۂ مذکور۔

(۴) ہندیہ ۵/۳۳۷۔ (۵) المغنی ۱/۲۲۲۔

بہتر ہے کہ ہاتھ خود دھوئے دوسروں سے مدد نہ لے کیوں کہ یہ بھی ایک طرح کا وضو رہے، ھذا کالوضوء ونحن لانستعین بغیرنا فی وضوءنا (۱) کئی افراد کو ہاتھ دھونا ہو تو ادب یہ ہے کہ پہلے نوجوان پھر عمر رسیدہ لوگ ہاتھ دھوئیں البتہ نوجوان کھانا شروع کرنے میں عمر رسیدہ لوگوں کے شروع کرنے کا انتظار کریں، کھانے کے بعد پہلے عمر رسیدہ پھر نوجوان ہاتھ دھوئیں (۲) کہ بڑوں کے پہلے ہاتھ دھونے میں ان کو زیادہ انتظار کرنا ہوگا۔ اس قیاس کا تقاضا تو یہ ہے کہ میر مجلس سب سے آخر میں ہاتھ دھوئے، لیکن لوگوں میں اس کے احترام واکرام کی رعایت کرتے ہوئے بہتر سمجھا گیا ہے کہ میر مجلس ہی سے ہاتھ دھلانے کا آغاز ہو (۳) فقہاء نے لکھا ہے کہ کھانے سے پہلے صرف ہاتھ دھویا جائے کلی کی ضرورت نہیں (۴)

دُعائیں

کھانا قریب میں رکھ دیا جائے تو یہ دعا پڑھے: اللّٰھم بارک لنا فی ما رزقتنا وقنا عذاب النار، بسم اللہ (عمل الیوم واللیلۃ ص: ۲۱۷)

کھانے کے شروع میں بسم اللہ کہنا چاہیئے۔ اگر شروع میں بسم اللہ کہنا بھول گیا، بعد کو یاد آئے تو بسم اللہ اولہ وآخرہ کہا جائے۔

حضرت عائشہؓ نے آپؐ سے نقل کیا ہے:

اذا اکل احدکم فلیذکر	جب تم میں سے کوئی کھانا کھائے تو اسم باری تعالیٰ
اسمَ اللہ فان نسی ان یذکر اسمَ	کا ذکر کرے اگر شروع میں بھول جائے تو

(۱) ہندیہ ۵/۳۳۷۔

(۲) حوالۂ مذکور۔

(۳) ہندیہ ۵/۳۴۵۔

(۴) البحر الرائق۔

اللہ فی اولہ فلیقل بسم اللہ اولہ وآخرہٗ ۔ بسم اللہ اولہ وآخرہ" کہے۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر بسم اللہ ان الفاظ میں کہے، بسم اللہ وعلیٰ برکۃ اللہ، کھانے سے پہلے یہ دعا بھی پڑھی جائے:

اللّٰھم بارک لنا فیہ واطعمنا خیراً منہ۔ (۲) خدایا! جو رزق عطا فرمائی ہے اس میں برکت دے اور اس سے بہتر رزق عطا فرما۔

اگر مختلف لوگ ساتھ کھا رہے ہوں تو بلند آواز سے بسم اللہ کہنا بہتر ہے تاکہ دوسروں کے لئے بھی تلقین ہو سکے (۳) کھانا ختم ہو تو اللہ کا شکر ادا کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ جب آپ کھانا کھاتے تو فرماتے:

الحمد للّٰہ الذی اطعمنا وسقانا وجعلنا من المسلمین (۴) تمام تعریف خدا کیلئے ہے جس نے کھلایا پلایا اور مسلمان بنایا۔

بعض روایات میں یہ دعا بھی نقل کی گئی ہے:

الحمد للّٰہ الذی اطعم واروی وانعم وافضل (المغنی ص ۲۲۲ ج ۲) خدا کی تعریف جس نے کھلایا، سیراب کیا اور انعام وفضل فرمایا۔

ایک اور روایت میں ہے:

اللّٰھم اطعمت وسقیت واغنیت واقنیت وھدیت واحییت، فلک الحمد علیٰ ما اعطیت (عمل الیوم واللیلۃ ص ۲۲۰ باب مایقول اذا اکل) الٰہا! تو نے کھلایا، پلایا، کھانے کی چیزوں کو میرے تابع کیا اور بے نیازی عطا فرمائی، رہنمائی بھی کی اور زندگی بھی بخشی، پس تیرا شکر ہے کہ تو نے مجھے عطا فرمایا۔

---

(۱) عمل الیوم واللیلۃ ص ۱۱۸۔

(۲) ترمذی عن ابن عباس باب مایقول اذا اکل طعاماً ۲/۱۸۳۔

(۳) ہندیہ ۵/۳۳۷۔

(۴) ترمذی عن ابی سعید باب مایقول اذا فرغ من الطعام ۲/۱۸۴۔

یہ الفاظ بھی مروی ہیں:

الحمد لله الذی منّ علینا و هدانا واشبعنا وارونا وکل الاحسان اٰتانا (عمل الیوم واللیلة ص ۲۲۱)

خدا کی تعریف جس نے ہم پر احسان کیا، ہدایت دی آسودہ و سیراب کیا اور تمام احسانات و بھلائی فرمائی۔

حضرت ابو ایوب کی روایت میں ہے:

الحمد لله الذی اطعم وسقی وسوّغة وجعل له مخرجا (عمل الیوم واللیلة ص ۲۲۲ باب مایقول اذا شرب)

خدا کی تعریف جس نے مجھے کھلایا، پلایا، اسے نگلنے کے قابل بنایا اور اس کے نکلنے کے لئے راہ بنائی۔

البتہ اگر ابھی دسترخوان کے کچھ شرکاء کا کھانا تمام نہ ہوا ہو تو زور سے تحمیدی کلمہ نہ کہے (۱) دسترخوان اٹھانے کے بعد یہ دعا مروی ہے:

الحمد لله کثیرا مبارکا فیه غیر مکفی ولا مودع ولا مستغنی عنه ربنا۔

تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں بہت ساری تعریفیں پاکیزہ اور مبارک۔ پروردگارا! ہم اس کھانے کو کافی سمجھ کر یا اس سے بے رغبت ہو کر یا خود کو مستغنی سمجھ کر نہیں اٹھا رہے ہیں۔

حضرت انس کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ دسترخوان بچھاتے ہوئے بسم اللہ اور اٹھاتے ہوئے الحمد للہ کہے۔ اگر کسی متعدی مرض میں مبتلا شخص کے ساتھ کھائے تو یہ کہے:

کل بسم الله، ثقة بالله وتوکلا علیه۔

خدا کے نام سے اس پر بھروسہ اور توکل کرتے ہوئے کھاؤ۔

کہ حضورؐ نے ایک مجذوم شخص کے ساتھ کھانا تناول فرمایا تو یہی ارشاد فرمایا۔ (عمل الیوم واللیلة ص ۲۱۹ باب مایقول اذا اکل۔)

---

(۱) ہندیہ ص: ۳۳۷ ج: ۵۔

دعاؤں کا اصل مقصود

یہ دعائیں دراصل شریعتِ اسلامی کی ذہنی تربیت و پرداخت کے اس مزاج کے عین مطابق ہیں جو قدم قدم پر انسان کو خدا سے تعلق کی یاد دلاتی ہے اور متوجہ کرتی ہیں، اس سے خدا کی شان ربوبیت اور کمالِ قدرت کا اظہار ہوتا ہے، ایک مسلمان جب کھانے سے پہلے خدا کا نام لیتا ہے، کھانے کے درمیان خدا کا شکر ادا کرتا ہے اور کھانے کے بعد بھی اس کی زبان حمد باری سے زمزمہ سنج ہوتی ہے دستر خوان بچھاتا ہے تو اسی کے نام سے اور اٹھاتا ہے تو اسی کے ذکر سے۔ تو یہ توحید ہی کا مکرر و مؤکد اقرار و اعتراف ہوتا ہے جو اس بات کی یاد دلاتا ہے کہ یہ غذا محض خدا ہی کی قدرت سے اس کو عطا ہوئی ہے، ہر دانہ جو انسان کے حلق سے اترتا ہے، خدا کی قدرت کی کتنی ہی جلوہ فرمائیوں کے بعد وجود میں آیا ہے، سورج نے اس کے لیے خود کو جلایا ہے، چاند نے اپنی ٹھنڈک پہنچائی ہے، شبنم کی پھوار اس پر نثار ہوئی ہے، زمین نے اپنے سینہ و جگر کا چاک ہونا قبول کیا ہے، بادلوں نے سمندر سے خراجِ آب وصول کیا ہے۔ ہواؤں نے ان بادلوں کی باربرداری کی ہے، پھر یہ خدا ہی کی قدرت ہے کہ ایک ہی طرح کے عناصر سے مرکب ہونے والی ان اشیاء میں کہیں حلاوت ہے کہیں ملاحت، کہیں کھٹاس ہے کہیں تلخی، رنگ و بو کے فرق نے بھی ان کو ایک گلدستہ سا بنا دیا ہے، پھر خود انسان کے جسم میں نظام ہضم ایک عالمِ عبرت و موعظت کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے، آفاق و انفس کی یہ ساری داستانیں چشم ہائے عبرت و نگاہانِ بصیرت کے سامنے چاول کے ایک ایک دانہ اور پانی کے ایک ایک قطرہ کے ساتھ اس طرح رونق افزا ہوتی ہیں کہ خدا کے ذکر و ستائش کے سوا چارہ نہیں رہتا۔ سُبحان اللہ وبحمدہٖ سُبحان اللہ العظیم۔

کس طرح کھایا جائے؟

کھانے کے لئے دایاں ہاتھ استعمال کیا جائے، بائیں ہاتھ کے استعمال کو آپؐ نے پسند نہیں فرمایا ہے، اذا اکل احدکم فلیاکل بیمینہ (مسلم عن ابن عمرؓ) کیوں کہ بائیں ہاتھ کا استعمال نجاست کی تطہیر کے لئے ہے، اس کا کھانے کے لئے استعمال کرنا نظافت سے بعید ہے، ہاں دائیں ہاتھ کے استعمال میں کوئی عذر ہو تو بایاں ہاتھ بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔

مسنون طریقہ یہ ہے کہ تین انگلیوں سے کھایا جائے، کعب بن مالک کی روایت ہے کان رسول اللہ یاکل بثلاث اصابع (مسلم کتاب الاطعمۃ ۱۷۵/۲) مقصود یہ ہے کہ بلاضرورت ہاتھ کا زیادہ حصہ کھانے میں آلودہ نہ ہو، اسی قدر انگلیاں استعمال کی جائیں جن سے بہ سہولت کھایا جاسکے۔ آپؐ کے زمانہ میں چوں کہ کھجور اور روٹی ہی عام غذا تھی اس لئے تین انگلیوں سے بہ سہولت کھایا جاسکتا تھا فی زمانہ چاول وغیرہ کھانے میں چوں کہ چار انگلیاں استعمال کرنی ہوتی ہیں اس لئے اس میں بھی کوئی حرج نہیں ——— آپؐ نے اس بات کی بھی خاص ہدایت فرمائی ہے کہ کھانے کے بعد پلیٹ انگلیوں کے ذریعہ چاٹ لی جائے۔ انگلیاں چاٹے بغیر ان کو پونچھ لینے سے بھی آپؐ نے منع فرمایا ولا یمسح یدہ بالمندیل (مسلم و ترمذی عن جابرؓ ۱۷۵/۲) اس سے معلوم ہوا کہ انگلیاں چاٹے بغیر ہاتھ دھویا نہ جائے، یہ بھی مسنون ہے، اس کی ایک طبی مصلحت بھی ہے، کھانے کے درمیان انگلیوں پر لعاب لگ جاتا ہے اور چاٹنے کی وجہ سے منہ میں مزید لعاب پیدا ہوتا ہے، یہ لعاب نظامِ ہضم میں نہایت معاون ہوتا ہے، کھانے کے بعد برتن میں بھی ہاتھ دھویا جاسکتا ہے (المغنی ص ۲۲۲ ج ۷) علامہ سخاوی نے بھی لکھا ہے کہ اس کی ممانعت پر کوئی

حدیث نہیں (المقاصد الحسنہ ص:) ہاں اس کا تعلق رہائش، عرف و عادت اور آداب سے ہے۔ جہاں اس طرح برتن میں ہاتھ دھونے کو ناپسندیدہ تصور کیا جاتا ہے وہاں برتن میں ہاتھ دھونا خلاف مروت ہوگا۔

آپؐ کھانے کا آغاز بھی نمکین شئ سے کرتے اور اسی طرح کھانا ختم بھی کرتے (۱) ... کھانے میں کوئی بھی ایسا عمل جو انسانی صحت کے لئے مضر ہو مکروہ ہے، اسی لئے آپؐ نے کھانے میں پھونکنے سے منع فرمایا (۲) فقہاء نے کھانے کو سونگھنے اور گرم گرم کھانا کھانے کو ناپسند کیا ہے (۳) یہ بھی مسنون ہے کہ کھانا کنارہ سے لیا جائے پلیٹ کے وسط سے کھانے کا آغاز مکروہ ہے (۴) کہ یہ شائستگی کے خلاف ہے، راستہ چلتے کھانا مکروہ اور خلاف مروت ہے (۵) آپؐ نے کھڑے کھڑے کھانے سے بھی منع فرمایا ہے (۶) البتہ کھلے سر کھانے میں مضائقہ نہیں، ولا بأس بالأكل مكشوف الرأس وهو المختار (۷) کھانے کی خامی اور عیب کا اظہار بھی روا نہیں آپؐ کا طریقہ تھا کہ کھانا پسند آتا تو تناول فرماتے، پسند نہ ہوتا تو نہ کھاتے لیکن عیب نہ لگاتے (۸)

کھانے کی مسنون نشست

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خورد و نوش کے طریقوں میں بھی بندگی و

---

(۱) كذا في الخلاصہ، ہندیہ ۳۳۷/۵۔

(۲) ترمذی عن ابن عباس، باب کراہیۃ النفخ فی الاناء ۱۱/۲۔

(۳) ہندیہ ۳۳۷/۵۔ (۴) ہندیہ ۳۳۷/۵۔

(۵) حوالۂ مذکور۔

(۶) ترمذی عن انس بن مالک، باب نہی عن الشرب قائماً ۱۰/۲۔

(۷) ہندیہ ۳۳۷/۵۔

(۸) بخاری عن ابی ہریرہ ۸۱۴/۲۔

فروتنی نمایاں تھی، خود ارشاد ہوا انا آکل کما یأکل العبد (۱) پیچھے یا آگے کی جانب ٹیک لگا کر کھانا یا بائیں ہاتھ کا سہارا لے کر کھانا بھی آپؐ نے پسند نہیں فرمایا (۲) آپؐ سے تین طریقوں سے کھانا ثابت ہے ۔ اکڑوں، ایک پاؤں بچھا کر اور دوسرا اٹھا کر کھانا ۔ تورک کے ساتھ بیٹھنا (۳) ۔

اسی طرح کھانے کے طور و طریق میں بے جا تکلفات (جو سادگی کے تقاضوں کے خلاف ہوں) کو آپؐ نے پسند نہیں فرمایا، آپؐ نے چاقو سے کاٹ کر گوشت کھانے کو منع فرمایا اور فرمایا کہ یہ اہل عجم کا طریقہ ہے " لاتقطعوا اللحم بالسکین فانه من صنع الاعاجم (۴) لیکن یہ ممانعت کوئی حرمت کے درجہ کی نہیں ہے، کبھی آسانی کے لئے چھری کا استعمال کیا جاسکتا ہے ۔ بخاری کی روایت ہے کہ بعض اوقات آپؐ خود اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے بکرے کا دست کاٹ کر کھایا کرتے تھے " کان یحتز من کتف شاۃ فی یدہ " (۵) اسی روایت کی روشنی میں ابن قدامہ نے لکھا ہے کہ چھری سے گوشت کے ٹکڑے کرنے میں کوئی حرج نہیں (۶) صاحب مجمع الانہر کا بیان ہے کہ : لایکرہ قطع اللحم والخبز بالسکین (مجمع الانہر ص ۵۲۵ ج ۲)

روایت میں ہے کہ آپؐ نے کبھی میز پر کھانا نہیں کھایا (۷) ہاں دسترخوان کا استعمال کیا ہے (۸) اسی طرح طشتری بھی استعمال نہیں فرمائی ۔

---

(۱)

(۲) بخاری باب الاکل متکئاً ۲/۸۱۲ عن ابی جحیفۃ ۔

(۳) زاد المعاد ۲/۱۶۱، فصل فی ھدیہ فی ہیئۃ الجلوس للاکل ۔

(۴) ابوداؤد عن عائشہ، باب فی اکل اللحم ۲/۵۳۰ ۔

(۵) بخاری باب قطع اللحم بالسکین ۲/۸۱۴ عن عمرو بن امیۃ ۔

(۶) المغنی ۷/۲۲۱ ۔

(۷) بخاری باب الخبز المرقق والاکل علی الخوان ۲/۸۱۱ ۔

(۸) حوالہ سابق، عن قتادہؓ ۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بحیثیتِ مجموعی کھانے پینے کے طور و طریق میں سادگی شریعت میں مطلوب ہے۔ میز و کرسی کا استعمال ناجائز تو نہیں لیکن سنتِ نبویؐ کے خلاف ہے۔

کچھ اور آداب

اللہ کی طرف سے عطا کردہ رزق کا احترام ضروری ہے اور کوئی بھی عمل جس سے اس کی بے احترامی کا اظہار ہوتا ہو، مکروہ ہے۔ چنانچہ روٹی سے ہاتھ یا چھری کو پونچھنے سے فقہاء نے منع فرمایا ہے (۱) اس بات سے بھی منع کیا گیا ہے کہ روٹی کے بیچ کا حصہ کھا لیا جائے اور کنارے چھوڑ دیئے جائیں (۲) روٹی کے ٹکڑے جمع ہو جائیں تو بجائے پھینک دینے کے مرغی بکری وغیرہ کو کھلا دے (۳) دسترخوان بچھائے جانے کے بعد جب تک اٹھا نہ دیا جائے کھانے والوں کو اٹھنے سے منع فرمایا، اذا وضعت المائدۃ فلا یقوم رجل حتی ترفع المائدۃ (۴)

پینے کے آداب

پینے کے آداب بھی وہی ہیں جو کھانے کے آداب ہیں، عام طور پر کھڑے ہو کر پینا مناسب نہیں (۵) البتہ آپؐ سے کھڑے ہو کر پینا بھی ثابت ہے، اس لئے کبھی کھڑے ہو کر پی لیا جائے تو مباح ہے۔ پانی تین سانس میں پیا جائے کہ ایک

---

(۱) مجمع الانہر ص ۵۲۵ ج ۲۔
(۲) حوالہ سابق۔
(۳) غیاثیہ ص ۱۰۹۔
(۴) جمع الفوائد ۱/۲۹۴۔
(۵) ترمذی عن انس بن مالک وجابر۔ باب نہی عن الشرب قائماً۔ ص: ۱۰ ج ۲۔

سانس میں پینے میں صحت کے لئے مضرت کا اندیشہ ہے (۱) کھانے ہی کی طرح پانی میں بھی پھونک مارنے سے منع فرمایا گیا (۲) شروع میں بسم اللہ اور آخر میں الحمد للہ پڑھے (۳) دودھ پینے کے بعد حضورؐ سے خصوصی دعا منقول ہے: اللھم بارك لنا فیه وزدنا منه (۴)

عمرو بن حمق خزاعی نے آپؐ کو دودھ پلایا تو آپؐ نے دعا دی: اللھم امتعه بشبابه۔ اس دعا کا اثر یوں ہوا کہ ان کی عمر ۸۰ سال ہو گئی اور اس وقت تک ایک بال بھی سفید نہ ہوا (۵)

مسلمان کی دعوت

مسلمانوں کی دعوت قبول کی جانی چاہئے، حدیث میں خصوصیت سے دعوتِ ولیمہ کے بارے میں منقول ہے کہ دعوتِ ولیمہ ضرور قبول کی جائے، حافظ ابن عبد البر نے نقل کیا ہے کہ دعوتِ ولیمہ کی قبولیت کے واجب ہونے پر فقہاء کا اجماع ہے، بشرطیکہ کوئی عذر نہ ہو (۶) اس کے علاوہ دوسری دعوتوں کا قبول کرنا مستحب ہے اور اس پر ائمۂ اربعہ کا اتفاق ہے (۷) عالمگیری میں ولیمہ کو بھی سنت قرار دیا گیا ہے (۸) اور یہی صحیح ہے۔ اگر کسی وجہ سے دعوت قبول نہ کر سکے تو دعا دینے پر

---

(۱) ترمذی عن انس بن مالک باب فی التنفس فی الاناء ۲/۱۰۔
(۲) عن ابن عباس بسند ضعیف، جمع الفوائد ۱/۲۹۴۔
(۳) عن ابن مسعود، کتاب عمل الیوم واللیلۃ ص: ۲۲۳۔
(۴) عمل الیوم واللیلۃ ص ۲۲۴۔ باب مایقول اذا شرب اللبن۔
(۵) عمل الیوم واللیلۃ ص ۲۲۴۔ باب مایقول لمن سقاہ۔
(۶) المغنی ص: ۲۱۳ ج: ۷۔
(۷) المغنی ۷/۲۱۸۔
(۸) ہندیہ ۵/۳۴۳۔

اکتفا کرے، ارشاد نبوی ہے:

اذا دعی احدکم فلیجب فان کان صائماً فلیدع وان کان مفطرا فلیطعم۔ (ابوداؤد عن ابی ہریرہؓ)	تم میں سے کسی کو دعوت دی جائے تو قبول کرے۔ روزہ سے ہو تو دُعا دینے پر اکتفا کرے اور روزہ نہ ہو تو کھالے۔

جس دعوت میں منکر ہو!

لیکن اگر دعوت کسی منکر اور خلافِ شرع بات پر مشتمل ہو تو حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے اس میں شرکت کو ناپسند فرمایا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ جس دسترخوان پر شراب پی جائے اس پر نہ بیٹھا جائے، نھیٰ عن الجلوس علیٰ مائدۃ یشرب الخمر علیھا (۱)

فقہاء نے آپؐ کی اس ہدایت نہی عن المنکر کے متعلق اسلام کا خاص اعتنا اور حالات وحیثیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے کہ کس قسم کی دعوتوں میں شرکت مباح ہے اور کس میں شرکت مکروہ ؟۔

دعوت کے ساتھ اگر منکرات ہوں تو فقہاء احناف کے نقطۂ نظر کا حاصل یہ ہے کہ اگر پہلے سے دعوت میں منکرات کے شامل ہونے کا علم ہو تب تو اس میں شرکت جائز نہیں۔ ایسی دعوت قبول نہ کرنی چاہیئے۔ ولو علم قبل الحضور لا یقبلہ (۲) گو بعض فقہاء نے اس کو جائز قرار دیا ہے اور اس کو نماز جنازہ کے ساتھ نوحہ پر قیاس کیا ہے (۳) مگر یہ قیاس درست نہیں معلوم ہوتا کہ نماز جنازہ فرض ہے اور قبولِ

---

(۱) جمع الفوائد ۱/۲۹۳۔

(۲) البحرالرائق ۸/۱۸۸۔

(۳) فتح القدیر ۸/۴۴۴۔

دعوت، سنت ———— اگر پہلے سے علم نہ ہو اور آ گیا اور منکرات عین دستر خوان پر رہی ہوں تو اب بھی نہ بیٹھے ولو کان ذلک علی المائدۃ لاینبغی ان یقعد[1]۔ اگر منکرات عین دستر خوان پر نہ ہو رہی ہوں لیکن اس کو مقتدیٰ کی حیثیت حاصل ہو عام لوگ اس کے طریق وعمل کو قابلِ اتباع باور کرتے ہوں تو اس کے لئے اب بھی اس دعوت میں رکنا جائز نہیں۔ پہلے اس منکر کو دور کرنے کی سعی کرے اور اگر اس پر قدرت نہ ہو تو خود چلا جائے فان کان مقتدیٰ ولم یقدر علیٰ منعھم یخرج و لایقعد (۲) اگر اس کو یہ حیثیت حاصل نہ ہو تو اول تو اس برائی کو رفع کرنے کی سعی کرے اور اگر ایسا نہ ہوسکے تو بہ کراہت خاطر کھانے میں شرکت کرسکتا ہے، فان قدر علی المنع منعھم وان لم یقدر یصبر، وھذا اذا لم یکن مقتدیٰ به (۳)

حنابلہ اور شوافع کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اگر پہلے سے دعوت کے ساتھ منکر کی موجودگی کا علم تھا تو اگر وہ اس منکر کے ازالہ پر قادر ہو تو واجب ہے کہ دعوت میں شریک ہو اور اس منکر کو دور کرے اور اگر اس منکر سے نہ روک سکتا ہو تو شریک نہ ہو، یہی حکم اس وقت بھی ہے جب کہ پہلے سے دعوت میں منکر کی موجودگی کی اطلاع نہ ہو، آنے کے بعد اطلاع ہوئی، اس صورت میں بھی یا تو معصیت سے روک دے ورنہ واپس چلا جائے (۴) مالکیہ کا نقطۂ نظر بھی قریب یہی ہے البتہ امام مالک کے مشہور شاگرد ابن قاسم کا خیال ہے کہ معمولی قسم کے لہو جیسے "دف" ہو تو لوٹنا ضروری نہیں۔ اصبغ کہتے ہیں کہ بہر طور لوٹنا ضروری ہے (۵)

---

(۱) ہندیہ ۳۴۳/۵۔

(۲) فتح القدیر ۴۴۸/۸۔

(۳) حوالۂ سابق۔ نیز ملاحظہ ہو بحر: ۱۸۸/۸۔

(۴) المغنی ۲۱۴/۷۔

(۵) المغنی ۲۱۵/۷۔

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ ان تمام فقہاء کے سامنے جو بات ہے وہ یہ کہ ایک طرف منکر سے روکنا اور کم سے کم اس پر ناگواری کا اظہار ہر مسلمان پر واجب ہے دوسری طرف یہ بات بھی ضروری ہے کہ کسی برائی سے روکنے کے لئے شدت سے بچنے کی راہ اختیار کی جائے اور ایسا عمل نہ کیا جائے جس سے رشتہ تعلق اور محبت کی وہ آخری سوت بھی کٹ جائے جس کو بنیاد بنا کر آئندہ اصلاح حال کی جا سکتی تھی، احناف کا نقطۂ نظر اسی دوہرے اصول کے درمیان تطبیق پر مبنی ہے کہ جہاں پر روکنے کی قدرت ہے وہاں روکنے کی سعی میں کوتاہی نہ کرے، جہاں روکنے پر قادر نہ ہو اور پہلے سے خبر ہو وہاں ناگواری کے اظہار اور شرکت میں اجتناب سے تکلف نہ کرے آگیا ہو اور کسی منکر کا ابتلاء ہو اور سماج میں اس کو مقام اقتدار حاصل ہو تو اب بھی پائے ثبات میں تزلزل نہ آنے دے اور واپس چلا جائے لیکن وہ سماج کا اتنا اہم شخص نہ ہو، پہنچ چکا ہو اور منکرات عین دسترخوان پر نہ ہوں تو کراہت خاطر کے ساتھ رک جانے کی گنجائش ہے اور مصلحت وہی ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی یہ واپسی رشتہ اور تعلق کی آخری سوت کو بھی کاٹ کر رکھ دے اور آئندہ اصلاحِ حال اور نہی عن المنکر کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ اب جبکہ معاشرہ میں بعض منکرات لزوم کا درجہ اختیار کرتی جارہی ہیں اور ابتلاء اس طرح عام ہوتا جا رہا ہے کہ کیا عوام اور کیا خواص، اور کیا اہل دین اور کیا بے دین ؟ کوئی طبقہ محفوظ نہیں۔ ان میں نہی وانکار میں کمال مصلحت وحکمت اور تدریج سے کام لیا جائے، ایسا طرز عمل اختیار نہ کیا جائے جس سے اصلاح کا دروازہ ہی ہمیشہ کے لئے بند ہو جائے اور نہ یہ ہو کہ مباحات ومکروہات اور محرمات ومحظورات کو ایک ہی صف میں جگہ دیدی جائے اور سب کے ساتھ ایک ہی رویہ روا رکھا جائے، یا وہ منکرات جن کا ناجائز ہونا فقہاء کے درمیان متفق علیہ ہو

اور ان پر نص وارد نہ ہو اور وہ جو اجتہادی ہوں اور ان میں اختلاف کی گنجائش ہو، کو ایک ہی درجہ دیدیا جائے کہ اس سے خیر سے زیادہ شر اور نفع سے زیادہ ضرر کا اندیشہ ہے۔ ایسا شخص جو فسق و فجور میں مبتلا ہو اس کی دعوت مناسب ہے کہ نہ قبول کی جائے تاکہ اس کے فسق و فجور پر ناراضگی کا اظہار ہو لا یجیب دعوۃ الفاسق المعلن لیعلم انہ غیر راض بفسقہ (۱) تاہم ضروری ہے کہ اس کا استعمال مصالح و حالات کی رعایت کے ساتھ کیا جائے، اگر اس بات کا امکان ہو کہ اس کی دعوت قبول کر کے اس کی اصلاح کی جاسکتی ہے تو اس اہم تر مصلحت کی بنیاد پر دعوت قبول کی جاسکتی ہے۔

غیر مسلموں کی دعوت

فقہاء نے غیر مسلموں کی دعوت قبول کرنے کو جائز قرار دیا ہے کہ خود آپؐ نے ایک یہودی کی دعوت قبول فرمائی تھی (۲) دراصل اسلام نے عام انسانی سلوک اور اکرام میں مسلم اور غیر مسلم کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا ہے، ہاں اگر اسکی دعوت اس کے کسی مذہبی عقیدہ و عمل سے متعلق ہو تو اس میں شرکت جائز نہ ہوگی کہ یہ کفر میں تعاون یا کم سے کم اس پر رضا کا اظہار ہوگا۔ ہندوؤں کے یہاں تیوہاروں اور دیوی دیوتاؤں کے پرشاد کا یہی حکم ہے کہ ان کا قبول کرنا جائز نہیں۔ اگر کسی فتنہ کے اندیشہ سے قبول کرنے کے سوا چارہ نہ ہو تو کھانا جائز نہیں، اسی طرح غیر مسلموں کو دعوت دینا بھی جائز ہے۔ خود آپ نے بعض کفار کی میزبانی کی ہے (۳)

مسلمان کی دعوت کے متعلق ایک ضروری ہدایت

(۱) ہندیہ ۵/۳۴۳۔

(۲) المغنی ۷/۲۱۳۔

(۳) جمع الفوائد ۱/۲۹۴۔

دعوت، ہدایا اور تحائف کے سلسلہ میں اصول یہ ہے کہ کسی مسلمان شخص کے یہاں کھانا کھایا جائے تو اس حسن ظن پر کہ یہ آمدنی اس کو حلال طریقہ ہی سے حاصل ہوئی ہوگی، اس کے بارے میں تحقیق و تفتیش نہ کرے۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے آپؐ سے روایت کیا ہے:

اذا دخل احدکم علیٰ اخیہ	تم میں سے کوئی اپنے مسلمان بھائی کے ہاں جائے
المسلم فاطعمہ طعاماً فلیأکل	اور وہ اسے کھانا کھلائے تو کھالے۔ اس کے
من طعام ولا یسأل عنہ، وان سقاہ	بارے میں تفحص نہ کرے، کچھ پلائے تو پی لے
شرابا فلیشرب من شرابہ ولا یسأل	اور تفحص نہ کرے۔
عنہ (۱)۔	

اسلئے کہ یہ ایک مسلمان سے سوء ظن اور بدگمانی ہے، اسی لئے فقہا کے یہاں قاعدہ ہے:

الیقین لایزول بالشك (۲)	یقین شک سے دور نہیں ہوتا۔

پس جب تک کسی کی آمدنی کے حرام ہونے کا یقین یا گمانِ غالب نہ ہو اور اس سلسلہ میں کوئی قرینہ یا شہادت موجود نہ ہو ایک مسلمان کے ساتھ حسن ظن کے تحت اسے حلال و مباح سمجھا جائے گا۔

ان اصول کے تحت ایسا شخص کہ جس کے پاس حلال و حرام دونوں طرح کی آمدنی ہو، کب اس کے ہدایا کا قبول کرنا جائز ہوگا اور کب نہیں؟ اس بارے میں فقہاء نے رہنمائی کی ہے کہ اگر کسی کی آمدنی کا غالب حصہ حرام آمدنی پر مشتمل ہو تو اس کے تحائف قبول کرنا یا اس کے یہاں کھانا جائز نہ ہوگا اور غالب حصہ حلال کا ہو تو ضیافت نیز تحائف کا قبول کرنا جائز ہوگا۔ البتہ اگر غالب آمدنی حرام ہو اور

---

(۱) جمع الفوائد ص ۱/۲۹۷۔

(۲) الاشباہ ص: ۵۶۔

اور ہدایا کی رقم کے بارے میں دینے والا صراحت کرے کہ یہ حلال کی آمدنی سے ہے تو قبول کر سکتا ہے۔ اسی طرح آمدنی کا غالب حصہ حرام پر مشتمل ہو لیکن ہدیہ دینے والا کسی ایسے ذریعۂ آمد کی اطلاع دے جو حلال ہو جیسے قرض یا وراثت، تو قبول کیا جا سکتا ہے[1]۔

مہمان اور میزبان کے آداب

اسلام میں مہمان () کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔ خود رسول اللہ صلعم بڑے مہمان نواز تھے، آپؐ نے غیر مسلم مہمانوں کی بھی ضیافت پورے اہتمام سے فرمائی ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ تین دنوں مہمان نوازی حق ہے، پہلے دن اہتمام کے ساتھ اور بعد کے دنوں میں جو بے تکلف میسر آجائے، کھلا دیا جائے، اس میں مہمان کی رعایت بھی ہے اور میزبان کی بھی، بلکہ بعض صورتوں میں تو میزبانی کو واجب قرار دیا گیا ہے (ترمذی ۲/۱۸)

مہمان کے لئے مستحب ہے کہ میزبان جہاں بیٹھانے کا نظم کریں، وہاں بیٹھے، جو کچھ کھانے کے لئے پیش کیا جائے اسی پر راضی رہے، صاحب خانہ کی اجازت ہی سے نکلے اور واپس ہوتے ہوئے دعا دے (۲) مدعوئین ایک دوسرے کو کھانا لگا سکتے ہیں یا نہیں؟ بعضوں نے اجازت دی ہے اور بعضوں نے منع کیا ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ اس کا انحصار عرف پر ہے۔ جہاں کے عرف میں مہمانوں کا اس طرح ایک دوسرے کو کھانا لگانا مروج ہو اور اس پر میزبان کو ناگواری نہ ہوتی ہو وہاں ایک دوسرے کو کھانا لگانا جائز ہوگا ورنہ نہیں۔ الصحیح فی ھذا انہ ینظر الی العرف والعادۃ دون التردد (۳)

---

(۱) عالمگیری ۵/۳۴۲۔
(۲) ہندیہ ۵/۳۴۴۔
(۳) حوالۂ سابق۔

میزبان کے لئے مستحب ہے کہ کھانے کے درمیان اصرار شدید (الحاح) کے بغیر مہمان سے مزید کھانے کی خواہش کرے، مہمانوں سے گفتگو کرے، مہمان کے پاس سے غائب نہ رہے، اس کی موجودگی میں اپنے خدام پر برہم نہ ہو، مہمانوں کے یہاں ایسے شخص کو نہ بیٹھانا چاہیئے جس سے اس کو گرانی ہو (۱) حضرت ابراہیم کی سنت کے مطابق مہمان نوازی اور میزبانی کا فریضہ بذاتِ خود انجام دینا چاہیئے (۲) کھانا پیش کرنے سے پہلے ہاتھ دھونے کے لئے پانی پیش کرنا چاہیئے (۳)

میزبان کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دعا منقول ہے:

اللھم بارك لھم فی ما رزقتھم و اغفرلھم وارحمھم (۴) (مسلم عن عبداللہ بن بسر) — خدایا! ان کی رزق میں برکت دے، ان کو معاف فرما اور رحم کر۔

اور اگر آپ کسی شخص کے یہاں روزہ افطار کرتے، یہ دعا پڑھتے:

افطر عندکم الصائمون واکل طعامکم الابرار وصلت علیکم الملائکۃ (۵) — تمہارے پاس روزہ داروں نے افطار کیا، نیکوکار تمہارا کھانا کھائیں اور فرشتے دعا رحمت کریں۔

(ابوداؤد عن انس)

حیوانات میں حلال وحرام

دنیا کے مختلف مذاہب اور اقوام میں حیوانات کے بارے میں ایک خاص قسم کا افراط وتفریط ہے، ایک طرف وہ لوگ ہیں جو حیوانی اجزاء کے غذائی

---

(۱) ہندیہ ۵/۳۴۵۔

(۲) ہندیہ ۵/۳۴۵۔

(۳) حوالۂ سابق۔

(۴) عمل الیوم واللیلۃ ص ۲۲۵، باب ما یقول اذا اکل عند المؤمن۔

(۵) ابوداؤد عن انس۔

استعمال کو بے رحمی تصور کرتے ہیں اور اس کو مطلق منع کرتے ہیں، دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو ہر جانور کو انسانی خوراک قرار دیتے ہیں اور اس باب میں کوئی امتیاز و تفریق روا نہیں رکھتے ــــــ یہ دونوں ہی اعتدال سے دور اور قانونِ فطرت کے باغی ہیں۔ خدا نے اس کائنات میں جو نظامِ ربوبیت قائم کیا ہے وہ اسی پر مبنی ہے کہ اعلیٰ مخلوق اپنے سے کمتر مخلوق کے لئے سامانِ بقا بنے۔ غور کرو کہ درندے اپنے سے کمزور حیوان سے پیٹ بھرتے ہیں، چوپائے نباتات کھاتے ہیں اور اسی پر ان کی حیات کا دارو مدار ہے حالاں کہ نباتات میں بھی ایک نوع کی حیات موجود ہے بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کو غذا بناتی ہے اور چھوٹی مچھلیاں آبی حشرات کو، زمین پر رہنے والے جانوروں کی خوراک زمین پر چلنے والے حشرات الارض ہیں، چھوٹے پرندے بڑے پرندوں کی خوراک ہیں اور کیڑے مکوڑے چھوٹے پرندوں کے۔ خدا کی کائنات پر جس قدر غور کیا جائے اس کے نظام و انتظام کی اساس یہی ہے جو لوگ اس اصول کے بغیر دنیا میں زندہ رہنا چاہتے ہیں ان کے لئے کم سے کم خدا کی اس بستی میں رہنے کا کوئی جواز نہیں کہ پانی کا کوئی قطرہ اور ہوا کی کوئی سانس اس وقت تک حلق سے اتر نہیں سکتی جب تک کہ سیکڑوں نادیدہ جراثیم اپنے لئے پیغامِ اجل نہ سُن لیں۔

یہی بے اعتدالی اس سمت میں بھی ہے کہ ہر حیوان کو غذا کے لئے درست سمجھا جائے۔ یہ مسلمات اور ثابت شدہ حقائق میں سے ہے کہ انسان پر غذا کا اثر پڑتا ہے۔ یہ اثر جسمانی بھی ہوتا ہے اور اخلاقی کی۔ جانوروں میں شیر و ببر درندے ہیں۔ سانپ و بچھو کی کینہ پروری و ریشہ زنی کی خو معروف ہے، گدھے میں حمق ضرب المثل ہے۔ خنزیر میں جنسی بے اعتدالی و ہوسناکی کا اثر ان قوموں میں آفتاب نصف النہار کی طرح نمایاں ہے جو اس کا استعمال کرتی ہیں، کتّے کی حرص و

آز اور قناعت و استغناء سے محرومی نوک زباں ہے۔ چھپکلی اور بعض حشرات الارض بیماریوں کا سرچشمہ ہیں۔ بندر کی بے شرمی، لومڑی کی چال بازی گیدڑ کی بزدلی محتاجِ اظہار نہیں۔ مقام فکر ہے کہ اگر انسان کو ان جانوروں کے خوراک بنانے کی اجازت دیدی جائے تو کیا یہی اوصاف اس کے وجود میں بھی رچ بس نہ جائیں گے؟

اسی لئے اسلام نے ان دونوں کے درمیان اعتدال کی راہ نکالی، ایک طرف بہت سے جانوروں کو حلال قرار دیا، دوسری طرف وہ حیوانات جن کا گوشت انسان کی اخلاقی کیفیت، طبعی افتاد اور جسمانی صحت کے لئے مضر ہو سکتا تھا ان کو حرام قرار دیا۔ اب یہ کہ کونسے جانور حرام ہیں اور کونسے حلال؟ اس سلسلہ میں قرآن مجید نے ایک قاعدہ مقرر کر دیا کہ "طیبات" اور پاک مویشی حلال ہیں اور ناپاک و بدخو جانور جن کو قرآن کی زبان میں "خبائث" کہا گیا ہے، حرام ہیں، یحل لھم الطیبات ویحرم علیھم الخبائث (الاعراف: ۱۵۷) کہ انسانی فطرتِ سلیمہ جسے پاکباز و طیب سمجھے اسے کھائے اور جس کو خبیث سمجھے اسے نہ کھائے، لیکن ظاہر ہے کہ اس فیصلہ کو ہر انسان کے ذوق و مزاج پر منحصر کر دیا جانا نہ ممکن تھا اور نہ مناسب، چنانچہ شریعت نے اس کی جزوی تفصیلات بھی متعین کر دی کہ کن کا شمار طیبات میں ہے اور کن کا خبائث میں؟ ——— چنانچہ اس کی تفصیل یوں ہے کہ حیوانات تین طرح کے ہیں، دریائی، زمینی اور پرندے۔

دَریائی جانور

دَریائی جانوروں میں امام ابوحنیفہ کے نزدیک صرف مچھلی حلال ہے بقیہ کوئی بھی جانور حلال نہیں۔ مردار ہو تو "حرمت علیکم المیتۃ"، میں داخل ہے اسلئے

کہ حضورؐ نے اس سے صرف مچھلی اور ٹڈی کا استثناء فرمایا ہے اور زندہ ہو تو خبائث میں داخل ہے ——— نیز مچھلی بھی اگر طبعی موت مرجائے اور اس طرح اوپر آجائے کہ پیٹ کا حصہ اوپر ہو اور پشت کا حصہ نیچے تو یہ حرام ہے، اسی کو حدیث میں سمک طافی قرار دیا گیا ہے اگر اس کے برعکس پشت کا حصہ اوپر ہو تو اس مچھلی کو کھانا حلال ہے (۱) کیوں کہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اوپر مذکورہ مچھلی کے کھانے سے منع فرمایا ہے (۲)

دوسرے فقہاء کے یہاں اس باب میں بڑی وسعت ہے اور اختلاف اقوال بھی، امام شافعیؒ سے تین طرح کی رائیں منقول ہیں۔ تمام دریائی جانور حلال ہیں یا مچھلی کے علاوہ سب حرام ہیں، تیسرے یہ کہ خشکی کے جو جانور حلال ہیں اسی نوع کے دریائی جانور بھی حلال ہیں اور خشکی کے جو جانور حرام ہیں اس نوع کے دریائی جانور بھی حرام ہیں ——— پہلا قول فقہاء شوافع کے یہاں زیادہ صحیح ہے (۳) امام احمد کے یہاں مینڈک کے سوا تمام دریائی جانور حلال ہیں (۴) امام مالکؒ کے یہاں بھی تمام دریائی جانور مباح ہیں مگر دریائی سور مکروہ ہے (۵)

ان فقہاء کے پیشِ نظر وہ روایت ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سمندر کے پانی کو پاک اور اس کے مردار کو حلال قرار دیا ہے الطھور ماؤہ الحل میتتہ (۶) اس حدیث میں عموم ہے اور تمام سمندری جانوروں کو حلال

---

(۱) در علیٰ ہامش الرد ۵/۹۵-۱۹۴-

(۲) ابوداؤد عن جابر ۲/۵۳۴ باب فی اکل الطافی من السمک، ابن ماجہ عن جابر ۲/۲۳۴ باب الطافی فی صید البحر-

(۳) المجموع شرح مہذب ۹/۳۴-

(۴) المغنی ۹/۳۳۸-

(۵) المیزان الکبریٰ ۲/۶۶-

(۶) ابوداؤد عن ابی ہریرۃ ۱/۱۱ باب الوضوء بماء البحر-

قرار دیا گیا ہے، احناف کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ یہاں "میتۃ" سے تمام مردار مراد نہیں بلکہ صرف مچھلی مراد ہے اس لئے کہ قرآن نے سمندر اور خشکی کے جانوروں کے فرق کے بغیر تمام ہی مردار کو حرام قرار دیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے صرف ایک دریائی جانور مچھلی اور ایک خشکی کے جانور ٹڈی کو مستثنیٰ فرمایا ہے احلت لنا میتتان الحوت والجراد (۱) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیث میں یہاں "میتۃ" سے تمام جانور مراد نہیں ہے، صرف مچھلی کی حلت بیان کرنا مقصود ہے، خیال ہوتا ہے کہ احناف کی رائے زیادہ قوی اور شریعت کے مزاج و مذاق سے زیادہ قریب ہے کیوں کہ باوجود اس کے کہ عرب کا خطہ ساحل سمندر پر واقع ہے، خود پیغمبرِ اسلام اور آپؐ کے اصحابِ عالی مقام سے سوائے مچھلی کے کسی اور دریائی جانور کا کھانا ثابت نہیں —————— واللہ اعلم۔

خشکی کے جانور

جانوروں کی دوسری قسم وہ ہے جو خشکی کے جانور کہلاتے ہیں، یہ تین طرح کے ہیں، ایک وہ جن میں خون بالکل نہیں پایا جاتا جیسے ٹڈی، بھڑ، مکھی، مکڑا وغیرہ، ایسے حیوانات میں ٹڈی کے سوا سب کے حرام ہونے پر اتفاق ہے، دوسرے وہ جن میں خون ہے لیکن بہتا ہوا خون نہیں ہے جیسے سانپ چھپکلی اور تمام حشرات الارض ان کے حرام ہونے پر بھی اتفاق ہے سوائے گوہ (ضب) کے جو امام شافعی اور بعض فقہاء کے نزدیک حلال اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک حرام ہے (۲) تیسرے وہ جن میں بہتا ہوا خون موجود ہے، یہ بھی دو طرح کے ہیں، ایک پالتو جانور اور دوسرے

---

(۱) ابن ماجہ ص: ۲۳۲ باب صید الحیتان والجراد۔

(۲) المغنی ۹/۳۲۶۔ شرح مہذب ۹/۱۲۔ بدائع ۵/۳۶۔

جنگلی اور وحشی ——— پالتو جانوروں میں اونٹ ، گائے، بیل، بکری اور وحشی جانوروں میں ہرن، نیل گائے، جنگلی اونٹ اور جنگلی گدھے کا کھانا بالاتفاق جائز ہے۔ اسی طرح پالتو جانوروں میں کتا اور بلی بالاتفاق حرام ہیں۔ نیز وحشی جانوروں میں درندے جانور، شیر، بھیڑیا، چیتا، جنگلی بلی، بندر وغیرہ بالاتفاق حرام ہیں (۱) البتہ گیدڑ اور لومڑی شوافع اور حنابلہ کے یہاں جائز اور احناف و مالکیہ کے یہاں حرام ہیں (۲)

منجملہ ان جانوروں کے جن کی حلت اور حرمت میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے گھوڑا ہے جو امام ابوحنیفہ اور امام مالک کے نزدیک مکروہ اور امام شافعی و صاحبین کے یہاں حلال ہے (۳) پالتو گدھے اور خچر کا کھانا بالاتفاق حرام ہے (۴) اور خرگوش کا کھانا حلال ہے (۵)

اصل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے درندہ جانوروں کو کھانے سے منع فرمایا اور اس کی علامت یہ بتائی کہ وہ سامنے کے دانتوں سے کھاتا اور شکار کرتا ہو، کل ذی ناب من السباع فاکلہ حرام (۶) چنانچہ ایسے تمام جانور جن کی یہ کیفیت ہو، درندہ ہونے کی وجہ سے اصولی طور پر تمام فقہاء کے نزدیک حرام ہیں۔ ولا یحل ما یتقوی بنابہ ویعدو علی الناس وعلی البہائم (۷)

امام مالک کے بارے میں گو مختلف روایتیں منقول ہیں مگر صحیح یہی ہے

---

(۱) ملخص از: بدائع الصنائع ۵/۳۶۔ الفتاویٰ الہندیہ ۵/۲۸۹

(۲) مہذب مع الشرح ۹/۹۔ (۳) بدایۃ المجتہد ۱/۴۶۹، بدائع ۵/۳۸۔

(۴) شرح مہذب ۹/۸، ۶۔

(۵) حوالہ سابق۔

(۶) مسلم عن ابی ہریرہ ۲/۱۴۷ باب تحریم اکل کل ذی ناب من السباع۔

(۷) شرح مہذب ۹/۱۲، نیز دیکھئے المغنی ۹/۳۲۵۔

کہ وہ بھی اس کو حرام قرار دیتے تھے، چنانچہ امام صاحب نے اپنی "موطا" میں حضرت ابو ثعلبہ خشنی اور حضرت ابو ہریرہ کی وہ روایت نقل کی ہے جو درندہ جانوروں کی حرمت کے بارے میں ہے پھر لکھا ہے کہ یہی ہماری رائے ہے وھو الامر عندنا (۱)

پرندوں کے سلسلہ میں حدیث میں بنیادی اصول یہ بتایا گیا ہے کہ پرندوں میں بھی درندے حرام ہوں گے۔ اور درندوں سے مراد وہ پرندے ہیں جو پنجوں سے اپنا شکار کرتے ہوں۔ حضرت عبداللہ بن عباس سے مروی ہے نھی النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن کل ذی ناب من السبع وعن کل ذی مخلب من الطیر (۲) اسی لئے فقہاء پنجے سے شکار کرنے والے اور دوسرے پرندوں پر حملہ آور ہونے والے پرندوں کو حرام قرار دیتے ہیں (۳) فقہاء شوافع نے اس سلسلہ میں کچھ زیادہ منضبط اصول مقرر کئے ہیں اور وہ یہ کہ تین طرح کے پرندوں کا کھانا حرام ہے۔ اول وہ جو خود درندہ ہو جیسے باز، شاہین، عقاب وغیرہ، دوسرے وہ کہ جن کو شریعت نے مارنے سے منع کیا ہے جیسے کہ مکھی، ہُدہُد وغیرہ۔ تیسرے وہ جن کو مارنے کا حکم دیا ہے جیسے چیل (۴)

پرندوں میں کوّے کی بعض قسموں کے سلسلہ میں اختلاف ہے، کوئی بالاتفاق حرام ہے۔ اسی طرح نجاست خور کوّا۔ لیکن وہ کوا جو دانے اور کھیتوں سے کھاتا ہے اکثر فقہاء کے نزدیک جائز ہے (۵) بلکہ ملک العلماء علامہ کاسانی نے تو اس کے حلال ہونے پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے والغراب الذی یاکل

---

(۱) موطا لمالک ص: ۱۸۴، باب تحریم اکل ذی ناب من السباع۔

(۲) مسلم عن ابن عباس ۲/۱۴۷، باب تحریم اکل کل ذی ناب من السباع۔

(۳) بدائع الصنائع ۵/۳۹۔

(۴) شرح مہذب ۹/۲۲۔

(۵) المغنی ۹/۳۲۳، شرح مہذب ۹/۲۳۔

الحب والزرع والعقعق ونحوها حلال بالاجماع (۱) اس سے مراد وہ کوا ہے جس کو "زاغ" کہا جاتا ہے۔ (۲) ــــــــــ ان کے علاوہ عام پرندے مرغی، بط، فاختہ، کبوتر، گوریئے وغیرہ بالاتفاق حلال ہیں۔

نجاست خور حلال جانور

البتہ حلال جانور بھی نجاست خور ہو جائیں جن کو عربی میں "جلالۃ" کہا جاتا ہے تو اس کے کھانے میں کراہت ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے جانور کا گوشت کھانے اور اس کا دودھ پینے سے منع فرمایا (۳) بلکہ ایک روایت میں اس پر سوار ہونے سے بھی منع فرمایا ہے (۴) اسی روایت کو سامنے رکھ کر فقہاء نے احکام مقرر کئے ہیں اور وہ یہ کہ اگر کثرت نجاست خوری کی وجہ سے کسی بھی جانور گائے، اونٹ، مرغی کے اندر بدبو پیدا ہو جائے اور اس کے گوشت سے بو آنے لگے تو اس کو ایک مخصوص وقفہ کے بغیر ذبح کرنا جس میں یہ بو جاتی رہے مکروہ ہے (۵) کتنے دنوں روک رکھنے میں اس کے گوشت کی کراہت ختم ہوگی۔ اس سلسلہ میں بعض فقہاء نے اندازہ قائم کیا ہے اور دنوں کی تعیین کی ہے، لیکن صحیح یہی ہے کہ اس کے لئے کوئی مدت مقرر نہیں کی جا سکتی بلکہ جتنے دنوں میں بو کے ازالہ کا غالب گمان ہو جائے کراہت ختم ہو جائے گی

وکان ابوحنیفۃ لا یوقت فی حبسھا وقال تحبس حتی تطیب وھو قولھما

---

(۱) بدائع ۳۹/۵۔

(۲) شامی ۵/۲۰۰۔

(۳) ترمذی عن ابن عمر ۲/۴۔

(۴) نسائی عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ۔ ۲/۲۰۹۔

(۵) شرح مہذب ۹/۲۸، ردالمحتار ۵/۲۳۳۔

ایضاً (بدائع الصنائع ۵/۴۰)

ذبح کی بنیادی شرط

حلال جانوروں کو بھی شریعت اس وقت کھانے کی اجازت دیتی ہے جب کہ اس کو شرعی طور پر ذبح بھی کر لیا گیا ہو، اسلام کے اس حکم کا رشتہ ایک طرف صحتِ انسانی اور دوسری طرف اصلاح عقیدہ دونوں سے ہے۔ جانور کو صحیح طور پر ذبح نہ کیا جائے کہ اس کے جسم کا بہتا ہوا خون پوری طرح خارج نہ ہو جائے اور جسم کے اندر ہی منجمد ہو جائے تو اس میں ایک طرح کی سمّیت پیدا ہو جاتی ہے اور یہ صحت کے لئے سخت مضر ہو جاتا ہے۔ دوسرے اقوام عالم اپنے اپنے عقیدہ وتصور کے مطابق جانوروں کی قربانی اور دیویوں دیوتاؤں پر چڑھاوے دیتے رہے ہیں دنیا کا شاید کوئی مذہب ہو جہاں کسی نہ کسی طور اپنے مذہبی تصورات کے ساتھ جانوروں کے بھینٹ چڑھانے کا عمل نہ پایا جاتا ہو۔ اسلام کہ سراپا توحید کا داعی ہے اس نے ہر اس عمل کو جو شرک کا مظہر تھا، توحید کے سانچہ میں ڈھالا ہے، اس نے نماز جیسی روزانہ پانچ وقت پڑھی جانے والی عبادت رکھی مگر اس کے لئے نہ سورج کو قبلہ بنایا نہ دوسرے مذہب کی طرح کسی خاص سمت کو، بلکہ علامتی طور پر خود کعبۃ اللہ کو قبلہ بنایا گیا جس کی بنا ہی توحید کے لئے ہوئی تھی۔ اسلام کے پہلے بعض قومیں پانسوں اور فال کے ذریعہ قسمت کا حال معلوم کرتی تھیں، شریعت نے اس کے لئے استخارہ کی نماز رکھی، بارش کے لئے مشرکانہ اعمال و رسوم کئے جاتے تھے، اس کی جگہ صلوٰۃ استسقاء مقرر ہوئی، ٹھیک اسی طرح قربانی باقی رکھی گئی۔ نذر و نیاز کا دروازہ بند نہیں کیا گیا اور جانوروں کے ذبح کئے جانے کی ایک فطری ضرورت سے پہلو تہی نہیں برتی گئی مگر اس طور کہ اسی مشرکانہ عمل کو عین توحید و ایمان کا اظہار بنا دیا

عـ ۹
بلال د
نزام

گیا کہ جانور خدا ہی کے نام سے ذبح کئے جائیں گے اور اس کے سوا کسی اور کا نام لینا تک اسے حرام کر دے گا اور نام بھی ان قوموں کا لینا معتبر ہو گا جو خدا کے وجود کا تسلیم و اقرار کرتے ہوں اور فی الجملہ اس کی توحید کے قائل و معترف ہوں۔

اسی لئے ذبح کے احکام کو شریعت نے خاص تفصیل و وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے اور ان کے بنیادی نکات یہ ہیں:

۱۔ ذبح کی حقیقت اور ذبح کے لئے استعمال کئے جانے والے آلات۔

۲۔ ذبح کرنے والوں میں مطلوبہ اوصاف۔

۳۔ خود ذبیحہ جانور ذبح کے وقت کس حال میں ہو؟

۴۔ ذبح کے وقت کس طرح اللہ کا ذکر کیا جائے؟

۵۔ ذبح کے مستحبات و مکروہات۔

قابو یافتہ جانور کا ذبح

فقہاء نے ذبح کے دو طریقے رکھے ہیں۔ اختیاری اور اضطراری، اضطراری سے مراد شکار کو حلال کرنے کے ہیں اور ان کا ذکر آگے آتا ہے، ذبح اختیاری ان جانوروں کے لئے ہے جو قابو اور اختیار میں ہوں، ان کے لئے دو طریقے منقول ہیں، ذبح اور نحر ——— ذبح کا تعلق حلق سے اور نحر کا تعلق سینہ سے ہے، حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: الا ان الذکاۃ فی الحلق واللبۃ (۱) زیلعی نے اس سلسلہ میں بعض صحابہ کے آثار بھی نقل کئے ہیں (۲) اونٹ میں نحر بہتر ہے اور اونٹ کے علاوہ دوسرے جانوروں میں ذبح۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ

---

(۱) دار قطنی ص ۵۴۴۔ وفیہ سعید بن سلام ضعیف جداً۔

(۲) دیکھئے نصب الرایہ ۲/۲۶۲۔

نے پیغمبرِ اسلامؐ کو نحر کا حکم دیا" فصل لربك وانحر" (کوثر ــ ۲) اور آپ کی بعثت ایک ایسی قوم میں ہوئی جو اونٹ کی پرورش کے لیے مشہور تھی اور بنی اسرائیل کو ذبح کا حکم دیا گیا کیوں کہ وہ گائے بیل وغیرہ سے غذائی ضرورت پوری کیا کرتے تھے" ان الله یأمرکم ان تذبحوا بقرة" (۱) اس پر بھی اتفاق ہے کہ اگر گائے وغیرہ کا نحر کر دیا اور اونٹ کو ذبح کر دیا تب بھی ذبیحہ جائز ہوگا (۲) البتہ امام مالک کے نزدیک کسی مجبوری کے بغیر ایسا کرنا مکروہ تنزیہی ہے (۳)

ذبح میں کن رگوں کا کاٹنا ضروری ہے، اس سلسلہ میں حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ جانوروں کی" اوداج کاٹ دی جائیں" ما فری الاوداج (۴) اور احناف کے یہاں اوداج سے مراد غذا کی نالی (مری) سانس کی نلی (حلقوم) اور خون کی دونوں شہ رگ (ودجین) ہیں۔ بہتر تو یہ ہے کہ یہ چاروں نالیاں کٹ جائیں (۵) کہ اس طرح جان بھی بسہولت نکل سکے گی اور خون بھی پوری طرح بہہ جائے گا۔ تاہم ان چار میں سے کوئی تین رگیں بھی کٹ جائیں تو کافی ہے (۶) امام شافعیؒ کے نزدیک غذا اور سانس کی نالی کا کٹ جانا ذبح شرعی کے لئے کافی ہے اور خون کی دونوں شہ رگ کا کاٹنا بہتر ہے (۷) یہی رائے حنابلہ کی ہے (۸) حقیقت یہ ہے کہ احناف ہی کی رائے اس باب میں زیادہ قرینِ عقل بھی ہے اور نص سے قریب بھی۔ بہتر طریقہ یہ ہے کہ گائے بکری وغیرہ کو لٹا کر ذبح کیا جائے اور

---

(۱) المغنی ۳۱۷/۹۔

(۲) المجموع شرح مہذب ۹۰/۹۔ (۳) حوالہ سابق۔

(۴) الدرایہ علی الہدایہ ۴/۲۱۴ کتاب الذبائح

(۵) بدائع ۴۱/۵۔ (۶) حوالہ سابق۔

(۷) شرح مہذب ۹۰/۹۔

(۸) الفقہ علی المذاہب الاربعہ ۷۲۵/۱۔

اونٹ کو کھڑا کر کے۔ اس طرح کہ اس کا بایاں ہاتھ بندھا ہوا ہو (۱) حضرت ابن عمرؓ نے ایک شخص کو دیکھا کہ اونٹ کو لٹا کر ذبح کر رہا ہے تو فرمایا کہ کھڑا کر کے ذبح کرو کہ یہ حضورؐ کی سنت ہے اور مینڈھے کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لٹا کر ذبح فرمایا ہے (۲)

آلات ذبح

آلاتِ ذبح دو طرح کے ہوسکتے ہیں، آلۂ قاطعہ اور آلۂ فاسخہ۔

آلۂ فاسخہ سے مراد ایسا ہتھیار ہے جو اپنی چوٹ اور دباؤ کے ذریعہ جسم کو پھاڑ دے، جیسے ہاتھ سے لگا ہوا ناخن اور منھ سے لگے ہوئے دانت، ان کے ذریعہ گو جانور کی مطلوبہ نالیاں کٹ جائیں پھر بھی ان کا کھانا جائز نہیں، وہ مردار کے حکم میں ہیں، آلاتِ قاطعہ سے وہ آلات مراد ہیں جن میں کاٹنے کی صلاحیت ہو اگر یہ لوہے کی ہوں تب تو ان سے جانور کا ذبح کرنا جائز ہے ہی اور اگر کوئی اور چیز ہو تو اس کا تیز اور دھار دار ہونا ضروری ہے جیسے لکڑی، بانس، نوکدار پتھر وغیرہ بقول امام نووی کے "حصول بکل محدد" (۳) البتہ ناخن، ہڈیوں اور دانتوں سے ذبح کے جائز ہونے اور نہ ہونے میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے، امام ابو حنیفہ کے یہاں اگر یہ جسم سے علٰحدہ ہوں اور رگیں کاٹ سکتے ہوں تو جائز ہے امام مالک کے ہاں ہڈی سے جائز ہے ناخن اور دانتوں سے نہیں، اور امام شافعی اور احمدؒ کے نزدیک ان تینوں سے ذبح کا عمل کافی نہیں، کیوں کہ حضورؐ نے اس سے منع فرمایا ہے اور اس کو حبشیوں کا طریقہ قرار دیا ہے، تاہم اس پر سبھوں کا

---

(۱) شرح مہذب ۹/۹۲۔

(۲) شرح مہذب ۹/۸۳۔

(۳) بدائع ۵/۴۲، شرح مہذب ۹/۸۲۔

اتفاق ہے کہ تیز دھار دار چھری سے ذبح کرنا بہتر ہے، حضورؐ نے فرمایا ولیحد احدکم شفرتہ ولیرح ذبیحتہ (۱) کہ اس سے خون بہتر طور نکل سکتا ہے، جان جلدی نکلتی ہے اور جانور کو بھی اذیت کم ہوتی ہے۔

ذابح کے اوصاف

ذبح کرنے والے کو عاقل ہونا چاہیئے، پاگل، مبتلائے نشہ اور ایسا بچہ جس میں عقل وتمیز نہ پیدا ہوئی ہو ان کا ذبیحہ حلال نہیں ہوگا، اس لئے کہ ذبح کرنے والے کو ایسا ہونا چاہیئے جو ذبح کا مفہوم سمجھتا ہو، اس پر قادر ہو اور بالارادہ بسم اللہ کہتا ہو (۲) ایسا بچہ جو بسم اللہ اور ذبح کے مفہوم کو سمجھتا ہو اس کا ذبیحہ حلال ہوگا، یہی حکم کم عقل (معتوہ) آدمی کا بھی ہے، ذبح کے معاملہ میں مرد اور عورت دونوں برابر ہیں، گونگا جو قوتِ گویائی سے محرومی کی بنا پر بسم اللہ کہنے سے معذور ہو اس کا ذبیحہ بھی حلال ہوگا (۳) یہی رائے امام مالک اور امام احمد کی بھی ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک مجنون اور نشہ میں مدہوش کا ذبیحہ بھی حلال ہوتا ہے (۴)

ذبح کرنے والے کے لئے ضروری ہے کہ وہ مسلمان یا اہلِ کتاب میں سے ہوں، ارشاد خداوندی ہے وطعام الذین اوتوا الکتاب حل لکم (آلِ عمران ۹۲) ظاہر ہے کہ یہاں طعام سے ذبیحہ مراد ہے اس لئے کہ دوسرے احکام میں تمام اہلِ کتاب یکساں ہیں (۵) لہذا مشرک، مجوسی، مرتد خواہ اس نے کوئی بھی مذہب

---

(۱) المغنی ۹/۳۱۷۔

(۲) بدائع الصنائع ۵/۴۴۔

(۳) درمختار ورد المحتار ۵/۸۹۔۸۸۔

(۴) شرح مہذب ۹/۷۷۔

(۵) بدائع ۵/۱۴۵۔

قبول کیا ہو، ان سب کا ذبیحہ حرام ہوگا، فقہاء نے جنوں کے ذبیحہ کو بھی حرام قرار دیا ہے (۱) اور مسلمانوں کے ایسے فرقے جن پر بعض لوگوں نے کفر کا فتویٰ لگایا ہے جیسے معتزلہ، روافض، گو بعض علماء نے ان کے ذبیحہ کو بھی مرتدین کے ذبیحہ کے حکم میں لکھا ہے اور حرام قرار دیا ہے لیکن محقق علماء علامہ ابن ہمام وغیرہ کی رائے یہی ہے کہ ان کا ذبیحہ بھی حلال ہوگا کہ ان کا درجہ کم از کم اہلِ کتاب سے کم نہیں، یہی رائے علامہ شامی کی ہے (۲) البتہ قادیانی چوں کہ مرتد اور زندیق کے حکم میں ہیں اور ان کا کفر شک و احتمال سے ماوراء ہے اس لئے ان کا ذبیحہ حرام اور مردار کے حکم میں ہوگا (۳) اس پر بھی اتفاق ہے کہ جو لوگ دائرۂ اسلام میں ہو گو وہ فاسق ہوں، زانی اور نشہ خوار ہوں، چور اور ڈاکو ہوں، بہر حال ان کا ذبیحہ حلال ہوگا (۴)

اہلِ کتاب سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں، قرآن کی تصدیق کے بغیر اقوامِ عالم میں سے کسی کے بارے میں ہمارے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ آیا وہ کسی کتابِ آسمانی کے حامل ہیں اور ان کے پاس موجود صحیفہ الہامی ہے جو محرف شکل میں ان کے پاس موجود ہے، ایک ایسا مسئلہ جس سے نکاح و غذا اور عصمت و ذبیحہ کی حلت متعلق ہو، محض ظن و تخمین و قیاس اور گمان کے تحت فیصلہ کیا جانا کسی طور قرینِ انصاف نظر نہیں آتا، اس لئے بعض اہلِ علم نے ہندوؤں اور بدھسٹوں وغیرہ کو جو اہلِ کتاب کے زمرہ میں لانے کی کوشش کی ہے وہ اس گنہ گار کے خیال میں صحیح نہیں ہے۔

---

(۱) درعلی ہامش ۱۸۹/۵۔

(۲) دیکھئے رد المحتار علی الدر المختار ۱۸۹/۵۔

(۳) تفصیل کیلئے دیکھئے "قاموس الفقہ ج ۱، مادہ اہلِ کتاب۔

(۴) المغنی ۳۱۱/۹۔

ذبیحہ میں حیات کی شرط

جس جانور کو ذبح کیا جارہا ہو اس کے لئے ضروری ہے کہ موت کے وقت اس میں حیات موجود ہو۔ مختلف فقہاء نے اپنے تجربات کی بناپر موت و حیات کی علامتیں مقرر کی ہیں، حرکت کرنا، خون کا نکلنا (۱) شدید حرکت اور شدت کے ساتھ خون کا بہاؤ (۲) وغیرہ۔ علامہ حصکفی نے ان علامات کا زیادہ احاطہ کیا ہے مثلاً منہ کا بند ہونا زندگی کی علامت ہے، آنکھ کا بالکل کھلا ہوا ہونا موت کی علامت ہے، پاؤں کا سمٹنا زندگی کی علامت ہے، بال کا کھڑا ہونا زندگی اور گرجانا موت کی پہچان ہے (۳)

لیکن مختلف فقہاء کی عبارتوں سے جو بات منقح ہوتی ہے وہ یہی ہے کہ حیات دو قسم کی ہے۔ ایک حیات مستقرہ جو کسی زندہ حیوان میں ہوتی ہے اور ایک وہ خاص حیات جو دماغ اور قلب کی موت کے بعد جدید تحقیق کے مطابق اعضاء میں باقی رہتی ہے اور اس کی وجہ سے مضطربانہ حرکت کا صدور ہوتا ہے جس کو عرف میں "حرکت مذبوحی" کہا جاتا ہے، تو جانور اس وقت حلال ہوگا جب کہ اس میں حیات مستقرہ کی رمق باقی رہ گئی ہو اور ذبح کردیا جائے اور اس حیات کا اندازہ علامات، تجربات، قرائن اور جدید دور میں طبی اور سائنسی آلات کے ذریعہ لگایا جاتا ہے، اسی لئے فقہاء نے مسئلہ کی بنیاد کسی خاص علامت پر نہیں رکھی بلکہ ذبیحہ کی موت و حیات کے بارے میں علم و واقفیت پر رکھی ہے ذبح شاۃ مریضۃ فتحرکت اوخرج الدم

---

(۱) بدائع ۵/۵۲۔ (۲) شرح مہذب ۹/۸۹۔

(۳) درمختار علی الرد ۵/۱۹۶۔

حلت والّا لا، ان لم تدر حیاته عند الذبح وان علم حیاته حلت مطلقاً (۱)

ذبیحہ پر بسم اللہ

جانور کو ذبح کرتے وقت ضروری ہے کہ اس پر بسم اللہ کہا جائے، ارشادِ خداوندی ہے: لا تاکلوا مما لم یذکر اسم اللہ علیہ (الانعام: ۱۲۱) اس لئے جانور کو ذبح کرتے وقت بسم اللہ کہنا واجب ہے، متعدد حدیثیں بھی اس سلسلہ میں منقول ہیں، البتہ اگر بسم اللہ کہنا بھول جائے تو شریعت اسے معذور قرار دیتی ہے اور شریعت اس کے ذبیحہ کو جائز رکھتی ہے، خود قرآن مجید میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے، اس لئے کہ بسم اللہ کے ترک کو قرآن فسق قرار دیتا ہے اور ظاہر ہے کہ فسق اسی عمل میں ہوتا ہے جس میں کسب و ارادہ کو دخل ہو، بھول کی وجہ سے کوئی کام چھوٹ جائے تو ایسے شخص کو فاسق نہیں کہا جا سکتا، اس لئے جان بوجھ کر بسم اللہ چھوڑ دیا جائے تو ذبیحہ مردار کے حکم میں ہوگا لیکن بھول کر بسم اللہ نہ کہا تو ذبیحہ جائز ہوگا، یہی رائے امام ابو حنیفہ اور امام احمد کی ہے(۲) مالکیہ کے نزدیک بھول کر بسم اللہ نہ کہہ سکا تب بھی ذبح درست نہ ہوگا اور ذبیحہ مردار قرار پائے گا، شوافع کا خیال ہے کہ بسم اللہ کہنا سنت ہے، جان بوجھ کر بسم اللہ نہ کہے پھر بھی ذبیحہ حلال ہوگا کہ اصل مقصود صرف یہ ہے کہ ذبیحہ پر غیر اللہ کا نام نہ لیا جائے تاہم آیات و روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رائے وہی صحیح ہے جو فقہاء احناف کی ہے۔

بسم اللہ کہنے کا یہ حکم مسلمان اور اہل کتاب دونوں کے لئے برابر ہے یعنی یہودی اور عیسائی کا ذبیحہ بھی اسی وقت حلال ہوگا جب کہ وہ ذبیحہ پر اللہ کا نام لے

---

(۱) درّ علی ہامش الرد ۱۹۶/۵۔

(۲) بدائع ۴۷/۵، المغنی ۳۲۰/۹۔

لا تحل الذبيحة من تعمد ترك التسمية مسلماً كان اوكتابياً (۱) مسلمان کی طرح اگر کتابی بھی اپنے عقیدہ کے مطابق جانور پر غیر اللہ مثلاً حضرت مسیح وغیرہ کا نام لے لے تو ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے کہ اس کا کھانا حرام ہوگا (۲)

بسم اللہ کہنے کا طریقہ

جانور پر بسم اللہ کہنے کا جو معروف طریقہ سلف کے یہاں رہا ہے وہ یہی ہے کہ "بسم الله والله اکبر" کہا جائے (۳) تاہم اس کے لئے کوئی خاص کلمہ مقرر نہیں ہے، حدیثوں میں جو بات کہی گئی ہے وہ یہی کہ اللہ کا نام لیا جانا چاہیئے اور بس۔ اس کی کوئی تفصیل بیان نہیں کی گئی اور نہ کسی خاص لفظ کی تحدید۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کا اسم ذاتی یا اسم صفاتی رحمٰن، رحیم وغیرہ تنہا لے لیا جائے یا تسبیح، تحمید کا کلمہ پڑھ لیا جائے، لا الٰہ الا اللہ کہا جائے، خدا کا نام عربی زبان میں لیا جائے یا کسی اور زبان میں، تمام صورتیں جائز اور درست ہیں (۴)

ہاں یہ ضروری ہے کہ خود ذبح کرنے والا اللہ کا نام لے، اگر اس کی طرف سے کوئی دوسرا بسم اللہ کہدے یا دو آدمی ذبح کرے، ایک کہے اور دوسرا چھوڑ دے تو یہ کافی نہیں۔ ایسے ذبیحہ کا کھانا حرام ہوگا (۵)

یہ بھی ضروری ہے کہ خاص فعل ذبح کو انجام دینے ہی کی نیت سے اللہ کا نام لے، اگر بطور شکر کے "الحمد للہ" کہدے، چھینک کا جواب دے یا یوں

---

(۱) شامی ۵/۱۹۰۔

(۲) المغنی ۹/۳۲۱۔

(۳) ابوداؤد ۲/۳۸۸، باب فی الشاۃ یضحی بہا جماعۃ۔

(۴) بدائع ۵/۴۸۔

(۵) شامی ۵/۱۹۲۔

ہی تسبیح وغیرہ کے کلمات پڑھے، ذبیحہ پر اللہ کا نام لینا مقصود نہ ہو تو یہ ذبیحہ حلال نہ ہوگا (۱)

یہ بات بھی ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ غیر اللہ کا نام نہ لیا جائے، یہاں تک کہ اگر ذبح کے وقت اللہ کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لے لے تب بھی ذبیحہ حرام ہو جائے گا، خود آپ کا ارشاد ہے کہ دو مواقع پر میرا ذکر نہ کیا جائے۔ چھینک کے وقت اور ذبح کے وقت۔ اور حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ ذبح کے وقت تنہا اللہ کا نام لو۔ جوزوا التسمیۃ عند الذبح (۲)

امام شافعیؒ کے یہاں آپؐ پر درود پڑھنے کی اجازت ہے لیکن عام فقہاء اس کو بھی منع کرتے ہیں (۳)۔ ———— جیسا کہ اس سے پہلے عرض کیا گیا ہے۔ ذبحِ حیوانات میں شریعت نے توحید کے اظہار کی خاص رعایت رکھی ہے اس لئے واقعہ ہے کہ اس موقعہ سے تسمیہ میں رسول کے نام کو شریک کرنا شرک ہی ہے۔ صلوٰۃ وسلام بھی مناسب نہیں۔ عبادت، دعا اور اظہار عقیدہ کے مواقع پر شریعت میں ہمیشہ تنہا خدا کے ذکر پر اکتفا کیا گیا ہے۔ تکبیر تحریمہ صرف اللہ کے ذکر سے ہوتا ہے۔ حج کا تلبیہ بھی محض ذکر خداوندی سے عبارت ہے، اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے، کھاتے پیتے، آتے جاتے اور عبادتوں کی ابتداء و انتہاء ہر موقع و محل کے لئے حضورؐ سے کوئی نہ کوئی ذکر منقول ہے لیکن ان تمام اذکار میں خدا کی عظمت و بلندی اور امتنان کے سوا اور کسی بات کا ذکر نہیں، نہ وہاں انبیاء و رسل کے ذکر اور صلوٰۃ وسلام کے لئے کوئی جگہ رکھی گئی ہے، اس لئے صحیح وہی ہے جو عام فقہاء کا مسلک ہے۔

---

(۱) بدائع ۴۸/۵۔

(۲) حوالہ سابق۔ (۳) الذبائح فی الشریعۃ الاسلامیہ، از ڈاکٹر عبداللہ عبدالرحیم العبادی ص: ۲۹۔ المیزان الکبریٰ للشعرانی، کتاب الاضاحی۔

یہ بھی ضروری ہے کہ ذبح کرتے ہوئے اللہ کا ذکر کرے یا ذکر کے فوراً بعد جانور کو ذبح کرے، اگر اللہ کا نام لینے کے بعد معمولی فصل ہو تو کوئی حرج نہیں لیکن زیادہ فصل ہو جائے، کسی دوسرے کام میں لگ جائے، مجلس بدل جائے پھر جانور ذبح کرے تو اس کا کھانا حلال نہ ہوگا (۱) رہ گئی یہ بات کہ بسم اللہ اور ذبح کے درمیان کتنے وقفہ کو وقفہ طویل سمجھا جائے؟ تو یہ ناظرین کی سوچ پر موقوف ہے، جس کو وہ طویل سمجھے وہ طویل ہے وحد الطول مایتکثرہ الناظر۔(۲)

یہ بات بھی واضح رہے کہ ذبح اختیاری میں بسم اللہ کا تعلق فعلِ ذبح سے ہے، اگر ایک ہی دفعہ میں دو جانور کو ذبح کر دیا تو ایک ہی بسم اللہ دونوں کے لئے کافی ہے اور اگر یکے بعد دیگرے جانور کو ذبح کیا تو ہر ایک کے لئے الگ الگ بسم اللہ کہا جانا ضروری ہے (۳)

مشینی ذبیحہ

فقہاء کے اسی نکتہ سے مشینی ذبیحہ کا مسئلہ واضح ہو جاتا ہے، راقم سطور نے مشینی ذبیحہ سے متعلق امریکہ کے ایک سوالنامہ کا جواب لکھا تھا، ذیل میں وہی سوال و جواب درج کیا جاتا ہے:

سوالنامہ

کیا فرماتے ہیں علماء دین مسئلہ ذیل میں کہ:

کناڈا میں کچھ مسلمانوں نے مرغیوں کے مشینی ذبیحہ کے لئے ایک خاص

(۱) المغنی ۹/۱۰، بدائع ۵/۴۸۔
(۲) درمختار ۵/۱۹۲۔
(۳) حوالۂ سابق۔

نظم کیا ہے، اس کی نوعیت یہ ہے کہ بٹن دبانے کے ساتھ ہی آلۂ ضرب جو دھاردار چھرے کی شکل میں ہوتا ہے حرکت کرنے لگتا ہے۔ مشینوں کے ذریعہ مرغیوں کو اس طرح پکڑا جاتا ہے کہ اس کے پاؤں بندھ جاتے ہیں اور نیچے کی جانب سے اس کی گردن عین اس آلہ کی دھار پر آجاتی ہے اور جانور ذبح ہوجاتا ہے ——— واضح ہو کہ ایک دفعہ بٹن آن (on) کرنے کے بعد پھر دوبارہ جب تک بٹن آف (off) نہ کیا جائے، مشین اپنا کام کرتی رہتی ہے۔ اور مرغیاں ذبح ہوتی رہتی ہیں، ٹھیک اسی طرح جس طرح برقی پنکھا ایک دفعہ چلائے جانے کے بعد از خود چلتا ہے تاآنکہ پنکھا بند کردیا جائے۔

ہاں اس موقعہ سے ذبح سے پہلے مرغیوں کو معمولی صدمات بھی پہنچائے جاتے ہیں، البتہ اس کے باوجود مرغی کو کامل ہوش وحواس باقی رہتا ہے۔ عام طور پر سَر کا حصہ جسم سے بالکل منقطع نہیں ہوتا، ہاں ایسا ضرور ہوتا ہے کہ بعض مرغیاں اس طرح چھرے کے سامنے آتی ہیں کہ بجائے گردن کے ان کی چونچ کٹ جاتی ہے اور وہ مرغیوں کے ساتھ نیچے دب کر مرجاتی ہے۔

یہ بات بھی طے کی گئی ہے کہ ایسی مرغیوں کو جن پر ذبح کا عمل مکمل نہ ہوسکا ہو ان کو الگ کردیا جائے اور مذبح کا یہودی مالک جو ان مرغیوں کا بھی مالک ہوگا اسے غیر مسلموں سے فروخت کردے ——— بٹن دبانیوالا مسلمان ہوگا اور بسم اللہ کہہ کر بٹن دبائے گا۔

پس کیا مشینی ذبیحہ کی یہ صورت امریکہ جیسے ملک میں جہاں کچھ رواجی اور کچھ قانونی محرکات کی وجہ سے مشینی ذبیحہ ہی عام ہے اور اسی کا گوشت کھایا جاتا ہے، درست ہوگا اور ذبیحہ کے سلسلہ میں وارد احکامِ شرعیہ کی اس کے ذریعہ تکمیل ہوسکے گی یا نہیں؟ ——— فقط۔

الجواب وباللہ التوفیق:

ذبیحہ کے سلسلے میں شریعت نے چند بنیادی ہدایات دی ہیں اور وہ کسی بھی ذبیحہ کی حلت وحرمت کے لئے مدار اور اساس کی حیثیت رکھتا ہے۔

اول یہ کہ ذبح کرنے والا مسلمان یا کتابی ہو ——— کتابی سے مراد وہ شخص ہے جو خدا، نبوت اور وحی وغیرہ پر ایمان رکھتا ہو۔ چنانچہ خود ارشادِ خداوندی ہے وطعام الذین اوتوا الکتاب حل لکم۔

دوسرے یہ کہ وہ جانور ذبح کرتے وقت بسم اللہ کہے اور بسم اللہ کا مفہوم بھی سمجھتا ہو، چنانچہ قرآن مجید نے کہا ولا تأکلوا مما لم یذکر اسم اللہ علیہ۔ بسم اللہ کا مفہوم سمجھنا کیوں ضروری ہے؟ یہ ظاہر ہے، کیوں کہ جو شخص اس کا مفہوم ہی نہ سمجھتا ہو اس کے بسم اللہ کہنے کے کوئی معنی نہ ہوں گے۔ مشہور فقیہ صاحبِ ہدایہ کہتے ہیں ویحل اذا کان یعقل التسمیۃ (ہدایہ ۴/۴۱۸، کتاب الذبائح)

تیسرے بعض روایات کی روشنی میں فقہاء نے ان رگوں اور نالیوں کی تعیین کی ہے جن کا ذبح کے دوران کٹنا ضروری ہے۔ یہ کل چار ہیں (۱) مرئ یعنی سانس کی نالی (۲) حلقوم یعنی غذا کی نالی (۳-۴) ودجین یعنی دونوں شہ رگ جن کا ذریعہ اچھی طرح خون کا اخراج ہو سکتا ہے۔ ان چاروں رگوں اور نالیوں کو کاٹا جانا چاہیئے۔ فقہاء اسلام میں امام مالکؒ کے نزدیک چاروں ہی کو کاٹا جانا ضروری ہے، امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک تین رگیں بھی کاٹ دی جائیں تو کافی ہے (ہدایہ ۴/۴۲۱)

چوتھے مختلف جانوروں کے ذبح کرنے کے لئے الگ الگ چھرے اور آلۂ ذبح کا استعمال ضروری نہیں، اس کا اندازہ حصکفی کی اس عبارت سے ہوتا ہے حتی لو اضجع شاتین احداھما فوق الاخریٰ فذبحھما ذبحۃ واحدۃ بتسمیۃ

واحدۃ حلا۔ (درمختار ۵/۱۹۲)

پانچویں ذبح کے لئے جو آلہ استعمال کیا جائے وہ کاٹنے اور قطع کرنیوالا ہو، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص طور پر اس کو تیز کرنے کا بھی حکم فرمایا ہے ولیحد احدکم شفرتہ۔ (مسلم عن شداد بن اوس)

ایسے آلات جس میں اس بات کا اندیشہ ہو کہ جانور کی موت کٹنے کی وجہ سے نہیں بلکہ اس آلہ کے وزنی ہونے اور اس کی وجہ سے گلا دب جانے کی وجہ سے ہوئی ہے تو ذبیحہ حلال نہیں ہوگا۔

مذکورہ صورت میں اوپر ذکر کی گئی تفصیل کے مطابق ذبح کرنیوالا مسلمان ہے، بٹن دباتے وقت بسم اللہ کہتا ہے جن رگوں اور نالیوں کا کاٹا جانا مطلوب ہے وہ کٹ جاتی ہیں اور جن کی نہ کٹ پائی ہو ان کو ممتاز کرنا اور علیٰحدہ رکھنا بھی ممکن ہے، ایک ہی آلۂ ذبح سے بیک وقت کئی جانور ذبح ہو رہے ہیں، یہ ساری باتیں جائز ہیں۔

برقی صدمات کی وجہ سے مرغی کی موت ہو جائے یا اس درجہ کا صدمہ ہو کہ موت کا احتمال ہو تب تو مردار ہی کہلائیں گی اور ان کا کھانا حلال نہ ہوگا البتہ اگر برقی کے معمولی صدمات کی وجہ سے جانور کے دورانِ خون میں کوئی کمی نہ واقع ہوتی ہو، نہ خون میں انجماد پیدا ہوتا ہو، نیز امریکہ کے ماحول میں قانونی اور سماجی اسباب کے تحت ایسا کرنے کی حاجت ہو تو اس کو گوارہ کیا جاسکتا ہے اور یہ ذبیحہ بہرحال حلال ہوگا۔ اذا علم حیاۃ لشاۃ وقت الذبح حلت بالذکاۃ تحرکت اولا خرج منہا دم اولا۔ (البحر الرائق ۸/۱۷۲)

البتہ ذبح کی یہ شکل کہ ایک شخص نے بٹن دبایا اور مشین چلنے لگی اور جب تک مشین چلتی رہے گی، جانور کٹتے رہیں گے، دو پہلوؤں سے قابلِ غور ہیں:

اول یہ کہ ذابح کا مسلمان ہونا ضروری ہے ــــــــ سوال یہ ہے کہ ایک شخص بٹن دبانے کے بعد الگ ہو جائے اور مشین چلتی رہے اور اپنا کام کرتی رہے تو کیا مشین کے ذریعہ ذبح ہونے والے تمام ذبیحوں کی نسبت اسی ذابح کی طرف ہوگی، اس کو یوں سمجھئے کہ مشین بلا واسطہ فعل ذبح انجام دے رہی ہے اور فقہ کی اصطلاح میں وہ اس فعل کے لئے "مباشر" ہے۔ بٹن دبانے والے کی حیثیت "متسبب" کی ہے، مباشر مکلف ہو تو فعل کی نسبت اسکی طرف ہوتی ہے اور اگر مکلف یعنی احکام کے مخاطب قرار پانے کا اہل نہ ہو تو اس فعل کی نسبت متسبب کی طرف کی جاتی ہے، اس لئے بٹن دبانے والے ہی کو ذابح تصور کیا جائے۔

اب صرف ایک مسئلہ باقی رہتا ہے کہ کیا آن (ON) کرنے والے کا بسم اللہ کہنا ان سب مرغیوں کے لئے کافی ہو جائے گا جو بٹن آف (OFF) کرنے تک مشین کے ذریعہ ذبح ہوتی چلی جائیں؟ یہ اہم مسئلہ ہے اور اس کو سمجھنے کے لئے پہلے ذبح کی بابت چند قواعد پیشِ نظر رکھنے چاہئیں۔

اول یہ کہ فقہاء کے اصول اور شریعت کی نصوص کے مطابق ذبیحہ کے اعتبار سے ذبح کی دو قسمیں ہیں۔ ذبح اختیاری اور ذبح اضطراری ــــــــ جانور قابو میں ہو تو اس کو ذبح کرنا ذبحِ اختیاری ہے۔ جانور قابو میں نہ ہو تو اس کو ذبح کرنا ذبح اضطراری ہے، جیسے شکار پر تیر پھینکنا یا تربیت یافتہ کتے چھوڑنا۔

یہ بات ظاہر ہے کہ سوال میں ذبح کی جو صورت دریافت کی گئی ہے اس کا تعلق ذبحِ اختیاری سے ہے نہ کہ ذبحِ اضطراری سے ــــــــ ذبحِ اختیاری اور ذبح اضطراری کے درمیان فقہاء نے جن احکام میں فرق کیا ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ ذبح اضطراری میں "بسم اللہ" کہنے کا تعلق آلۂ ذبح سے ہوتا ہے اگر کسی نے بسم اللہ کہہ کر تیر پھینکا یا کتے دوڑائے تو وہ تیر جتنے شکار کو لگے گا

اور کتے جتنے شکار کو زخمی کریں گے سبھی حلال ہو جائیں گے اس کے برخلاف ذبحِ اختیاری میں بسم اللہ کا تعلق فعلِ ذبح سے ہے، مشہور فقیہ ابن نجیم کہتے ہیں لان التسمیۃ فی الزکاۃ الاختیاریۃ مشروعۃ علی الذبح لا علی الٰتہ وفی الذکاۃ الاضطراریۃ التسمیۃ علی الآلۃ لا علی الذبیحۃ۔ (البحر الرائق ۸/۱۶۸)

دوسرے یہ کہ چوں کہ ذبح اختیاری میں بسم اللہ کا تعلق فعلِ ذبح سے ہوتا ہے اس لئے اگر بالتعاقب فعل ذبح پایا جائے یعنی ایک جانور کو لٹایا، اس کو ذبح کیا پھر دوسرے جانور کو لٹایا اور اس کو ذبح کیا تو اب ایک ہی بسم اللہ اس دوسرے جانور کے حلال ہونے کے لئے کافی نہ ہوگا بلکہ دوبارہ بسم اللہ کہنا ضروری ہوگا۔ اور اگر ایک ساتھ چند بکریوں کو ایک دوسرے پر لٹا دیا اور ایک ہی بسم اللہ سے ذبح کرتے چلے گئے تو وہ سب حلال ہو جائیں گے، گویا فعل ذبح میں تکرار ہو تو بسم اللہ میں بھی تکرار ضروری ہوگا اور فعل ذبح ایک ہی ہو تو گو ذبیحہ متعدد ہوں ایک ہی تسمیہ سب کے لئے کافی ہوگا۔ صاحب درمختار نے اس نکتہ کو واضح کیا ہے
"لو اضجع شاتین احداھما فوق الاخریٰ فذبحھما ذبحۃ واحدۃ بتسمیۃ واحدۃ حلا بخلاف مالو ذبحھما علی التعاقب لان الفعل یتعدد فتتعدد التسمیۃ" (درمختار ۵/۱۹۲)

تیسرے اس بات کو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ ذبح کا وہ مسلسل عمل جس میں بلا انقطاع چھرا حرکت کرتا رہتا ہے اور مرغیاں اس کی زد میں آئیں اور ذبح ہوتی چلی جائیں، ایک ہی فعلِ ذبح ہے، اس کا اندازہ درمختار کی مذکورہ بالا عبارت جس میں ایک سے زیادہ جانوروں کے ذبح کو ایک ساتھ حلال قرار دیا گیا ہے، کے علاوہ عالمگیری کی اس عبارت سے بھی ..... ہوتا ہے کہ اِمرار اور چھرے کی مرور و حرکت کی کیفیت کو فعل ذبح قرار دیا گیا ہے اور جب تک امرار کی اس

کیفیت میں انقطاع نہ پیدا ہوا ہو اس کو ذبح واحد کے حکم میں رکھا گیا ہے چنانچہ کہا گیا: لو اضجع احدی الشاتین علی الاخری تکفی تسمیۃ واحدۃ اذا ذبحہما بامرار واحد ولو جمع العصافیر فی یدہ فذبح وسمی وذبح علیٰ اثرہ ولم یسم لم یحل الثانی ولو امرّ السکین علی الکل جاز بتسمیۃ واحدۃ (ہندیہ ۵/۲۸۹)

ان تینوں قواعد کو پیشِ نظر رکھا جائے تو مشینی ذبیحہ کا حکم اس طرح نکلتا ہے کہ:

۱۔ بسم اللہ کہہ کر بٹن دبانے والے شخص نے کسی خاص مرغی پر تسمیہ نہیں کہا بلکہ مشین کے ذریعہ صادر ہونے والے مسلسل فعلِ ذبح پر تسمیہ کہا ہے اور ذبح اختیاری میں تسمیہ کا تعلق فعلِ ذبح ہی سے ہوتا ہے۔

۲۔ مشین کا عمل جب تک متواتر چلتی رہے امرار واحد اور ذبحِ واحد کے حکم میں ہے۔

۳۔ لہذا گو مرغیوں کی تعداد کتنی بھی ہو جائے، ان سب کا ذبح ایک ہی فعلِ ذبح کے تحت انجام پایا ہے اور اس لئے ایک ہی تسمیہ سب کے لئے کافی ہے ہاں اگر درمیان میں مشین رک گئی یا بند ہو گئی تو دوبارہ مشین چلاتے ہوئے پھر سے تسمیہ ضروری ہوگا۔

یہ ساری تفصیلات ان فقہاء کی رائے پر مبنی ہیں جو ذبح کرتے وقت تسمیہ کو ضروری سمجھتے ہیں لیکن امام شافعی جن کے نزدیک مسلمان کے لئے تسمیہ کہنا ضروری نہیں کہ بسم اللہ اس کے دل میں موجود ہے، کے یہاں تو یہ ذبیحہ کسی تردد و اضطراب کے بغیر حلال ہوگا ہی ——— یہ مسئلہ گو اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک نیا مسئلہ ہے لیکن ہندوستان کے موجودہ بعض اکابر علماء نے بھی اس مسئلہ پر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے اور اس کو جائز قرار

دیا ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب صدر مفتی دار العلوم دیوبند اسی نوعیت کے ایک استفتار کے جواب میں فرماتے ہیں :

"جس بٹن کے دبانے سے جانور کے گردن پر چھری چلتی ہے اس بٹن کا چھری چلانے کے لیئے دبانے والا "بسم اللہ اللہ اکبر" محض (اللہ کا نام) لیکر بٹن دبائے اور مسلمان ہو یا اہلِ کتاب (مثلاً یہودی) ہو، اسی طرح جو لوگ چھری چلنے کے وقت جانور پر کنٹرول کرتے ہیں کہ چھری بھکنے نہ پائے جانور کی گردن ہی پر چلے، وہ لوگ مسلمان یا اہلِ کتاب (مثلاً یہودی) ہوں اور کنٹرول کرتے وقت "بسم اللہ اللہ اکبر (محض اللہ کا نام) لے کر کنٹرول کریں تو یہ طریقہ اور عمل اگرچہ ذبح کے مسنون طریقہ (طریق مسنون) نہ ہونے کی وجہ سے مکروہ ہو مگر اس عمل سے اگر ذبیحہ کی اکثر رگیں کٹ کر سارا خون نکل جاتا ہو تو ذبیحہ حلال ہو جائے گا اور اس کا کھانا بھی درست رہے گا"

(ماہنامہ دار العلوم دیوبند جون ۱۹۷۸ء) ع۵

ذبح کے آداب

ذبح کے سلسلہ میں شریعت کا عمومی مزاج یہ ہے کہ ایسی صورت اختیار کی جائے جس میں جانور کو کم سے کم اذیت پہنچے، خون بہتر طور پر نکل جائے اور ذبح میں غلطی کا احتمال کم سے کم رہے، فقہار نے لکھا ہے :

۱۔ آلۂ ذبح تیز ہو اور لوہے کا ہو، کند ہتھیار اور لوہے کے علاوہ کسی اور چیز سے جانور کو ذبح کرنا مکروہ ہے کہ اس میں اذیت زیادہ ہے۔

ع۵ راقم کے اس فتویٰ سے حضرت مولانا مجاہد الاسلام صاحب قاسمی، جناب مولانا محمد رضوان القاسمی اور جناب مولانا بدر الحسن قاسمی صاحبان نے بھی اتفاق فرمایا ہے۔

خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تاکید فرمائی ہے (۱)

۲۔ جانور کی مطلوبہ چاروں نالیاں کاٹ دی جائیں کہ اس طرح جلد رشتہ حیات کٹ سکتا ہے (۲)

۳۔ رگوں کو تیز تیز کاٹا جائے تاکہ تکلیف کم ہو (۳)

۴۔ ان ہی چار نالیوں کے کاٹنے پر اکتفار کیا جائے اور گردن کی ہڈی تک نہ پہنچا جائے (۴)

۵۔ گردن پشت کی طرف سے نہ کاٹی جائے بلکہ حلق کی طرف سے کاٹی جائے کیوں کہ پشت کی طرف سے کاٹنے میں اذیت زیادہ ہے۔ البتہ اگر پشت ہی کی طرف سے کاٹنا شروع کر دے اور مطلوبہ رگوں تک پہنچنے تک اس میں حیات باقی رہے تو جانور حلال ہو جائے گا، لیکن یہ طریقِ ذبح مکروہ ہوگا (۵)

۶۔ جھٹکے کے ساتھ جو جانور کاٹا جائے وہ بھی شریعت کے مقررہ قاعدہ کے خلاف ہونے کی وجہ سے مکروہ ہے لیکن ذبیحہ حلال ہو جائے گا (۶)

۷۔ یہ بھی مکروہ ہے کہ جانور کے سامنے آلاتِ ذبح تیز کیا جائے (۷)

۸۔ مستحب ہے کہ جانور دن میں ذبح کیا جائے، رات میں ذبح کرنا مکروہِ تنزیہی ہے کہ مطلوبہ رگوں کے کٹنے اور نہ کٹنے کا اندازہ دشوار ہے (۸)

(۱، ۲، ۳، ۴) بدائع ۵/۶۰۔

(۵) المغنی ۹/۳۱۹۔

(۶) شرحِ مہذب ۹/۸۱۔

(۷) المغنی ۹/۳۱۷۔

(۸) بدائع ۵/۶۰۔

البتہ فی زمانہ روشنی کی ایسی صورتیں پیدا ہوگئی ہیں کہ بسہولت اس دقت کا ازالہ ہو سکتا ہے، اگر ایسا ہو تو مکروہ نہیں ہوگا۔

۹۔ یہ بھی مستحب ہے کہ جانور کو ذبح کرتے وقت قبلہ رُخ رکھا جائے اور ذبح کرنے والا بھی قبلہ رُخ ہوکر ذبح کرے (۱)

۱۰۔ ذبح کے بعد جانور کے پوری طرح ٹھنڈا ہونے سے پہلے اس کا چمڑا چھیلنا بھی مکروہ ہے اس لئے کہ اس سے جانور کو زیادہ اذیت ہوگی (۲)

۱۱۔ یہ بھی مستحب ہے کہ جانور کو مذبح تک نرمی کے ساتھ لے جایا جائے اور ذبح سے پہلے پانی پلا دیا جائے (۳)

۱۲۔ غصب، چوری وغیرہ کے ہتھیار سے جانور کو ذبح کیا جائے تو جانور تو حلال ہو جائے گا لیکن اس کا یہ عمل مکروہ ہوگا (۴)

سات حرام اعضاء

امام مجاہد کی ایک مرسل روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حلال جانوروں کی بھی سات چیزوں کو ناپسند فرمایا ہے، نر اور مادہ کے اعضاءِ تناسل، فوطے، بہتا ہوا خون، مثانہ، پتہ (مرارة) مغزِ حرام (غدة) (۵) اسی لئے فقہاء نے بھی ان اجزاء کو حرام قرار دیا ہے (۶)

---

(۱) بدائع ۶۰/۵۔
(۲) المغنی ۳۲۰/۹۔
(۳) شرحِ مہذب ۸۱/۹۔
(۴) شرح مہذب ۸۲/۹۔
(۵) کتاب الآثار لامام محمد ص: ۱۱۶۔
(۶) بدائع ۶۱/۵۔

جنین کا حکم

فقہاء کے درمیان اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ ذبیحہ کے جنین کو ذبح کیا جانا درست ہے یا نہیں؟ اس کی تفصیل یوں ہے کہ اگر نامکمل تخلیق کی حالت میں ذبح کے بعد مردہ جنین نکلا تو بالاتفاق اس کا کھانا حلال نہ ہوگا، ذبح کے بعد زندہ حالت میں نکلا تب ذبح کیا جانا درست ہوگا، اگر ذبح کرنے سے پہلے مرگیا تو بالاتفاق کھانا حرام ہوگا۔ اگر کامل الخلقت ہو کر مردہ نکلا تو امام ابوحنیفہ کے نزدیک اس کا کھانا جائز نہ ہوگا، دوسرے فقہاء کے نزدیک جائز ہوگا، اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ماں کو ذبح کرنا جنین کو ذبح کرنا ہے ذکاۃ الجنین ذکاۃ امہ۔ امام ابوحنیفہ اس حدیث کا مفہوم یہی متعین کرتے ہیں کہ ماں کے ذبح کئے جانے کی طرح جنین کو بھی ذبح کیا جانا چاہیئے (۱)

قرآن میں مذکور محرمات

اب ایک نظر ہم ان احکام پر ڈالتے ہیں جو اس سلسلہ میں خود قرآن مجید نے بیان کئے ہیں، ارشادِ خداوندی ہے:

حرمت علیکم المیتة والدم ولحم الخنزیر وما اھل بہ لغیر اللہ والمنخنقة والموقوذة والمتردیة والنطیحة وما اکل السبع الا ماذکیتم وماذبح علی النصب۔ (مائدۃ: ۵)	تم پر حرام کئے گئے ہیں مردار اور خون اور خنزیر کا گوشت اور جو جانور کہ غیر اللہ کے نام زد کر دیا گیا ہو اور جو گلا گھٹنے سے مرجائے اور جو کسی ضرب سے مرجائے اور جو اونچے سے گر کر مرجائے اور جو کسی ٹکر سے مرجائے اور جس کو کوئی درندہ کھانے لگے سوائے اس کے جس کو ذبح کر ڈالو اور جو پرستش گاہوں پر ذبح کیا جائے

(۱) تفصیل کیلئے دیکھئے بدائع ۴۲/۵، المغنی ۲۱۹/۹۔

ذبیحہ کے سلسلہ میں قرآن مجید کی یہ آیت سب سے زیادہ جامع اور احکام میں صریح ہے، انہی میں سے ہر ایک پر اس وقت گفتگو کی جاتی ہے۔

مُردار

"میتۃ" سے مراد "مردار" ہے، چاہے وہ طبعی موت مرا ہو یا ذبح کے شرعی طریقے کی تکمیل کے بغیر انسانی ہاتھوں اس کی موت ہوئی ہو (۱) حیوان کے وہ اجزاء جسم جن میں موت سرایت کرتی ہے اور جن سے زندگی اور موت کا تعلق ہے ان میں سوائے چمڑے کے تمام چیزوں گوشت وغیرہ کی حرمت پر اتفاق ہے البتہ جسم کے وہ اجزاء جن میں حیات۔ رایت نہیں کرتی یعنی بال، اون اور ہڈی وہ پاک ہیں اور ان سے فائدہ اٹھانا جائز ہے (۲)

البتہ مردار کے چمڑے کو دباغت دیکر اس سے فائدہ اٹھانا جائز ہے یا نہیں؟ اس میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے ——— اکثر فقہاء کے نزدیک چمڑے کی دباغت یعنی مٹی، نمک یا کسی بھی کیمیکل طریقہ سے صاف کرنے کے بعد وہ پاک ہو جاتا ہے اور اس کا استعمال نیز خرید و فروخت جائز ہو جاتی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گذر حضرت میمونہ کی مردار بکری پر ہوا تو فرمایا: ھلا اخذتم اھابھا تم نے اس کا چمڑا کیوں نہ لے لیا (۳) ترمذی شریف کی روایت ہے کہ جس چمڑے کو دباغت دی جائے وہ پاک ہو جاتا ہے ایما اھاب دُبغ فقد طھر (۴) مالکیہ کے نزدیک دباغت کے بعد بھی مردار کے چمڑے

---

(۱) احکام القرآن للجصاص ۱/۱۰۸۔

(۲) قرطبی ۲/۲۱۹، تفسیر کبیر ۳/۱۵، احکام القرآن للجصاص ۱/۲۱۔

(۳) قرطبی ۲/۲۱۸۔

(۴) ترمذی عن ابن عباس وقال حسن صحیح۔

سے فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا (۱) واقعہ ہے کہ احادیث و آثار کی روشنی میں پہلی رائے ہی زیادہ صحیح ہے۔

البتہ اس میں احناف کے نزدیک بھی استثناء ہے کہ سوّر کا چمڑا نجس العین ہونے کی وجہ سے بہرحال ناپاک ہے اور دباغت کے بعد بھی پاک نہیں، امام شافعی کے نزدیک کتے کے چمڑے کا بھی یہی حکم ہے جب کہ احناف کے نزدیک کتے کا چمڑا بھی دباغت کی وجہ سے پاک ہو جاتا ہے (۲)

مُردار کے گوشت سے جس طرح خود فائدہ اٹھانا جائز نہیں ایسے ہی جانوروں کو بھی کھلانا جائز نہیں ولا یطعمها الکلاب والجوارح لانها ضرب من الانتفاع (۳)

مُردار کی پانچ خاص صورتیں

قرآن مجید نے آگے پانچ اور قسمیں بیان کی ہیں جو میتۃ ہونے ہی کی بنا پر حرام ہیں، منخنقۃ، موقوذہ، متردیہ، نطیحہ اور ما اکل السبع۔

منخنقۃ : اس جانور کو کہتے ہیں جس کا رسّی یا کسی اور ذریعہ سے گلا گھونٹ دیا جائے۔

موقوذہ : وہ جانور ہے جس کی موت زد و کوب کی چوٹ کی وجہ سے واقع ہو۔

متردیہ : وہ جانور ہے جو بلندی سے نیچے کی طرف گرنے کی چوٹ سے مر گیا ہو۔

نطیحہ : ایک جانور کے حملہ کی وجہ سے دوسرے جانور کی موت واقع ہو جائے اس کو "نطیحہ" کہتے ہیں۔ (مائدہ — ۳)

ما اکل السبع : سے مراد یہ ہے کہ جس جانور کی موت درندوں کے چیر پھاڑ کرنے کی

---

(۱) قرطبی ۲/ ۱۸۔

(۲) احکام القرآن للتھانوی ۱/ ۱۱۵۔

(۳) احکام القرآن ۱/ ۷، نیز دیکھئے تفسیر کبیر ۳/ ۱۶ المسألۃ الرابعۃ۔

وجہ سے ہوئی ہو، اس کو بھی کھانا جائز نہیں، اس لئے کہ ان تمام صورتوں میں ذبح کا جو شرعی طریقہ ہے اور جن رگوں کا کاٹا جانا مطلوب ہے کہ ان کے ذریعہ جسم کا خون بہہ جائے، اس کی تکمیل نہیں ہو پائی ہے۔

آگے اللہ تعالیٰ نے وضاحت فرمائی ہے "الاماذکیتم" کہ جانور کی ان تمام صورتوں میں اگر موت سے پہلے جانور گرفت میں آجائے اور اسے شرعی طور پر ذبح کرلیا جائے تو اب اس کا کھانا حلال ہو جائے گا (یہ رائے احناف، شوافع اور حنابلہ کی ہے، مالکیہ کے مسلک میں قدرے تفصیل ہے، مالکیہ کے مسلک کی تفصیل کے لئے دیکھئے حاشیہ دسوقی و شرح کبیر ۲/۱۱۳)۔

اسی طرح جانور کا کوئی حصہ جو اس کے زندہ وجود سے کاٹ لیا جائے بالاتفاق مردار کے حکم میں ہے۔ پیغمبر اسلام ؐ نے فرمایا ماقطع من البھیمۃ وھی حیۃ فھی میتۃ (ترمذی) اس حکم سے بڑا مقصد جانوروں کے ساتھ رحم دلی اور اس کی بے جا اذیت سے حفاظت ہے، اسلام سے پہلے لوگ زندہ جانوروں سے گوشت کاٹ لیتے تھے اور کھاتے تھے، اس میں جانوروں کے لئے جس درجہ کی ایذا رہتی وہ محتاجِ اظہار نہیں۔

خون

مردار کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے خون (دم) کا ذکر فرمایا ہے (البقرہ ۲، مائدہ ۵) میں مطلقاً خون کو حرام قرار دیا گیا ہے اور سورۂ انعام میں بہتے ہوئے خون کو، اس لئے علماء کا اتفاق ہے کہ خون حرام اور نجس ہے، البتہ سورۂ انعام کی روشنی میں اس بات پر بھی اتفاق ہے کہ جس خون کو شریعت نے حرام قرار دیا ہے وہ وہ خون ہے جو بہتا ہوا ہو۔ حمل العلماء ھٰھنا

المطلق علی المقید اجماعاً (۱) وہ خون جو گوشت میں ہوتا ہے، حرام نہیں۔ چنانچہ حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ ان سے خون لگے ہوئے گوشت کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا کہ حضورؐ نے اس خون سے منع فرمایا ہے جو بہتا ہوا ہو۔ نهیٰ عن الدم المسفوح (۲)۔ حضرت عائشہ ہی سے ایک اور روایت میں ہے کہ حضورؐ کے زمانہ میں ہم لوگ گوشت پکاتے تھے اور خون کی زردی ان پر نمایاں رہتی تھی اور یہی گوشت ہم لوگ کھاتے تھے (۳)۔

اسی اصل پر امام ابو حنیفہ کے نزدیک مچھلی سے نکلنے والا خون ناپاک نہیں ہے، یہی حکم مکھی، مچھر وغیرہ کے خون کا ہے کہ یہ سب بہتے ہوئے خون (دمِ مسفوح) میں داخل نہیں (۴)۔

سوّر

تیسرے سور کا ذکر کیا گیا ہے، قرآن کا مزاج یہ ہے کہ وہ لفظی موشگافیوں کے بجائے استعمال اور زبان و بیان کے معاملہ میں عرف کو ملحوظ رکھتا ہے پس ہر چند کہ خنزیر اپنے پورے وجود کے ساتھ حرام اور ناپاک ہے، لیکن چونکہ سوّر کا اصل مقصود اس کا گوشت ہے اس لئے ازراہِ اتفاق بجائے خنزیر کے "لحمِ خنزیر" سوّر کے گوشت کا ذکر کیا گیا، حالانکہ سوّر کے تمام اجزاء اسی طرح حرام ہیں، یہ ٹھیک ویسے ہی ہے جیسے جمعہ والی آیت میں تجارت سے منع کیا گیا ہے حالانکہ تجارت ہی پر موقوف نہیں، اذانِ جمعہ کے بعد ہر طرح کا معاشی

---

(۱) قرطبی ۲/۲۲۲۔

(۲) احکام القرآن للجصاص ۱/۱۲۳۔

(۳) قرطبی ۲/۲۲۳۔

کاروبار ممنوع ہے، افسوس کہ بعض بدبختوں اور خدا ناترسوں نے گوشت کی اس اتفاقی قید کی وجہ سے سؤر کی چربی کا جواز نکال لیا ہے، حالانکہ امت کا اجماع اور اتفاق ہے کہ سؤر کی چربی بھی سؤر کے گوشت ہی کی طرح حرام ہے، قرطبی کا بیان ہے: اجمعت الامۃ علیٰ تحریم شحم الخنزیر (۱)

البتہ خنزیر کے بال کے بارے میں اختلاف ہے کہ جوتے وغیرہ کی سلائی میں اس کا استعمال کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ فقہاء احناف نے مسلمانوں کے تعامل کو دیکھتے ہوئے اس کی اجازت دی ہے (۲) قرطبی نے نقل کیا ہے کہ خود عہدِ رسالت میں بھی اس کا استعمال تھا اور آپؐ کا اس پر نکیر فرمانا ثابت نہیں ہے (۳) امام شافعی گو اس کو بھی منع کرتے ہیں لیکن خود مشہور شافعی مفسر قرآن امام فخر الدین رازیؒ کے لب و لہجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس مسئلہ میں احناف کے ساتھ ہیں۔

غیر اللہ کے نام پر ذبح شدہ جانور

چوتھے قرآن مجید نے ان جانوروں کو حرام قرار دیا ہے جو غیر اللہ کے نام پر ذبح کئے گئے ہوں، خواہ جمادات کے نام پر ہو یا کسی بزرگ اور پیغمبر کے نام پر ——— چنانچہ ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے کہ عیسائی جن جانوروں کو حضرت مسیح کے نام پر ذبح کریں وہ بھی حرام ہیں (۴) نیز حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ جب تم یہود و نصاریٰ کو غیر اللہ کے نام

---

(۱) قرطبی ۲/۲۲۲۔

(۲) جصاص ۱/۱۲۴۔

(۳) قرطبی ۲/۲۲۳۔

جصاص ۱/۱۲۴۔

پر ذبح کرتے ہوئے دیکھو تو مت کھاؤ (۱) بعض لوگوں نے عیسائیوں کے ایسے ذبیحہ کو بھی حلال قرار دیا ہے جو حضرت مسیح کے نام پر ذبح کیا گیا ہو لیکن یہ قطعاً غلط ہے اور امت کے عمومی مسلک و نقطۂ نظر کے خلاف ہے (۲)

آستانوں کا ذبیحہ

قرآن مجید نے ذبیحہ کی جن صورتوں کو حرام قرار دیا ہے ان میں ایک وَمَا ذبح علی النصب بھی ہے "نصب" کے معنی بعض اہل علم نے بتوں کے بتائے ہیں (۳) اور اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ یہ مکہ کے گرد کچھ پتھر تھے جن پر خصوصیت سے لوگ جانوروں کو ذبح کیا کرتے تھے اور اس میں ان مقامات کی تعظیم مقصود ہوا کرتی تھی (۴) ـــــــــ اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ غیر اللہ کی تعظیم کے لئے جو بھی جانور ذبح کئے جائیں وہ سب حرام ہیں، سیدتنا حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ عجم اپنے تیوہاروں کے موقعہ سے جانور ذبح کرتے ہیں اور مسلمانوں کو تحفہ دیتے ہیں، مسلمان اس سے کھائیں یا نہیں؟ حضرت عائشہ نے فرمایا کہ "ماذبح علی ذلك اليوم فلا تأكلوا منه" اس دن کے لئے جو جانور ذبح کئے جائیں اس میں سے نہ کھاؤ (۵) حسن بصری سے منقول ہے کہ ایک عورت نے اپنی گڑیا کی شادی کی اور اس میں کچھ اونٹ ذبح کئے تو آپؒ نے فرمایا کہ یہ گوشت نہ کھایا جائے اس لئے کہ یہ بُت کے

---

(۱) تفسیر کبیر ۲۰/۳۔

(۲) تفصیل کے لئے دیکھئے تفسیر کبیر ۲۲/۳ - ۲۱۔

(۳) تفسیر کبیر ۱۳۵/۱۱۔

(۴) قرطبی ۵۷/۶۔

(۵) تفسیر ابن کثیر ۲۱۱/۲۔

لئے ذبح کیا گیا ہے (۱) ان روایات سے اندازہ ہوتا ہے کہ چاہے جانور کے ذبح کے وقت اللہ کا نام لیا جائے لیکن اگر غیر اللہ کی تعظیم مقصود ہو تو ذبیحہ حرام ہی ہوگا، علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں:

نهى الله المؤمنين عن هذا الصنيع وحرم عليهم اكل هذه الذبائح التى فعلت عند النصب، حتى ولو كان يذكر عليها اسم الله فى الذبح عند النصب ...... وينبغى ان يحمل على هذا لانه قد تقدم تحريم ما اهل به لغير الله (۲)	اہلِ ایمان کو اس طریقہ سے منع فرمایا گیا اور ان کے لئے آستانوں پر کئے جانے والے ذبیحے حرام قرار دیئے گئے، گو آستانوں پر ذبح کے وقت اللہ کا نام ہی کیوں نہ لیا جائے ...... اور آیت کا یہی معنی مراد لیا جانا چاہئے کیوں کہ ان جانوروں کی حرمت کا ذکر پہلے ہو چکا ہے جن کو غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا ہو۔

راقم الحروف کا خیال ہے کہ ایسا جانور جس کو غیر اللہ کے نام پر چھوڑا جائے چاہے کسی نبی یا ولی کے نام پر کیوں نہ ہو، اگر وہ شخص اپنے اس مشرکانہ عمل سے تائب نہ ہو اور ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لے لے یا تعظیم کی نیت سے مزاروں اور آستانوں پر جانور ذبح کرے تو یہ بھی مردار ہی کے حکم میں ہوگا اور اس کا کھانا حلال نہ ہوگا کہ یہ بھی "ما اهل به لغير الله" کے عموم میں داخل ہے اور معنوی اعتبار سے "ما ذبح على النصب" کا مصداق ہے ——— واللہ اعلم۔

گو ملاجیون کی تفسیر احمدی میں ایسے ذبیحہ کو حلال اور پاک قرار دیا گیا ہے (۳)۔

---

(۱) تفسیر ابن کثیر ۲/۲۱۱۔

(۲) ابن کثیر ۲/۱۲۔

(۳) تفسیر احمدی ص: ۴۴۳ بحوالہ احکام القرآن للتھانوی ۱/۱۱۷۔

شکار

کون سے جانور حلال ہیں اور کون سے حرام اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے جن جانوروں کا کھانا حلال ہے ان کا شکار بھی جائز ہے، شکار کا جائز ہونا قرآن مجید اور حدیث سے ثابت ہے، ارشادِ خداوندی ہے:

اذا حللتم فاصطادوا۔ (مائدہ: ۲) احرام کھولنے کے بعد شکار کر سکتے ہو۔

آگے فرمایا گیا کہ اپنے تربیت یافتہ شکاری جانوروں کے ذریعہ شکار کرو۔ یہ بھی تمہارے لئے حلال ہیں بشرطیکہ وہ شکار کئے ہوئے جانور کو تم پر روک لیں اور تم ان پر اللہ کا نام لے چکے ہو (مائدہ۔۴) حدیثیں بہت سی شکار کے جواز میں موجود ہیں، اسی لئے شکار کے حلال اور مباح ہونے پر اہلِ علم کا اتفاق ہے (۱)

سمندری اور زمینی دو طرح کے جانور کا شکار جائز ہے۔ خواہ ان کا کھانا حلال ہو یا نہ ہو، کھانا حلال ہو تو گوشت سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، حلال نہ ہو تو اس کے چمڑے، بال اور ہڈی وغیرہ سے استفادہ کیا جا سکتا ہے، یا اس کی ایذار سے اپنا تحفظ کیا جا سکتا ہے (۲) البتہ یہ ضروری ہے کہ جس جانور کا شکار کیا جارہا ہو وہ کسی اور کی ملکیت نہ ہو (۳) نہ حدودِ حرم میں واقع ہو، ہاں ایذار پہنچانے والے جانور حرم میں ہوں تو بھی ان کا شکار جائز ہے (۴)

شکار کے سلسلہ میں کئی بات ہے جو پیشِ نظر رکھے جانے کے لائق ہے اول خود شکار کرنے والے کے بارے میں کہ اس میں کیا باتیں پائی جانی چاہئیں، شکار میں اس سے کیا عمل متعلق ہے؟

---

(۱) المغنی ۲۹۲/۹۔

(۲) بدائع ۶۱/۵۔

(۳) بحر الرائق ۲۲۰/۸۔

(۴) بدائع ۶۱/۵۔

۲۔ دوسرے خود اس جانور کے احکام جس کا شکار کیا جائے۔

۳۔ تیسرے آلاتِ شکار کہ کن اشیاء سے شکار کیا جاسکتا ہے؟

شکار کرنے والے میں مطلوبہ اوصاف

شکار کرنے والے کے لئے ضروری ہے کہ اس میں وہ تمام اوصاف موجود ہوں جو اختیار اور قابو میں رہنے والے جانور کے ذبح کرنے والے کے اندر پائے جانے ضروری ہیں، یعنی وہ بسم اللہ اور ذبح کے مفہوم کو سمجھتا ہو، مسلمان ہو یا اہلِ کتاب میں سے ہو نیز خود شکار کرنے والا حالتِ احرام میں نہ ہو، اگر کتے وغیرہ کے ذریعہ شکار کیا ہو تو یہ بھی ضروری ہے کہ خود کتے کو شکار پر چھوڑا ہو اور کتا چھوڑنے میں اس کے ساتھ کوئی ایسا شخص شریک نہ ہو کہ جس کا شکار حلال نہیں، شکار کرنے والا تیر پھینکتے ہوئے یا کتے کو چھوڑتے ہوئے قصداً بسم اللہ کو ترک نہ کرے نیز کتا چھوڑنے کے بعد مسلسل جانور کے تعاقب میں رہے اور کسی دوسرے کام میں مشغول نہ ہو۔ اگر کسی دوسرے کام میں لگ گیا پھر بعد کو شکار کیا ہوا جانور مُردہ ملا تو اب اس کا کھانا حلال نہ ہوگا۔ اس لئے کہ اس امر کا احتمال موجود ہے کہ اس کے چھوڑے ہوئے کتے کے بجائے کوئی دوسرا کتا اس کی موت کا سبب بنا ہو (۱)

شکار کب حلال ہوگا؟

جس جانور کا شکار کیا جائے، اس کے حلال ہونے کیلئے یہ ضروری نہیں کہ ذبح اور نحر ہی کیا جائے بلکہ اس کے جسم کے کسی بھی حصہ کا زخمی کر دینا کافی ہے، اگر زخمی نہ ہو، محض جانور کی گردن ٹوٹ جائے یا کتا اس کا گلا گھونٹ

(۱) عالمگیری ۵/ ۴۲۱، الباب الثالث فی شرائط الاصطیاد۔

دے تو اس کا کھانا حلال نہ ہوگا (۱) نیز اگر موت سے پہلے اس جانور پر قابو پالیا تو پھر اس کو ذبح کے شرعی قواعد کے مطابق ذبح کرنا ضروری ہوگا، اس کے بغیر جانور حلال نہ ہوگا (۲) اور اس پر تمام ہی فقہاء کا اتفاق ہے (۳) یہ بات بھی ضروری ہے کہ جس جانور کا شکار کیا جائے وہ وحشی ہو، پالتو اور مانوس نہ ہو اور اپنے بچاؤ پر قدرت رکھتا ہو، بھاگ سکتا ہو یا اڑ سکتا ہو، ایسا جانور جو بھاگنے پر قادر نہ ہو اور بآسانی گرفت میں آسکتا ہو، اس کو پکڑ کر عام قاعدہ کے مطابق ہی ذبح کرنا ضروری ہوگا، مثلاً پرندہ جال میں پھنس گیا، ہرن کنویں میں گر گیا یا ہو تو جنگلی جانور لیکن پالتو جانوروں کی طرح مانوس ہوگیا، اب اسے بآسانی پکڑا جاسکتا ہے' ان صورتوں میں محض زخمی کردینا ہی کافی نہیں، عام طریقہ کے مطابق جانور کو ذبح کرنا ضروری ہوگا۔ (۴)

اگر شکار پر حملہ کیا گیا اور اس کا کوئی عضو کٹ کر الگ ہوگیا تو وہ مردار کے حکم میں ہے، اس کا کھانا جائز نہیں۔ اگر پورا جانور دو لخت ہوگیا یا ایک طرف ایک تہائی اور دوسری طرف دو تہائی ہوگیا ایسی صورت میں علٰحدہ شدہ حصہ اور جانور کا اصل حصہ دونوں کا کھانا جائز ہوگا (۵)

شکار کس کا کیا جائے؟

جیسا کہ مذکور ہوا شکار کھائے جانے والے اور نہ کھائے جانے والے دونوں

---

(۱) ردالمحتار ۵/۳۰۰–۲۹۹۔

(۲) بحر ۸/۲۲۳۔

(۳) بدایۃ المجتہد ۱/۴۴۵۔

(۴) ردالمحتار ۵/۳۰۰۔

(۵) بحر ۸/۲۲۰۔

کا کیا جا سکتا ہے۔ نہ کھایا جانے والا شکار کی وجہ سے پاک ہوجاتا ہے اور اس طرح اس کے چمڑے، بال وغیرہ سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے (۱) اگر نجس العین یعنی سؤر نہ ہو تو گوشت بھی پاک ہو جاتا ہے اور کھانے کے علاوہ کسی اور ضرورت کے لئے مثلاً خارجی دواؤں کے لئے اس کا استعمال کیا جا سکتا ہے۔ خنزیر کی نجاست شکار کے باوجود باقی رہتی ہے۔

کسی جانور سے ضرر پہنچتا ہو تو اس سے نجات کیلئے اس کو ہلاک کرنا جائز ہے (۲) بے مقصد اور محض کھیل تماشہ کے لئے کسی ذی روح کی جان لینا جائز نہیں۔ حدیث میں ہے کہ جو شخص محض بے مقصد کسی گوریئے کی جان لے لے تو وہ قیامت میں فریاد کناں ہو گا کہ اے پروردگار! فلاں شخص نے مجھے ناحق ہلاک کیا تھا اور بے فائدہ میری جان لی تھی (۳) فقہاء نے بھی اس کو ناجائز لکھا ہے (۴)

آلاتِ شکار

شکار کے لئے جو آلات استعمال کئے جائیں وہ دو طرح کے ہیں۔ ایک ذی روح، دوسرے غیر ذی روح۔ غیر ذی روح مثلاً تیر، نیزہ، تلوار وغیرہ، ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ دھاردار ہو جو جانور کو زخمی کر سکے، حضرت ابو ثعلبہ خشنی کی روایت میں ہے کہ جس جانور کا تیر سے شکار کرو اور اس پر اللہ کا نام لے چکے ہو تو اس میں سے کھا سکتے ہو (۵) ایسے ہتھیار جس سے چوٹ

---

(۱) شامی ۵/۳۰۵۔

(۲) رد المحتار ۵/۳۰۵۔

(۳) نیل الاوطار ۸/۱۵۵۔ (۴) درمختار ۵/۲۹۷، کتاب الصید۔

(۵) صحیح مسلم ۲/۱۴۶۔ باب الصید بالکلاب المعلمۃ والرمی۔

کی وجہ سے موت واقع ہو جائے اس کا کھانا جائز نہیں، عدی بن حاتم کی روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: جس کو تیر کی نوک کے بجائے پھل کی چوٹ لگے اور موت واقع ہو جائے، اسے نہ کھاؤ ما اصاب بعرضه فلا تأكل (۱) چنانچہ اگر کسی شخص نے بھاری پتھر سے مارا اور موت واقع ہو گئی تو اس کا کھانا جائز نہ ہوگا، دھار دار ہلکا پتھر ہو تو جائز ہوگا (۲) علامہ ابن نجیم نے اس سلسلہ میں بڑا جامع اصول متعین کیا ہے اور وہ یہ کہ جانور کی موت اگر زخم کی وجہ سے ہوئی ہے تو وہ حلال ہوگا، بوجھ اور چوٹ کی وجہ سے ہوئی ہے یا ایسا ہونے کا شک ہے تب بھی احتیاطاً شکار حرام ہی ہوگا۔ جانور کو ایسا زخم آیا کہ خون نکل پڑا تو پھر بالاتفاق جانور حلال ہوگا اور اگر خون بالکل نہ نکل پایا تو اس میں اختلاف ہے لیکن راجح قول یہی ہے کہ اس کا کھانا بھی حرام ہی ہوگا (۳)

شکاری جانور

ذی روح آلۂ صید سے مراد وہ جانور ہے جن کو شکار کیلئے استعمال کیا جائے، یہ چوپایہ بھی ہو سکتے ہیں جیسے کتا اور پرندہ بھی ہو سکتا ہے جیسے باز، شاہین وغیرہ۔ اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وما علمتم من الجوارح مكلبين (مائدہ۔۴) اور جن شکاری جانوروں کو تم تعلیم دو اور ان کو چھوڑ دبھی۔

یہاں "جوارح" سے مراد ہر وہ جانور ہے جو دانت یا پنجے سے شکار

---

(۱) بخاری ۲/۸۲۳ باب ما اصاب المعراض بعرضه۔

(۲) بحر ۸/۲۲۹۔

(۳) حوالہ سابق۔

پر حملہ کرے اور اسے زخمی کرے (۱) اس طرح دانت سے شکار کرنے والے تمام جانور کتا ہو یا کوئی اور درندہ (۲) اور پنجہ سے شکار کرنے والے تمام پرندے اس میں داخل ہیں کہ ان سب کو شکار کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے صرف سوّر اپنی نجاست کی وجہ سے اس سے مستثنیٰ ہے کہ اس کے ذریعہ نہ شکار کرنا جائز ہے نہ حلال (۳) البتہ قرآن مجید نے اس کے ساتھ یہ بھی قید لگائی ہے کہ وہ پہلے سے شکار کے تربیت یافتہ ہوں وَمَا عَلَّمْتُمْ مِنَ الجَوَارِحِ (مائدۃ ۔ ۴) اس لئے جانور کا تربیت یافتہ ہونا ضروری ہے اور اس پر فقہاء کا اتفاق ہے (۴)۔

کتے کے تربیت یافتہ ہونے کی علامت یہ ہے کہ جب اسے دوڑایا جائے دوڑے، روکدیا جائے رک جائے اور جانور پر قابو پانے کے بعد اس میں سے خود نہ کھائے جیسا کہ قرآن نے کہا: فکلوا مما امسکن عَلیکم (مائدۃ ۔ ۴) اور حدیث میں آیا فان اکل فلا تأکل (۵) کہ اگر جانور اس میں سے کھالے تو تمہارے لئے کھانا روا نہیں (۶)

پرندوں کے تربیت یافتہ ہونے کی علامت یہ ہے کہ اسے شکار پر چھوڑ کر پکارا جائے تو واپس آجائے۔ پرندوں کے تربیت یافتہ ہونے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ اپنے شکار میں سے نہ کھائے۔ اگر کھالیا تب بھی

---

(۱) احکام القرآن للجصاص ۳/ ۹۔
(۲) بدائع ۵/ ۵۸۔
(۳) شامی ۵/ ۲۹۹۔
(۴) المغنی ۹/ ۲۹۴۔
(۵) ترمذی عن عدی بن حاتم ۱/ ۲۷۲۔
(۶) المغنی ۹/ ۹۵-۲۹۴۔ بدائع ۵/ ۵۲۔

وہ شکار حلال ہوگا، چنانچہ علی، ابن عباس اور سلمان فارسی رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ اگر شاہین شکار میں سے کھالے تو کھالو اور کتا کھالے تو نہ کھاؤ اذا اکل الصقر فکل وان اکل الکلب فلا تأکل (۱)

بندوق کا شکار

بندوق کے شکار کو عام طور پر فقہاء حرام قرار دیتے ہیں اور اسطرح کی جزئیات فقہاء متقدمین و متاخرین کی کتابوں میں موجود ہیں، لیکن فقہاء کی ان تحریرات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں مٹی کے معمولی ڈھیلے بندوق کے ذریعہ پھینکے جاتے تھے، اس لئے فقہاء کی یہ رائے اپنی جگہ درست تھی۔

موجودہ زمانہ میں جو بارود کی گولیاں تیار ہوئی ہیں وہ کسی دھاردار سے بھی بہتر طریقہ پر جسم کے خون کو بہا دیتی ہیں اور پارہ پارہ کر دیتی ہیں اور شریعت کا اصل مقصود یہی ہے کہ خون اچھی طرح بہہ جائے، اس لئے خیال ہوتا ہے کہ بندوق کی موجودہ وضع آلۂ شکار کے لئے شریعت کی مطلوبہ شرط کو پورا کرتی ہے۔

چنانچہ علامہ صنعانی نے بھی اسکے حلال ہونے کا فتویٰ دیا ہے:

واما البنادق المعروفة الآن فانها ترمى بالرصاص فيخرج وقد صيرته النار البارود كالنيل فيقتل بحده لا بصدمه فالظاهر حل ما قتله (۲)	وہ بندوقیں جو آجکل مروج ہیں، چھروں کو پھینکتی ہیں چھرے نکلتے ہیں اور بارود کی طاقت ان چھروں کو تیر کی طرح بنا دیتی ہے چنانچہ وہ اپنی دھار سے شکار کو قتل کرتی ہے نہ کہ چوٹ سے، لہذا بظاہر اسکے مقتول کو حلال ہونا چاہئے۔

---

(۱) بدائع ۵/۵۵، المغنی ۹/۲۹۷۔ (۲) سبل السلام ۴/۱۸۵۔

شیخ رضا مصری نے اس مسئلہ پر شرح و بسط سے کلام کیا ہے اور نقل کیا ہے کہ تونس کے مشہور حنفی عالم شیخ بیرم بھی اس کو جائز قرار دیتے تھے (۱) مشہور اہل حدیث عالم علامہ شوکانی اس کو جائز قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

وَالذی یظھر لی انہ حلال (۲)

ڈاکٹر عبداللہ عبدالرحیم العبادی نے نقل کیا ہے کہ علامہ ابن عابدین شامی نے اس کے حلال ہونے پر ایک مستقل رسالہ تصنیف کیا ہے (۳)

علماء مالکیہ میں علامہ دسوقی، علامہ ابوالبرکات احمد دردیر وغیرہ جیسے بلند پایہ علماء نے اس کے حلال ہونے کا فتویٰ دیا ہے (۴)

اس گنہ گار کا خیال ہے کہ اس طرح کے نئے مسائل پر فقہاء کی نصوص سے زیادہ شریعت کی نصوص اور شارع کے مقصد نیز احکام کی روح پر نظر رکھنی چاہیئے اور شارع کا مقصد بالکل واضح ہے کہ جانور کا خون اچھی طرح بہہ جائے تو حلال ہے اور نہ بہہ پائے اور جسم میں منجمد ہو جائے تو حرام۔ اس اعتبار سے کوئی شبہ نہیں کہ بندوق کا شکار شریعت کے مقصد کی تکمیل کرتا ہے اس لئے اسے حلال ہی ہونا چاہیئے۔ (۵) ——— واللہ اعلم بالصواب۔

ذبیحہ اور شکار کی حلت و حرمت کا ایک اہم قاعدہ

شکار اور ذبیحہ کے بارے میں یہ بات خاص طور پر پیشِ نظر رکھنی چاہیئے

---

(۱) الذبائح فی الشریعۃ الاسلامیۃ ص: ۱۲۲۔ (۲) فتح القدیر ۹/۲۔

(۳) الذبائح فی الشریعۃ الاسلامیۃ ص ۱۲۳۔

(۴) حاشیۃ الدسوقی علی الشرح الکبیر ۱۰۳/۲۔

(۵) یہ اس فقیر کی رائے ہے، ہندوستان کے عام اور مشاہیر علماء کی رائے اس سے مختلف ہے، اسلئے قارئین دوسرے علماء و اربابِ افتاء سے بھی دریافت کرلیں اور صرف میری اس تحریر پر اکتفا نہ کریں۔

کہ جہاں کہیں بھی حلت وحرمت مشتبہ ہوجائے وہاں اس کے حرام ہونے ہی کو ترجیح دی جائے گی، فقہاء نے ہر جگہ اس کا لحاظ رکھا ہے مثلاً جانور پر ایک مسلمان نے کتا چھوڑا، دوسرے مجوسی کا چھوڑا ہوا کتا بھی شریک ہوگیا تو گو اس کا احتمال موجود ہے کہ مسلمان کے کتے ہی نے شکار کیا ہو لیکن مجوسی کے کتے کی شرکت کی وجہ سے اس پر حرام ہونے کا حکم لگے گا۔

شکار کا جانور چھوڑنے کے بعد ضروری ہے کہ شکار کئے گئے جانور کے تعاقب اور تلاش میں رہے، بیٹھ رہا اور بعد کو مرا ہوا شکار ملا تو گو اس کا کتا وہاں موجود ہو پھر بھی حلال نہیں کہ ممکن ہے موت کا کوئی اور سبب پیش آیا ہو۔

پرندہ کو تیر لگا، وہ وہاں سے کسی پہاڑی وغیرہ پر گرا، پھر وہاں سے زمین پر گرا اور مردہ پایا گیا تو حلال نہ ہوگا کہ ممکن ہے تیر کے زخم کی بجائے چوٹ اس کی موت کا سبب بنی ہو (۱) ——— شریعت کی اس احتیاط کو ذبح وشکار کے ان تمام احکام میں ملحوظ رکھا جائے جن میں اس کے خلاف کوئی واضح دلیل موجود نہ ہو۔

شراب ——— اسلام کی نظر میں!

شریعت کے رمز شناس اور اس کی مزاج ومذاق سے آگاہ علماء نے لکھا ہے کہ بنیادی طور پر احکامِ شریعت کے پانچ مقاصد ہیں، جان کی حفاظت، دین کی حفاظت، عقل کی حفاظت، عزت وآبرو کی حفاظت اور مال کی حفاظت (۲) شریعت کے جتنے احکام ہیں خواہ وہ مرضیات ہوں یا منہیات اور ان کا کیا جانا مطلوب ہو یا ان کا ترک کرنا مقصود ہو، وہ بہر حال انہی پانچ مقاصدِ

---

(۱) ردالمحتار ۵/۳۰۴۔

(۲) اصول الفقہ لابی زہرہ ص ۳۴۴۔

کی تکمیل ہے، ان مقاصد پنجگانہ میں سے عقل کی حفاظت اس کے بغیر ممکن نہیں کہ ان تمام چیزوں پر روک لگائی جائے جو عقل و دماغ کے توازن کو متاثر کر دیتے ہوں، ان میں سر فہرست نشہ اور شراب ہے جو انسان کو وقتی طور پر عقل و شعور سے محروم کر دیتا ہے اور ہوش و خرد سے عاری کر کے ایسی ایسی حرکتوں کا ارتکاب کراتا ہے اور زبان سے وہ کچھ کہلاتا ہے کہ حالتِ اعتدال میں وہی شخص اس کے تصور سے بھی پشیمان ہو اور گھن محسوس کرے۔ یہ نشہ ایک طرف اسے اپنے ہم جنسوں کے ساتھ ظلم و تعدی پر برانگیختہ کرتا ہے اور دوسری طرف خود اس کے قلب و جگر کو طبّی اعتبار سے اتنا زبردست نقصان پہنچاتا ہے اور اس کے پورے نظامِ جسم کو اس درجہ متاثر کرتا ہے کہ اگر شراب نوشی کو "تدریجی خودکشی" اور زہر خوری قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہو، اسی لئے شریعتِ اسلامی نے جن چیزوں کی ممانعت اور حرمت میں شدت برتی ہے ان میں سے ایک شراب بھی ہے۔

آپؐ نے فرمایا کہ جس نے شراب پی، چالیس دن تک اس کی نماز قبول نہیں ہوگی اور جس نے چوتھی بار شراب پیا اس کو آخرت میں جہنم کی نہر سے پلایا جائے گا (۱) یہ بھی فرمایا کہ جس نے دنیا میں شراب پی اور پیتا رہا وہ آخرت کی شراب سے محروم رہے گا (۲) آخرت کی شراب وہ پاکیزہ شراب ہوگی جس میں سرمستی ہوگی، بدمستی نہ ہوگی اور جس سے سر درد ہوگا، فتور نہ ہوگا۔ ایک روایت میں آپؐ نے اس کو تمام برائیوں کی جڑ اور اصل قرار دیا اور بڑے گناہوں میں بھی بڑا گناہ قرار دیا الخمر ام الفواحش واکبر الکبائر (۳) یہ واقعہ اور مشاہدہ ہے کہ شراب خود ایک برائی ہے لیکن بیسیوں برائیاں ہیں جو اس سے

---

(۱) ترمذی عن ابن عمر، باب ماجاء فی شارب الخمر ۲/ ۸۔

(۲) حوالہ سابق۔

(۳) مجمع الزوائد ۵/ ۶۷، باب جاء فی الخمر ومن یشربہا وفیہ عبدالکریم وابوامیۃ وھو ضعیف۔

پیدا ہوتی ہیں۔ شراب کا سب سے پہلا حملہ انسان کی زبان پر ہوتا ہے، وہ ماں باپ اور بزرگوں کی ہتک کیا معنی؟ اور بھائیوں کی عزت و توقیر کجا، خدا کے ساتھ تمسخر اور کفریات کے تکلم سے بھی باز نہیں رہتا، پھر یہ بدمستی اور رنگ لاتی ہے اور ہاتھ پاؤں تک پہونچتی ہے، اور ظلم و زیادتی اور دوسروں پر تعدی کو اس کیلئے بازیچۂ اطفال بنا دیتی ہے پھر جب یہ بدمستی بامِ عروج پر پہونچتی ہے تو شراب کو شباب کی تلاش ہوتی ہے اور ایسی ہوسناکی اور نفسانیت وجود میں آتی ہے کہ حیوانات اور بہائم کی جبینِ غیرت بھی عرق آلود ہو، شراب کی ادنیٰ انگڑائی مدتوں کے مضبوط رشتہ کو پاش پاش کردیتی ہے اور جب نشہ اترتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس نے بیوی کو طلاق دیدی ہے ——— پس کتنی مطابق واقعہ ہے یہ بات اور کتنا حقیقت شناس ہے یہ فقرہ کہ شراب برائیوں کا سرچشمہ ہے اور صرف گناہ نہیں گناہِ عظیم تر ہے۔ الخمرُ اُمُّ الفواحِش وَاکبرُ الکبائِر۔

شرابؔ کی تدریجی حرمت

اسلام سے پہلے شراب عربوں میں عام تھی اور عرب اس کے اس درجہ خوگر تھے کہ بیک دفعہ ان کو اس سے منع کرنا ممکن نہ تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کو تین مرتبہ میں حرام قرار دیا، پہلے مرحلہ میں محض یہ بتایا گیا کہ شراب میں نفع کم اور نقصان زیادہ ہے قل فیھما اثم کبیر ومنافع للناس (البقرۃ: ۲۱۹) بعض صحابہ اتنی ہی تنبیہ کے بعد شراب سے مجتنب رہنے لگے لیکن عام خیال یہی تھا کہ ابھی شراب مکمل طور پر حرام نہیں ہوئی ہے، ایک دفعہ کچھ لوگوں نے شراب پی، پھر انہی میں سے کسی نے نماز پڑھائی اور قرآن پڑھنے میں سخت غلطی کردی، چنانچہ حکم باری تعالیٰ ہوا کہ نشہ کی حالت میں نماز نہ پڑھی جائے لاتقربُوا الصَّلوٰۃ وانتم سُکاریٰ (نساء: ۴۳)

اَب صحابہ بطورِ خاص نماز کے وقت شراب سے احتیاط برتتے، حضرت عمرؓ کو خصوصیت سے شراب کی قباحتوں اور اس کے مذموم اثرات کا پاس و خیال تھا اس لئے دعا کرتے تھے کہ بارِ الٰہا! شراب کے بارے میں واضح حکم فرما دیجئے اللّٰھم بیّن لنا فی الخمر بیانا شافیاً۔ چنانچہ تیسرے مرحلہ میں شراب کی حرمت کا صریح حکم نازل ہو گیا اور اس وضاحت کے ساتھ کہ اس کو نجاست بھی قرار دیا گیا، عملِ شیطانی بھی، باہمی بغض و عداوت کا باعث بھی، اللہ کے ذکر اور نماز سے روکنے کا ذریعہ بھی اور پھر آخر آخر مسلمانوں سے عہد لیا گیا کہ کیا تم اس سے باز رہو گے؟ فھل انتم منتھون؟ (۱)

یا ایھا الذین اٰمنوا انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجس من عَمَلِ الشیطان فاجتنبوہ لعلکم تفلحون انما یرید الشیطان ان یوقع بینکم العداوۃ والبغضاء فی الخمر والمیسر ویصدکم عن ذکر اللہ وعن الصلوٰۃ فھل انتم منتھون۔ (مائدۃ: ۹۰)

اے ایمان والو! بات یہی ہے کہ شراب اور جوا اور بت وغیرہ اور قرعہ کے تیر یہ سب گندی باتیں شیطانی کام ہیں سو ان سے بالکل الگ رہو تاکہ تم کو فلاح ہو، شیطان تو چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعہ تمہارے درمیان عداوت اور بغض پیدا کر دے اور اللہ تعالیٰ کی یاد سے اور نماز سے تم کو باز رکھے۔ سو اَب بھی باز آؤ گے؟۔

افسوس کہ قرآن کے اتنے مؤکد بیان کے باوجود محض اس بنا پر کہ قرآن میں شراب کے لئے صریحاً حرام کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا ہے بعض اہلِ ہوس شراب کا جواز پیدا کرنا چاہتے ہیں حالاں کہ علاوہ قرآن کے اس طاقتور بیان کے کثرت سے حدیثیں شراب کی حرمت پر ناطق ہیں اور اس پر امت کا اجماع ہے (۲) لیکن اہلِ ایمان کے لئے یہ باعثِ حیرت نہیں۔ اس سے اس کے ایمان

---

(۱) قرطبی ۶/۲۸۶، مجمع الزوائد ۵/۵۱۔ (۲) قرطبی ۶/۲۸۸۔

میں تازگی اور یقین میں اضافہ ہو جاتا ہے کہ اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس پیش گوئی کی تکمیل ہوتی ہے کہ آپ نے فرمایا: میری امت کا ایک طبقہ شراب کو دوسرے ناموں سے حلال کرے گا (۱)

شراب کی حقیقت

شراب جس کو قرآن نے "خمر" سے تعبیر کیا ہے، کی تعریف امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک یہ ہے کہ وہ انگور کے کچے رس کا نام ہے، جس میں جوش اور شدت پیدا ہو جائے اور جھاگ اٹھ جائے (۲) شراب کی یہ خاص قسم امام صاحبؒ کے نزدیک بہرحال حرام ہے۔ اس کی مقدار کم ہو یا زیادہ، نشہ پیدا ہو یا نہ ہو۔ بقیہ دوسری مشروبات اس وقت حرام ہوں گی جب کہ ان سے نشہ پیدا ہو جائے غرض انگوری شراب کے علاوہ دوسری مشروبات کے سلسلہ میں ایک گونہ نرمی برتی گئی ہے لیکن عام فقہاء کے نزدیک ہر نشہ آور چیز خمر اور شراب ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کل مسکر خمر" ہر نشہ آور شئی شراب ہے (۳)

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ کھجور اور انگور سے شراب حاصل کی جاتی ہے (۴) ایک روایت میں ہے کہ جب شراب کی حرمت نازل ہوئی اس وقت پانچ چیزوں سے شراب لی جاتی تھی، انگور، کھجور، گیہوں، جو اور رائی ۔ اسی روایت میں آگے فرمایا گیا کہ جو شئی بھی عقل کو مدہوش اور مخمور

---

(۱) لیستحلن طائفۃ من امتی الخمر باسم یسمونہا، ابن ماجہ بحوالہ مجمع الزوائد ۵/۷۵۔ باب فی من یستحل الخمر۔

(۲) البحر الرائق ۸/۲۱۷۔

(۳) مسلم عن ابن عمر ۲/۱۶۷۔

(۴) مسلم عن ابی ہریرۃ ۲/۱۶۳۔

کردے وہ "خمر" ہے الخمر ماخامر العقل (۱)

حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ جب شراب کی حرمت کا حکم نازل ہوا انگوری شراب بہت کم بنائی جاتی تھی، زیادہ تر کھجور کی شراب ہوا کرتی تھی (۲) اس طرح کی بہت سی روایات اور شریعت کی روح اور اس کی مصلحت سب اس پر متفق ہیں کہ رائے وہی زیادہ صحیح ہے جو عام فقہاء کی ہے کہ ہر نشہ آور شیئ شراب اور خمر کے حکم میں ہے اور جیسا کہ حضورؐ نے فرمایا کہ جس کی کثیر مقدار نشہ پیدا کردے اس کی معمولی سے معمولی مقدار بھی حرام ہے (۳) ہر نشہ اور مشروب خواہ مقدار کی قلت کی وجہ سے یا عادت اور خو کی وجہ سے عملاً اس سے نشہ پیدا نہ ہو، حرام ہی ہوگا، یہی رائے احناف میں امام محمد کی ہے اور فقہاء نے اسی رائے پر فتویٰ دیا ہے وحرمها محمد مطلقاً وبه يفتىٰ (۴)

شراب کے احکام

شراب کی قباحت اور شناعت کی وجہ سے شریعت نے متعدد سخت احکام اس سے متعلق کیے ہیں اور وہ یہ ہیں:

۱۔ کوئی شخص اس کی کم مقدار پیئے یا زیادہ، اس پر سزائے شرعی (۸۰، کوڑے) جاری ہوگی۔

۲۔ مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ وہ خود اس کا مالک بنے یا کسی اور کو

---

(۱) ابوداؤد عن عمرؓ، باب تحریم الخمر ۵۱۶/۲۔

(۲) بخاری عن انس بن مالک، باب نزول تحریم الخمر ۸۳۶/۲۔

(۳) ترمذی عن جابر بن عبداللہ ۸/۲۔

(۴) شامی ۲۹۲/۵۔

مالک بنائے اور اس کی خرید و فروخت اور تجارت کرے۔

۳۔ وہ نجاستِ غلیظہ ہے، اگر ایک درہم کی مقدار سے زیادہ کپڑے میں لگ جائے تو اس کے ساتھ نماز جائز نہ ہو۔

۴۔ انگوری شراب جس کے حرام ہونے پر اتفاق ہے، اگر کوئی شخص اس کو حلال قرار دے تو اس کو کافر سمجھا جائے گا۔ البتہ دوسری نشہ آور مشروبات کے خمر کہلانے میں چوں کہ فقہاء کے درمیان اختلاف ہے اس لئے اس کے حلال سمجھنے والے کو کافر نہیں سمجھا جائے گا۔

۵۔ مسلمانوں کے حق میں وہ ایک بے قیمت شئ ہوگی، لہذا اگر کوئی شخص اس کو تلف کر دے تو وہ اس کی قیمت کا ضامن نہ ہوگا (۱)

اس بات پر بھی اتفاق ہے کہ اگر شراب رکھی رکھی خود سرکہ بن گئی تو وہ حلال ہے جس کا اندازہ تلخی کے بجائے ترشی پیدا ہونے سے ہوگا (۲) لیکن اگر کسی خاص طریقہ پر اس کو سرکہ بنایا گیا جیسے نمک یا سرکہ ڈال کر تو احناف کے یہاں یہ عمل جائز ہوگا اور وہ سرکہ حلال۔ اور دوسرے فقہاء کے نزدیک اس کا سرکہ بنانا بھی جائز نہیں (۳)

الکوہل ملی ہوئی ادویہ اور عطریات

اسی سے الکوہل ملی ہوئی دواؤں اور سینٹ کا حکم بھی معلوم ہوگیا الکحل کے اجزاء کچھ بھی ہوں لیکن یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ وہ

---

(۱) بدائع ۱۱۳/۵، رد المحتار ۲۸۹/۵، بحر ۲۱۷/۸۔

(۲) بدائع ۱۱۳/۵۔

(۳) بحر ۲۱۹/۸۔

نشہ آور ہوتی ہے اور شریعت کے نزدیک ان اجزار کی اہمیت نہیں جن سے مشروب تیار کیا گیا ہو بلکہ وہ کیفیات اور نتائج واثرات حکم کا اصل مدار ہیں جو کسی چیز کے کھانے یا پینے پر ظاہر ہوتی ہے، اس طرح الکحل شراب ہی قرار پاتا ہے اور شراب ہونے کی وجہ سے حرام بھی ہے اور ناپاک بھی، نہ اس کو پینا درست ہے اور نہ جسم کو ملنا ۔ اس لئے الکحل ملی ہوئی عطریات کا استعمال جائز نہیں ہوگا اور کپڑے یا جسم کے جس حصہ پر لگ جائے اس کو دھونا اور پاک کرنا ضروری ہوگا ۔ البتہ دوائیں چوں کہ ضرورت ہیں اور از راہِ ضرورت شریعت نے شراب پینے کی بھی اجازت دی ہے لہٰذا الکحل ملی ہوئی ادویہ کا استعمال درست ہوگا ۔

حشیش، تمباکو وغیرہ

کچھ سیال مشروب ہی پر موقوف نہیں، جامد اشیار بھی جو نشہ آور ہو وہ بھی حرام ہیں، علامہ حصکفی لکھتے ہیں :

ویحرم اکل البنج والحشیشة والافیون لانه مفسد للعقل و یسد عن ذکر الله وعن الصلوٰة (۱)	بھنگ، حشیش اور افیون کا کھانا حرام ہے کیوں کہ یہ عقل کے لئے مفسد اور اللہ کے ذکر اور نماز کے لئے رکاوٹ ہے ۔

بعض اہلِ علم نے لکھا ہے کہ جو بھنگ اور حشیش وغیرہ کے حلال ہونے پر فتویٰ دے، علامہ ابن تیمیہ نے اس کے حلال سمجھنے والے کو کافر قرار دیا ہے، یہاں تک کہ نجم الدین زاہدی نے ایسے شخص کو مباح القتل بتایا ہے (۲)

اسی طرح تمباکو نوشی اور تمباکو خوری بھی کراہت سے خالی نہیں، گو بعض

---

(۱) دُر علیٰ ہامش الرد ۵/۲۹۴ ۔

(۲) حوالۂ سابق ص : ۲۹۵ ۔

علماء نے اس کی حرمت اور بعض نے اس کی اباحت کا فتویٰ دیا ہے، علامہ عمادی نے تمباکو نوشی کرنے والے کی امامت کو مکروہ قرار دیا ہے اور مسجد میں تو اسکا استعمال مکروہ ہے ہی ________ تمباکو کی ممانعت کی وجہ حضرت ام سلمہؓ کی وہ روایت ہے نہیٰ عن کل مسکر و مفتر۔ "مفتر" سے مراد ہر ایسی چیز ہے جو جسم کو ضعف و نقصان پہنچانے والی ہے (۱)

علماء ہند میں مفتی کفایت اللہ صاحبؒ نے اس کو فی نفسہ مباح لیکن بے احتیاطی سے بدبو پیدا ہو جانے کی صورت میں مکروہ قرار دیا ہے (۲) مولانا تھانویؒ نے حقہ کے بارے میں لکھا ہے کہ "بہر حال اس کا پینے والا گناہ سے خالی نہیں اور اصرار گناہ پر سخت گناہ ہے" (۳)

البتہ بھنگ، افیون وغیرہ سے نشہ آجائے تو اس پر شراب والی سزا جاری نہیں ہوگی بلکہ اس سے کم درجہ سزا دی جائے گی، جس کو فقہاء "تعزیر" کہتے ہیں (۴) غرض تمباکو، زردہ، سگریٹ، بیڑی اور حقہ کی عادت کراہت سے خالی نہیں

---

(۱) ملاحظہ ہو در مختار و شامی ۵/۹۶ — ۲۹۵۔

(۲) کفایت المفتی ۹/۱۲۲ "تمباکو کا استعمال"۔

(۳) امداد الفتاویٰ ۴/۹۸، ترتیب مفتی شفیع صاحبؒ۔

(۴) در علی ہامش الرد ۵/۲۹۵۔

پانچواں باب

طبِ وعلاج

اسلام دینِ فطرت ہے اور اس نے قدم قدم پر انسانی ضروریات کا خیال کیا ہے اس نے اپنے آپ کو مشقت میں ڈالنے اور اللہ کی نعمتوں کو اپنے آپ پر حرام کر لینے میں نجات کا سبق نہیں دیا ہے بلکہ خدا کی نعمتوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حدود اللہ پر قائم رہنے کو انسانی اور روحانی کمال بتایا ہے ۔ اس کی نگاہ میں انسان کا وجود اور اس کی حیاتِ خود اس کے لئے ایک "امانتِ خداوندی" ہے ۔ اس کی حفاظت صرف اس لئے ضروری نہیں کہ انسانی فطرت اس کا تقاضا کرتی ہے بلکہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ اس سے انحراف خدا کی ایک امانت کے ساتھ خیانت اور حق تلفی ہے ۔ اسی تصور کے تحت اسلام "فن طب" کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور علاج کو نہ صرف جائز اور درست بلکہ بعض حالات میں واجب اور ضروری قرار دیتا ہے ، عالمگیری میں ہے کہ اگر دوا کو سبب سمجھ کر اور خدا کو اصل شافی یقین کر کے علاج کرایا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں الاشتغال بالتداوی لا بأس بہ اذا اعتقد ان الشافی ھو اللہ تعالیٰ[1] ۔

---

(۱) عالمگیری ۲/۲۵۴ ۔

علاج کے لئے جو ادویہ استعمال کی جاتی ہیں یا کی جا سکتی ہیں، وہ یہ ہیں :-
جمادات، نباتات، حیوانات، اجزائے انسانی ۔ ذیل میں اختصار کے ساتھ ہر ایک کا الگ الگ حکم لکھا جاتا ہے۔

جمادات سے علاج

جمادات سے مراد وہ تمام جامد یا مائع دبہنے والی اشیاء ہیں جن میں نمو نہیں پایا جاتا ہے اور وہ نہ کسی نباتی یا حیوانی مخلوق سے تعلق رکھتی ہے۔ مثلاً سونا، چاندی، لوہا، پتھر وغیرہ۔ ایسی تمام اشیاء کا از راہِ علاج ہر طرح استعمال درست ہے۔ یعنی ان کے کشتوں کا کھانا، جسم کے خارجی حصہ یا اندرونی حصہ میں ان کے مصنوعی اعضاء کا استعمال وغیرہ، اور اس کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عرفجہؓ کو چاندی اور اس کے بعد سونے کی مصنوعی ناک استعمال کرنے کی اجازت دی تھی (۱) حالانکہ ان کا یہ ناک بنانا کسی تکلیف دہ امر کی بناء پر نہیں تھا بلکہ چہرے پر پیدا ہو جانے والے ظاہری عیب کو دفع کرنے کے لئے تھا، اسی بناء پر فقہاء نے دانتوں کو چاندی اور سونے کے تاروں سے باندھنے کی اجازت دی ہے ویشد الاسنان بالفضۃ ولا یشدھا بالذھب وقال محمدؒ لا بأس بہ (۲)

نباتات سے علاج

نباتی اشیاء اور ان سے بننے والی تمام چیزیں اصلاً حلال ہیں۔ صرف دو صورتیں ہیں کہ جن میں حرمت پیدا ہوتی ہے۔ اول یہ کہ ان میں نشہ پیدا ہو جائے، اس لئے کہ آپؐ نے فرمایا کُلُّ مُسْکِرٍ حَرَامٌ ۔ دوسرے اس وقت جب کہ وہ زہر اور نفس

(۱) ترمذی، ابوداؤد، نسائی عن عبدالرحمٰن بن عرفجہؓ۔
(۲) خلاصۃ الفتاوی ۴/ ۲۷۔

انسانی کے لئے قاتل اور مہلک ہو اس لئے کہ خودکشی حرام ہے۔ پس جو نباتی ادویہ نشہ آور یا زہر نہ ہوں۔ ان کے جائز ہونے میں تو کسی شک کی گنجائش نہیں ہے۔ البتہ ایسی ادویہ کا مسئلہ ہے جو نشہ آور ہونے یا مسموم یا ناپاک ہونے کی وجہ سے عام حالات میں حرام ہیں کہ ازراہِ علاج ان کا استعمال درست ہوگا یا نہیں؟

حیوانات سے علاج

حیوانات میں بعض حلال ہیں اور بعض حرام، پھر جو حلال ہیں ان کو بھی اگر شرعی طور پر ذبح نہ کیا جا سکا تو وہ بھی حرام ہیں جن کو میتہ کہا جاتا ہے۔ پھر ذبیحہ میں بھی بعض اجزاء ہیں جو بہر حال حرام ہی ہیں مثلاً خون۔ اس طرح ذبیحہ حلال جانوروں کے حلال اجزاء سے علاج تو بہر حال درست اور جائز ہوگا ہی۔ حیوانات کی تین صنفوں کا مسئلہ رہ جاتا ہے۔ ایک وہ جن کا کھانا حلال نہیں۔ دوسرے وہ جن کا کھانا حلال ہے لیکن وہ مردار ہیں، تیسرے وہ حیوانی اجزاء جو بہر حال حرام ہی رہتے ہیں۔

حرام اشیاء سے علاج

انسانی اجزاء سے انتفاع پر گفتگو ہم بعد کو کریں گے۔ ابھی درج ذیل سوالات پر مجھے بحث کرنی ہے:

۱۔ نشہ آور اشیاء سے علاج درست ہے؟

۲۔ مسموم اشیاء سے علاج درست ہے؟

۳۔ حرام جانوروں، مردار اور حرام اجزاء حیوانی سے علاج درست ہے؟

۴۔ ان ادویہ کے خارجی استعمال اور دوا کی صورت میں کھانے میں کچھ فرق ہے یا نہیں؟

اور یہ تمام سوالات اس امر کے گرد گردش کرتے ہیں کہ آیا نجس اور حرام اشیاء سے علاج درست ہے یا نہیں؟

امام ابو حنیفہ کا قول مشہور یہی ہے کہ حرام اشیاء سے علاج درست نہیں۔ تکرہ البان الاتان للمریض وکذلك التداوی بکل حرام (۱) امام شافعیؒ نے عام محرمات سے تو علاج درست قرار دیا ہے لیکن شراب اور نشہ آور اشیاء سے علاج کرنے کو منع کیا ہے (۲) ان حضرات کی دلیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث ہے کہ: ان اللہ لم یجعل شفاءکم فی حرام۔ یہی رائے امام طحاوی کی بھی ہے (۳) مالکیہ، حنابلہ اور احناف میں امام ابو یوسفؒ نے مطلقاً تمام حرام اشیاء سے علاج کی اجازت دی ہے عالمگیری میں ہے:

یجوز للعلیل شرب الدم و البول واکل المیتۃ للتداوی اذا اخبرہ طبیب مسلم ان شفاءہ فیہ ولم یجد فی المباح یقوم مقامہ (۴)	بیمار کیلئے خون و پیشاب کا پینا اور مردار کا کھانا ازراہِ علاج جائز ہے بہ شرطیکہ کسی مسلمان طبیب نے اس میں شفایابی کی اطلاع دی ہو اور جائز چیزوں میں اس کا کوئی بدل موجود نہ ہو۔

❖ ❖ ❖ ❖

احناف کے ہاں فتویٰ اس بات پر معلوم ہوتا ہے کہ مسکرات کا بھی ضرورتاً استعمال درست ہے۔ چنانچہ حنفیہ نے ازراہِ علاج بھنگ کی اجازت دی ہے، بزازیہ میں شراب کے استعمال کی بھی اجازت دی گئی ہے خاف الهلاك عطشاً وعندہ خمر له شربه قدر ما يدفع العطش ان علم انه يدفعه (۵)

---

(۱) خانیہ علی الہندیہ /۵۳۔
(۲) کتاب الام ۲/۱۲۳۔
(۳) عمدۃ القاری ۱/۹۲۰۔
(۴) ہندیہ ۵/۲۵۵۔
(۵) بزازیہ علی ہامش الہندیہ ۶/۲۶۶۔

مولانا انور شاہ کشمیری کا خیال ہے کہ شاید امام صاحبؒ کے اصل مذہب میں بھی کچھ تفصیل ہے اور مطلقاً حرام سے علاج کی ممانعت نہیں ہے اس لئے کہ طحاویؒ نے امام صاحب سے سونے کے تاروں سے دانت باندھنے کی اجازت نقل کی ہے۔ خارش کی وجہ سے ریشمی کپڑوں کے استعمال کا جواز احناف میں معروف بات ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ صورتیں بھی حرام ہی سے علاج کی قبیل سے ہیں (۱)

رہ گئی وہ روایت کہ حرام میں شفاء نہیں ہے تو اس کی مختلف توجیہات کی گئی ہیں۔ ان میں یہ توجیہ بہت قوی ہے کہ یہ اس صورت میں ہے جب کہ مریض اس شیئ حرام کے استعمال پر مجبور اور مضطر نہ ہو بلکہ اس کا متبادل موجود ہو۔ عینی کے الفاظ میں "والجواب القاطع ان هذا محمول علی حالة الاختیار" دوسرے ممکن ہے کہ آپؐ نے ایسی اشیاء کے لئے "شفاء" کے لفظ کے استعمال کو مناسب نہیں سمجھا ہو کیوں کہ "شفاء" کا لفظ مبارک چیزوں کی بابت بولا جاتا ہے، ناجائز چیزوں سے جو فائدہ ہو اُسے "منفعت" کہنا چاہیئے، اسی لئے قرآن پاک نے شراب اور جوئے کے بارے میں فرمایا: اثمهما اکبر من نفعهما۔ (۲)

ناپاک اشیاء سے علاج

یہی حال ناپاک اشیاء کا ہے۔ قاضی ابو یوسف نے اونٹ کا پیشاب اور خون پینے کی اجازت دی ہے اگر علاج مقصود ہو (۳) فتاویٰ بزازیہ میں ہے کہ دواءً کبوتر کی بٹ کھانا جائز ہے "اکل خرء الحمام فی الدواء لابأس به (۴) از راہِ علاج

---

(۱) معارف السنن ۱/۳۷۹۔

(۲) حوالۂ سابق۔

(۳) نیز ملاحظہ ہو رد المحتار ۵/۲۱۶۔

(۴) بزازیہ علیٰ ہامش الہندیہ ۶/۳۶۵۔

انگلیوں میں پت داخل کر دینا بھی امام ابو یوسفؒ کے ہاں جائز ہے اور اسی پر فتویٰ ہے "اما ادخال المرارة فی الاصبع للتداوی جوزہ الثانی وعلیہ الفتوی"(۱) یہ فقہی تصریحات اس بات کو واضح کرنے کے لئے کافی ہے کہ ضرورت انسانی کی رعایت کرتے ہوئے فقہاء نے از راہِ علاج حرام ونجس اشیاء کے استعمال کی اجازت دی ہے، بشرطیکہ اس کا کوئی طبی متبادل موجود نہ ہو یا وہ اس متبادل کے استعمال پر کسی وجہ سے قادر نہ ہو کہ غیر مقدور فقہاء کے ہاں غیر موجود کے حکم میں ہوا کرتا ہے۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ دوسری ناپاک اشیاء کے مقابلے فقہاء نے "خنزیر" کے اجزاء استعمال کرنے میں زیادہ احتیاط کی راہ اختیار کی ہے اس لئے کہ خنزیر نجس العین ہے۔ بزازیہ میں ہے: "ویکرہ معالجۃ الجراحۃ بانسان اوخنزیر لانہما محرم الانتفاع (۲)" بعینہ یہی بات عالمگیری میں کہی گئی ہے (۳) میرا خیال ہے کہ خنزیر کے اجزاء کی ممانعت بھی اس وقت ہے جب کہ کوئی اور ذریعۂ علاج موجود ہو۔ کیوں کہ خنزیر اپنی حرمت اور نجاستِ عین کی وجہ سے مطلقاً ناقابلِ انتفاع ہے لیکن امام ابوحنیفہ ہی ہیں کہ چمڑے وغیرہ کی سلائی کے لئے خنزیر کے بال کے استعمال کو جائز رکھتے ہیں۔ اور فقہاء امام صاحبؒ کی اس رائے کو دلیل و مصالح شرعی کے لحاظ سے "اظہر" قرار دیتے ہیں (۴) پس صحتِ انسانی کی حفاظت اور نفس انسانی کی صیانت کے لئے بدرجۂ اولیٰ اجزائے خنزیر کے استعمال کی اجازت دینی ہوگی۔

پھر جن حضرات نے نجس وحرام اشیاء سے بدرجۂ ضرورت علاج کی اجازت دی ہے جہاں انسانی مصلحت اور شریعت کے عمومی قواعد و مقاصد ان کی تائید

---

(۱) بزازیہ علی ہامش الہندیہ ۶/ ۳۶۷۔

(۲) حوالۂ سابق ص: ۳۶۵۔

(۳) عالمگیری ۵/۳۵۴۔

(۴) عالمگیری ۵/۳۴۔

کرتے ہیں وہیں حدیثِ "عرینہ" جس میں آپؐ نے اونٹ کے پیشاب پینے کی اجازت دی بلکہ دوائً پینے کا حکم دیا(۱) ان کی رائے کو صراحۃً اور عبارۃً ثابت کرتی ہے — لہذا ناپاک وحرام اشیاء مسکر ہوں یا غیر مسکر، ضرورتاً ان کے ذریعہ علاج درست ہے۔

ایسی ادویہ جن میں زہریلے اجزاء ہوں اگر ان کے استعمال سے ہلاکت کا اندیشہ نہ ہو اور مریض کے لئے اس کا استعمال ناگزیر ہو تو ایسی ادویہ کے استعمال میں بھی کوئی مضائقہ نہیں (۲) اس لئے کہ ان ادویہ کے استعمال کی ممانعت تھی ہی اس لئے کہ وہ مہلک تھیں، اب جب کہ ان کا استعمال ہی انسانی زندگی کے تحفظ یا اس کی صحت کے بچاؤ کا ذریعہ ہے تو ضروری ہے کہ عین اسی مصلحتِ شرعی کی وجہ سے ان کے استعمال کو جائز رکھا جائے۔

انسانی خون کا چڑھانا

علاج کی چوتھی صورت یہ ہے کہ انسانی اعضاء و اجزاء سے علاج کیا جائے انسانی اعضاء سے علاج کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں، مردہ انسان کے اجزاء سے، زندہ انسان کے اجزاء سے، پھر یہ اجزاء یا تو سیّال ہوں گے یا ٹھوس شکل میں ہوں گے، سیال اجزاء سے مراد دودھ ہے جو پاک ہے، اسی طرح خون ہے جو ناپاک ہے، کتب فقہ میں اس کی صراحت موجود ہے کہ ازراہِ علاج مدتِ رضاعت ختم ہونے کے بعد بھی عورت کے دودھ سے استفادہ کیا جا سکتا ہے "لا بأس بان یسعط الرجل بلبن المرأۃ ویشربہ للدواء (۳)

دودھ پر قیاس کرتے ہوئے اکثر علماء نے ایک انسان کے جسم میں دوسرے

(۱) ترمذی ۱/۲۱، باب فی بول ما یؤکل لحمہ۔

(۲) دیکھئے: المغنی ۱/۳۰۱۔ (۳) عالمگیری ۵/۳۵۵۔

انسان کا خون چڑھانے کی اجازت دی ہے، دودھ اور خون میں یہ امر قدرِ مشترک ہے کہ یہ دونوں انسانی جسم سے اخراج کے بعد دوبارہ بہت جلد اپنی کمی پوری کر لیتے ہیں۔

مُردہ کے اعضاء سے استفادہ

رہ گئی دوسرے ٹھوس اعضاء کی پیوند کاری تو فقہی نظائر سے معلوم ہوتا ہے کہ مُردہ کے اعضاء سے پیوند کاری کو تو جائز ہونا ہی چاہیئے۔ اس لیئے کہ شوافع، بعض احناف، فقہاء مالکیہ میں ابن عربی اور حنابلہ میں ابو الخطاب نے مضطر شخص کو مُردہ کھانے کی اجازت دی ہے:۔ "قال الشافعی وبعض الحنفیۃ یباح وھو اولیٰ لان حرمۃ الحی اعظم واختار ابو الخطاب ان لہ اکلہ" (۱) یہی بات امام قرطبی نے لکھی ہے (۲) اور ابن عربی کی رائے ان الفاظ میں نقل کی ہے :۔ "الصحیح عندی ان لا یاکل الآدمی الا اذا تحقق ان ذلک ینجیہ ویحییہ" (۳)

زندہ انسانوں کے اعضاء کے استعمال کو عام طور پر فقہاء نے منع کیا ہے، یہ جزئیہ اکثر کتبِ فقہ میں موجود ہے کہ مکرہ (مجبور) کو کوئی شخص پیشکش کرے کہ تم مکرِہ (مجبور کرنے والے) کے منشاء کے مطابق مجھے قتل کر دو، یا میرے جسم میں سے کاٹ کھاؤ تو مجبور کے لیئے اس کو قتل کرنا یا اس کے کسی حصہ کو قطع کرنا جائز نہیں (۴) بلکہ بعض فقہاء نے مضطر کو اس بات سے بھی منع کیا ہے کہ خود اپنے جسم کا کوئی حصہ کاٹ کر کھا جائے (۵) لیکن غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ ممانعت اسلیئے تھی

---

(۱) المغنی ۳۳۵/۹۔

(۲) الجامع لاحکام القرآن ۲۲۹/۲۔

(۳) حوالۂ سابق۔

(۴) بدائع الصنائع ۱۷۷/۷۔

(۵) قاضی خاں علی الہندیہ /۴۰۴۔

کہ اس زمانہ میں جسم کے کسی حصہ کو کاٹنے اور نکالنے کا وہ محفوظ طریقہ وجود میں نہیں آیا تھا جیسا کہ آجکل ہے بلکہ اس طرح کے کاٹنے سے اس شخص کو ضرر شدید یا ہلاکت کا اندیشہ تھا چنانچہ مضطر اپنے جسم میں سے کوئی حصہ کاٹ کر خود کیوں نہیں کھا سکتا۔ ابن قدامہ اس پر ان الفاظ میں روشنی ڈالتے ہیں:۔

ولنا ان اکلہ من نفسہ ربما قتلہ فیکون قاتلاً بنفسہ ولا یتیقن حصول البقاء باکلہ۔ (۱)	ہماری دلیل یہ ہے کہ اس کا اپنے جسم میں سے کھانا اسکے لئے باعث ہلاکت ہوجائے گا، پس وہ خودکشی کرنے والا قرار پائے گا اور اس کے کھانے سے زندگی کے بچنے کا یقین نہیں۔

موجودہ زمانہ میں چوں کہ اس کے لئے محفوظ اور شائستہ طبی طریقہ وجود میں آچکا ہے اس لئے اس صورت کو بھی جائز ہونا چاہئے ۔ عام طور پر ان روایات سے غلط فہمی پیدا ہوتی ہے جن کے مطابق ایک عورت کو دوسرے عورت کے بال استعمال کرنے سے منع کیا گیا ہے، یا وہ فقہی عبارات جن میں ایک شخص کو اپنے ٹوٹے ہوئے دانت کی جگہ دوسرے انسانی دانت کے استعمال سے منع کیا گیا ہے حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے ۔کیوں کہ آرائش کے لئے دوسروں کے بال جوڑنا ضرورت نہیں، محض زینت ہے اور انسانی دانت کا استعمال ایسی چیز نہیں کہ اس کا متبادل نہیں ہو یا اس زمانہ میں اس کا متبادل موجود نہ رہا ہو، پیوندکاری کی موجودہ صورت میں ایک انسان کے لئے دوسرے انسان کا عضو شدید ضرورت اور جان کے بچاؤ کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اور اس وقت جب کہ اس کا کوئی متبادل موجود نہ ہو۔

---

(۱) المغنی ۹/۳۳۵۔

اعضاء انسانی کی خرید و فروخت

جہاں تک اعضاء کے خرید و فروخت کی بات ہے تو شریعت نے بعض مواقع پر انسانی وجود اور انسانی اعضاء کو متقوم (قابلِ قیمت) مانا ہے اور یہ اس وقت ہے جب کوئی انسان ہلاک کر دیا جائے یا اس کا کوئی عضو تلف کر دیا جائے اس کو اصطلاحِ شرع میں دیت کہتے ہیں۔ اس پر بھی اتفاق ہے کہ آزاد انسان کے پورے وجود کی خرید و فروخت نہیں ہوسکتی، انسانی جسم کے مختلف اجزاء بال اور دودھ یہی دو چیزیں تھیں، جن سے گذشتہ زمانہ میں انتفاع کیا جاتا تھا، بال جن کا استعمال عموماً آرائش و زیبائش کے لئے کیا جاتا تھا۔

فقہاء نے اس کی خرید و فروخت کو بھی منع کیا ہے اور وجہ یہ قرار دی ہے کہ یہ انسانی حرمت و کرامت کے مغائر ہے: "وشعر الانسان والانتفاع به ای لم تجز بیعه والانتفاع به لان الآدمی مکرم غیر مبتذل فلا یجوز ان یکون الشیئ من اجزاءه مهانا مبتذلا (۱)" علامہ شامیؒ نے بالوں کی طرح انسانی ناخنوں کی خرید و فروخت کو بھی منع کیا ہے: "وکذا بیع کل ما انفصل عن الآدمی کشعر وظفر لانه جزء الآدمی ولذا وجب دفنه (۲)" لیکن دودھ کی خرید و فروخت میں فقہاء کے اندر اختلاف ہے، احناف تکریم انسانیت کا پاس کرتے ہوئے منع کرتے ہیں "لم یجز بیع لبن المرأة لانه جزء الآدمی وهو بجمیع اجزاءه مکرم عن الابتذال بالبیع (۳)" جب کہ امام شافعی اس کو جائز قرار دیتے ہیں۔ سرخسی کا بیان ہے:

---

(۱) البحر الرائق ۶/۸۔ نیز ملاحظہ ہو ہندیہ ۳/۱۱۴۔

(۲) رد المختار ۵/۲۴۶۔

(۳) البحر الرائق ۶/۸۱، نیز عالمگیری ۳/۱۱۴۔

وقال الشافعي رحمه الله يجوز بيعه ويضمن متلفه لان هذا اللبن طاهر او مشروب طاهر كلبن الانعام ولانه غذاء للعالم فيجوز بيعه كسائر الاغذية۔ (۱)	اور امام شافعیؒ نے فرمایا کہ اس کی بیع جائز ہے اور اس کے تلف کرنے والے پر ضمان لازم ہوگا۔ اس لئے کہ یہ پاک دودھ یا مشروب ہے جانوروں کے دودھ کی طرح اور اس لئے کہ یہ اہل دنیا کی غذا ہے۔ پس اس کا فروخت کرنا بھی تمام غذاؤں کی طرح جائز ہوگا۔

✧ ✧ ✧ ✧

فقہائے حنابلہ کے درمیان گو اس مسئلہ میں اختلاف ہے لیکن حنبلی دبستانِ فقہ کے مشہور ترجمان ابن قدامہ کے نزدیک بھی ترجیح اسی کو ہے کہ عورت کے دودھ کی خرید و فروخت جائز ہے (۲)

لہٰذا احناف کے نزدیک بدرجۂ مجبوری صرف ایسے اعضاء کو خرید کرنا جائز ہوگا جیسا کہ فقہاء نے بوقتِ ضرورت رشوت دینے یا سودی قرض حاصل کرنے کی اجازت دی ہے لیکن شوافع اور حنابلہ کے نزدیک ایسے اعضاء کی خرید و فروخت دونوں درست ہوگی، اس سلسلہ میں ابن قدامہ کی یہ عبارت اور اس کا عموم قابلِ لحاظ ہیں کہ: وسائر اجزاء الآدمی یجوز بیعہا لان یجوز بیع العبد والامۃ (۳) آگے چل کر ابن قدامہ نے گو جسم سے تراشے گئے عضو کی خرید و فروخت کو حرام قرار دیا ہے مگر یہ اس لئے نہیں کہ انسانی اجزاء سے انتفاع جائز نہیں بلکہ اس لئے کہ اس وقت تک انسانی اعضاء سے انتفاع ممکن نہ ہو سکا تھا: "وحرم بیع العضو المقطوع لانہ لانفع فیہ" (۴)۔

---

(۱) المبسوط ۱۵/۱۲۵۔

(۲) المغنی ۴/۱۷۷۔

(۳) حوالۂ سابق۔

(۴) حوالۂ سابق۔

اَب جب کہ ایسا ممکن ہو چکا ہے، ابن قدامہ کی تشریح کے مطابق ایسے اعضاء کی خرید و فروخت بھی درست قرار پائے گی۔

پس حاصل یہ ہے کہ:

(۱) اعضاء انسانی کی پیوند کاری کیلئے سو طبی طریقہ ایجاد ہوا ہے اس میں توہینِ انسانیت نہیں ہے۔

(۲) اسلئے یہ جائز ہے بشرطیکہ اس کا مقصود کسی مریض کا جان بچانا یا کسی اہم جسمانی منفعت کو لوٹانا ہو، جیسے بینائی۔

(۳) اور طبیب حاذق نے بتایا ہو کہ اسکی وجہ سے صحت کا غالب گمان ہے۔

(۴) غیر مسلم کے اعضاء بھی مسلمان کے جسم میں لگائے جا سکتے ہیں۔

(۵) مردہ شخص کے جسم سے عضو لیا جا رہا ہو تو ضروری ہو گا کہ خود اس نے زندگی میں اجازت دی ہو، اسلئے کہ وہ جسم کا مالک ہے، نیز اس کے ورثاء کا بھی اس کے لئے راضی ہونا ضروری ہے۔

(۶) زندہ شخص کا عضو حاصل کیا جا رہا ہو تو ضروری ہو گا کہ خود اس نے اجازت دی ہو اور اس کی وجہ سے خود اس کو ضررِ شدید نہ ہو۔

(۷) اعضاء کی بینکنگ بھی درست ہے، شوافع اور حنابلہ کے یہاں اعضاء کی خرید و فروخت دونوں کی گنجائش ہے اور احناف کے نزدیک بدرجۂ مجبوری خرید کر سکتے ہیں لیکن فروخت نہیں کر سکتے[1]

ھذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو: "جدید فقہی مسائل حصہ دوم۔

چھٹا باب

لباس و پوشاک

خورد و نوش کے بعد سب سے بڑی انسانی ضرورت "لباس" ہے، جسم کی ستر پوشی انسانی فطرت میں ہے۔ رب کائنات نے جہاں انسان کو علم سے سرفراز کیا ہے، عقل و دانش سے حصہ دیا ہے، تدبیر امور کی صلاحیت دی ہے، وہیں اس کی فطرت و طبیعت میں "حیا" کا ایک خاص داعیہ رکھا ہے۔ یہ "حیا" گناہوں سے روکتی ہے، خدا کی معصیت و نافرمانی سے باز رکھتی ہے اور بے شرمی و بے حیائی کے لئے حجاب بنتی ہے، حیا کی دیوار اٹھ جائے تو پھر انسان اور حیوان کے درمیان کم امتیاز باقی رہ جاتا ہے، یہی حیا ہے کہ انسان کو جسم پوشی پر مجبور کرتی ہے۔ قرآن مجید نے حضرت آدم و حواء کے بارے میں کہا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان کے جنت سے نکالے جانے کا فیصلہ فرمایا تو مضطربانہ ان حضرات نے اپنے جسم کے قابلِ ستر حصے ڈھک لئے۔ (اعراف : ۲۲)

لباس ــــــ تقاضۂ فطرت

اسلام سے پہلے اس باب میں بھی انسانیت سخت پستی میں تھی، بعض مذاہب نے

لباس کو روحانی ترقی کے لیے رکاوٹ سمجھ لیا تھا اور نظافت و پاکیزگی ان کے نزدیک ایک خالص مادی اور دنیوی عمل تھا، خود عربوں کی شرم و حیا کا حال یہ تھا کہ کیا مرد اور کیا عورتیں سب بیت اللہ شریف کا برہنہ طواف کرتے (۱) قضاء حاجت کے وقت پوشیدہ جگہ کے انتخاب کو ایک عار کی بات سمجھا جاتا (۲)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانیت کو دوسری اخلاقی خوبیوں کے ساتھ ساتھ حیا و غیرت سے بہرہ ور فرمایا اور اسی نسبت سے "لباس" کے سلسلہ میں متوازن، فطرت سے ہم آہنگ، پاکیزہ اور مناسب ہدایات دیں۔

تہذیب جدیدہ کا ایک آوارہ نفس طبقہ لباس کو ایک مصنوعی اور غیر فطری عمل قرار دیتا ہے اور برہنگی کو انسانی فطرت کہ ہر انسان اپنی ماں کی کوکھ سے بے لباس ہی پیدا ہوتا ہے لیکن اسلام ستر و حجاب اور لباس کو فطرتِ سلیم کی آواز قرار دیتا ہے اسی لیے قرآن کا بیان ہے کہ جب پہلے دو انسان آدم و حوا کو ان کی بعض لغزشوں کی پاداش میں جنت کی نعمتوں سے محروم کیا گیا اور لباسِ جنت سے انہیں عاری کر دیا گیا تو جسم کے قابلِ ستر حصوں کو بے ساختہ انہوں نے چھپانے کی سعی کی (طٰہٰ: ۱۲۱) یہ کائنات کے پہلے مرد و زن کا ایک مضطربانہ عمل تھا جو انسانی فطرت اور اس کے تقاضہ کو نمایاں کرتا ہے ——————غور کرو کہ اول تو خدا نے جنین رحم کو بھی بے لباس نہیں رکھا۔ قدرت نے اس کے لیے ایک خاص قسم کا غلاف ماں کے پیٹ میں رکھا۔ جو گویا اس کا لباس ہے، فی ظلمات ثلاث (الزمر: ۶) پھر اس کا بے لباس پیدا ہونا اس بات کی دلیل نہیں کہ اسے لباس نہیں پہننا چاہیے، انسان دنیا میں اس حال میں آتا ہے کہ اس کی آنکھیں بند ہوتی ہیں، خون اس کی غذا ہوتا ہے اور ناف کے ذریعہ

---

(۱) حاشیہ بخاری بحوالہ مسلم عن ہشام عن ابیہ عروۃ ۱/۲۲۰۔
(۲) داؤد، باب الاستبراء من البول ار ۴۔

اس کے جسم تک پہنچتا ہے، زبان گویائی سے محروم ہوتی ہے، قوئ عقل محدود ہوتے ہیں بہت سی خواہشات ہیں کہ اس وقت وہ ان کا تصور بھی نہیں کرسکتا، پھر کیا اس کی بصارت، غذا، ناطقہ، عقل غیر محدود اور صنفی تقاضے یہ سب غیر فطری متصور ہوں گے؟

بنیادی اصول

لباس و پوشاک کے سلسلہ میں انسانی ذوق و مزاج میں خاصا فرق ہوتا ہے، سماجی حالات، مختلف علاقوں کی معاشرت اور تہذیب، موسم اور آب ہوا کا فرق، وسائل اور رسائل کی کمی بیشی، طبعی رجحانات و میلانات میں تفاوت یہ تمام اسباب ہیں جن کی وجہ سے لباس کی پسند و ناپسند میں فرق کا پایا جانا ایک فطری بات ہے۔ ایک مخصوص وقت کے لئے لباس میں یکسانیت برتی جاسکتی ہے، مگر ہمہ وقت زندگی کے لئے یکساں لباس (جس کا بعض کمیونسٹ ملکوں میں ناکام تجربہ بھی کیا گیا ہے) ایک غیر فطری عمل ہے کہ خود قدرت نے انسان کے لحم و استخواں پر پوست کا جو لباس پہنایا ہے وہ یکسانیت سے خالی اور گلہائے رنگا رنگ کا مصداق ہے، اسی لئے شریعت اسلامی میں انسان کے لئے لباس کی کوئی خاص وضع اور ساخت، کوئی خاص نوعیت اور کوئی خاص رنگت متعین نہیں کی گئی ہے اور اس کو لوگوں کے مذاق و مزاج کے سپرد کیا گیا ہے۔

ہاں البتہ اس کے ساتھ کچھ بنیادی اصول مقرر کردیئے ہیں، کچھ خاص حدیں قائم کردی ہیں کہ آدمی ان کے اندر رہتے ہوئے جس طرح کا بھی چاہے لباس استعمال کرے، ان میں سے پہلی ہدایت یہ ہے کہ لباس میں ستر اور جسم کو چھپانے اور ڈھکنے کا پورا پورا لحاظ رہے۔

ستر و حجاب کے احکام

ساتر لباس کی حد کیا ہے؟ اس کے لئے ضروری ہے کہ

ایک نظر ستر و حجاب کے احکام پر ڈال لی جائے۔

اس سلسلہ میں اصول یہ ہے کہ شوہر کے سامنے جسم کے کسی حصہ کا بھی ستر واجب نہیں، ہاں یہ ضرور ہے کہ بلا ضرورت جسم کے قابلِ حیا، حصّہ کو شوہر کے سامنے بھی کھولنا مناسب نہیں۔ دوسرا درجہ محرم رشتہ داروں کا ہے، ان کے سامنے قرآن مجید نے مواضع زینت کو کھولنے کی اجازت دی ہے، مواضعِ زینت سے مراد سر، چہرہ، سینہ، پنڈلی، گردن، ہاتھ پاؤں، بازو اور بال ہیں۔ (۱)

تیسرا درجہ غیر محرم رشتہ داروں سے پردہ کا ہے، ان کے سامنے چہرہ اور ہتھیلیاں کھولی جاسکتی ہیں۔ چنانچہ حضورؐ کا حضرت اسماء کو دیکھنا اور فتحِ مکہ کے موقعہ سے حضرت امِ ہانی کو دیکھنا ثابت ہے، کیوں کہ رشتہ داروں کی بکثرت آمد و رفت کی وجہ سے ان سے اجنبی کا سا پردہ مشکل ہے، عام طور پر فقہاء نے اجنبی اور غیر محرم رشتہ داروں میں کوئی فرق نہیں کیا ہے لیکن فتاویٰ بزازیہ میں ان دونوں میں فرق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے: والحکم بالفرق بین الاجنبی وذی الرحم اذا کان النظر لا عن شھوۃٍ فاما بالشھوۃ فلا یحل لاحدٍ النظر (۲)

چوتھا درجہ اجنبی لوگوں سے پردہ کا ہے۔ اس میں البتہ اختلاف ہے، عام فقہاء کے نزدیک اجنبی کے سامنے بلا ضرورت چہرہ اور ہاتھوں کا کھولنا بھی جائز نہیں، احناف کے یہاں جائز ہے۔ علامہ سرخسی اور کاسانی اور جصاصؒ نے اس پر تفصیل سے دلائل پیش کئے ہیں (۳) لیکن یہ اس وقت ہے جب کہ شہوت اور فتنہ کا اندیشہ نہ ہو، اگر شہوت اور فتنہ کا اندیشہ ہو جیسا کہ فی زمانہ اس کا مشاہدہ ہے تو پھر اجنبی سے مکمل پردہ ضروری ہے، چنانچہ علامہ حصکفی کا بیان ہے:

---

(۱) شامی ۲۳۵/۵، نیز احکام القرآن للجصاص ۱۷۴/۵

(۲) بزازیہ علی ہامش الہندیہ ۳۷۴/۶، کتاب الاستحسان۔

(۳) المبسوط ۱۵۲/۱۰، بدائع ۱۰۵/۵، احکام القرآن ۱۷۴/۵۔

فان خاف الشهوة اوشك امتنع نظرہ الی وجهها فحل النظر مقيد بعدم الشهوة والا فحرام وهذا فی زمانهم اما فی زماننا فمنع من الشابة۔ (۱)

اگر شہوت کا خوف یا شک ہو تو عورت کے چہرہ کو دیکھنا ممنوع ہے، پس عورت کو دیکھنے کی حلت شہوت نہ پائے جانے کی صورت کے ساتھ مقید ہے ورنہ تو حرام ہے، یہ حکم تو ان کے زمانہ میں تھا ہمارے زمانہ میں نوجوان لڑکی کو دیکھنے سے ہم مطلقاً منع کرتے ہیں۔

خود قرآن مجید کی جب یہ آیت نازل ہوئی یدنین من جلابیبھن (احزاب ـ ۵۹) تو بقول حضرت ام سلمہؓ انصاری خواتین نے ایسے سیاہ کپڑے پہن لیے کہ گویا ان کے سروں پر کوّے ہوں (۲) اس لیے کہ "جلباب" ایسے کپڑے کو کہتے ہیں جو پورے جسم کو ڈھک دے ماغطی جمیع الجسم۔

اَب ان تفصیلات کی روشنی میں عورتوں کے لباس کے یہ احکام متعین ہوئے کہ جب وہ گھر سے باہر نکلیں تو ایسا کپڑا پہنیں جو پورے جسم کو ڈھک دے اور بلا ضرورت چہرہ اور ہاتھ بھی کھلا نہ رکھے، ایسے گھر میں رہیں جہاں غیر محرموں کی آمد و رفت نہ ہو تو وہاں لباس ایسا ہو کہ صرف چہرہ اور ہاتھ کھلا رہے، محرم رشتہ داروں ہی کے درمیان رہنا ہو تو ستر کے مذکورہ احکام کے مطابق لباس کے احکام میں مزید وسعت ہے، مگر ظاہر ہے کہ اگر لباس کی ایسی مستقل وضع رکھی جائے جس میں جسم کے بعض ایسے حصے کھلے ہوں جو محرم کے سامنے ہی کھولے جا سکتے ہوں تو احتیاط مشکل ہو گی مثلاً کپڑے کی وضع ہی ایسی ہو کہ بازو کھلے ہوئے ہوں تو قوی امکان ہے کہ کبھی غیر محرموں کا سامنا بھی ہو جائے اور بروقت ستر نہ ہو سکے۔ اس لیے ایسی وضع کے لباس سے پرہیز ہی کرنا چاہیے، یہ بھی واضح رہے کہ پشت اور پیٹ کا حصہ محرم کے سامنے بھی کھولنا جائز نہیں، اس لیے آج کل جس قسم کے

---

(۱) دُر مختار ۲/۲۶۱۔

(۲) احکام القرآن للجصاص ۵/۲۴۵۵۔

بلاؤز مروج ہوئے ہیں وہ پردہ کی ضرورت کو پورا نہیں کرتے اور سخت معصیت وگناہ کا باعث ہیں۔

مَردوں کے لئے ناف سے لیکر گھٹنوں تک کا حصہ قابلِ ستر ہے، ناف ستر میں داخل نہیں اور گھٹنا ستر میں داخل ہے۔ امام شافعی کے نزدیک گھٹنا بھی ستر میں داخل ہے، مردوں کے لباس میں اس امر کی رعایت ضروری ہے کہ یہ حصے ڈھکے ہوئے ہوں، لباس کو اتنا چست بھی نہ ہونا چاہیئے جس سے قابلِ ستر اعضاء کی ساخت نمایاں ہو جائے، اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ونساء کاسیات عاریات مسیلات مائلات رؤسھن کاسنمة البخت المائلة لاید خلن الجنة۔ (۱)	ایسی عورتیں ہیں جو کپڑا پہننے کے باوجود ننگی ہیں دوسروں کو اپنی طرف مائل کرنے والی ہیں اور خود بھی مائل ہونے والی ہیں، ان کے سر اونٹ کے کوہان کی طرح جھکے ہوئے ہیں، یہ جنت میں داخل نہ ہونگی۔

ریشمی کپڑے

لباس کے سلسلہ میں دوسری تحدید یہ ہے کہ اسلام میں مردوں کے لئے ریشم کے استعمال کو منع کیا گیا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سونا اور ریشم میری امت کی خواتین کے لئے حلال ہیں اور مردوں کے لئے حرام (۲) ایک اور روایت میں ہے کہ جو شخص دنیا میں ریشمی لباس پہنے، آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں (۳) اسلئے اصولی طور پر فقہاء اس امر پر متفق ہیں کہ مَردوں کے لئے ریشمی لباس کا استعمال جائز نہیں البتہ اس کی تفصیل میں معمولی نوعیت کا اختلاف بھی ہے، اس لئے پہلے فقہاء

---

(۱) مسلم شریف ۲/۲۰۵، باب النساء کاسیات عاریات۔
(۲) ترمذی۔
(۳) بخاری عن ابن عمر۔

احناف کے مسلک پر قاضی خاں، حصکفی اور شامی وغیرہ نے جو کچھ لکھا ہے، اس کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے، پھر جن نکات میں دوسرے فقہاء کا اختلاف ہے ان کی طرف اشارہ کردیا جائے گا۔

ریشم کی تھوڑی مقدار جائز ہے، زیادہ مقدار جائز نہیں اور تھوڑی مقدار سے مراد لمبائی اور چوڑائی میں چار انگل ہے، صحیح تر قول کے مطابق ایک جگہ اتنی مقدار ریشم کا استعمال مکروہ ہوگا، اگر متفرق جگہ ریشم کا استعمال ہو لیکن کسی ایک جگہ اتنی مقدار نہ ہو تو مضائقہ نہیں (۱)۔ اس لئے کہ حضرت عمرؓ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دو تین چار انگلی ریشم کی اجازت دی ہے الا موضع اصبعین او ثلاث او اربع (۲) نیز یہ بھی مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسا جبہ بھی استعمال فرمایا ہے جس کے کنارے ریشمی کپڑے سے سلے ہوئے تھے (۳)

اگر ریشمی کپڑا جسم کے اندرونی اور بالائی کپڑے کے درمیان ہو جس کو "حشو" کہا جاتا ہے تو ایسے کپڑے کا پہننا جائز ہے (۴)

کپڑے پر ریشم کی دھاری کو بعض فقہاء نے مطلقاً جائز قرار دیا ہے اور یہی زیادہ صحیح ہے۔ شامی نے سرخسی سے نقل کیا ہے "لا بأس بالعلم فی الثوب لأنه تبع" نیز یہ بھی نقل کیا ہے کہ اس کے لئے کسی مقدار کی تعیین نہیں (۵)

امام صاحب سے یہ بھی منقول ہے کہ ریشمی کپڑے کی حرمت اس وقت ہے جبکہ وہ جسم سے مس کر رہا ہو لیکن فتویٰ اس بات پر ہے کہ اوپر کا کپڑا اگرچہ ریشمی ہو اور استر

---

(۱) ردالمحتار ۵/۲۲۴۔

(۲) مسلم۔

(۳) بخاری۔

(۴) ردالمحتار ۵/۲۲۴۔

(۵) حوالۂ سابق ۵/۲۲۵۔

کپڑے اور جسم کے درمیان حائل ہو پھر بھی حرام ہوگا (۱) امام ابو یوسف اور امام محمدؒ کے نزدیک جنگ میں ریشمی کپڑے کا استعمال جائز ہے۔ امام ابو حنیفہ کے نزدیک جائز نہیں (۲)۔

جس کپڑے کا تانا ریشم نہ ہو اور بانا ریشم ہو۔ امام ابو حنیفہ کے یہاں مطلقاً اس کا استعمال جائز ہے (۳)

امام ابو حنیفہ کے نزدیک ریشمی بستر، فرش، تکیہ اور پردے وغیرہ کا استعمال جائز ہے۔ امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک جائز نہیں، غالباً صاحبین کی رائے زیادہ صحیح ہے، کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے حریر و دیباج کے کپڑے پہننے اور اس پر بیٹھنے دونوں سے منع فرمایا (۴)

نابالغ بچوں کو ریشمی کپڑا پہنانا جائز نہیں اور پہنانے والا گنہگار ہوگا (۵)

کپڑے کا رنگ

شریعت نے لوگوں کے ذوق و مزاج کی رعایت کرتے ہوئے کپڑے میں کسی خاص رنگ کی تحدید نہیں کی ہے، اس لئے فقہاء لکھتے ہیں ولا بأس بسائر الالوان (۶)

تاہم احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ سفید رنگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو زیادہ پسند تھا۔ ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا: سفید کپڑے پہنا کرو کہ یہ تمہارے کپڑوں میں سب سے بہتر ہے اور اسی میں مردہ کو کفن دیا کرو (۷) اسی مضمون کی

---

(۱) در علی ہامش الرد ۵/۲۲۴۔
(۲) قاضی خاں علی الہندیہ ۳/۴۱۲۔
(۳) حوالۂ سابق۔
(۴) بخاری
(۵) قاضی خاں علی الہندیہ ۳/۴۱۲۔
(۶) در علی الرد ۵/۲۲۸۔
(۷) ابوداؤد، ترمذی وقال ہذا حدیث حسن صحیح۔

روایت حضرت حسن سے بھی منقول ہے (۱) خود حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عام معمول سفید کپڑے کا استعمال ہی معلوم ہوتا ہے (۲) اسی لئے فقہاء نے بھی سفید لباس کو مستحب قرار دیا ہے ویستحب الابیض (۳)۔ سفید کے بعد آپؐ کا پسندیدہ رنگ سیاہ تھا۔ فتح مکہ کے دن جب آپ مکہ میں داخل ہوئے تو یہی سیاہ عمامہ سرِ مبارک پر زیبِ تن تھا۔ (۴) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ام خالد بنت خالد کو بھی ایک سیاہ لباس تحفۃً عطا فرمایا تھا، اسی لئے فقہاء سیاہ رنگ کے لباس کو بھی مستحب قرار دیتے ہیں (۵)
البتہ میت پر اظہارِ غم کے لئے سیاہ لباس کا استعمال جائز نہیں۔ ولایجوز صبغ الثیاب الاسود او اکھب تأسفاً علی المیت (۶) ——— راقم سطور کا خیال ہے کہ ایسے شہروں میں جہاں روافض کی آبادی ہو، ماہِ محرم میں سیاہ لباس کا استعمال مناسب نہیں کہ اس میں روافض سے تشبّہ ہے جو اظہار افسوس کے لئے سیاہ لباس کا استعمال کرتے ہیں ——— واللہ اعلمؒ۔

ابوداؤد نے حضرت رِمثہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے جسدِ اقدسؐ پر دو سبز چادریں دیکھیں (۷) اسی لئے فقہاء سبز لباس کے استعمال کو بھی مسنون قرار دیتے ہیں ولبس الاخضر سنۃ (۸)

البتہ سرخ لباس کے استعمال کا مسئلہ مختلف فیہ ہے۔ بعض روایات سے سُرخ

---

(۱) رواہ البزار ورجالہ ثقات باب فی البیاض، مجمع الزوائد ۵/۱۲۸۔
(۲) دیکھئے صحیح بخاری باب ثیاب البیض کتاب اللباس مع الفتح ۲/۸۲ — ۲۸۲۔
(۳) فصل فی اللبس، شامی ۵/۲۲۳۔
(۴) ترمذی کتاب اللباس باب ماجاء فی العمامۃ السوداء ۴/۲۲۵ مع تحقیق احمد محمد شاکر۔
(۵) باب القمیصۃ السوداء مع الفتح ۱۰/۲۷۹ کتاب اللباس۔
(۶) عالمگیری ۵/۳۳۰ الباب التاسع فی مایکرہ ذلک ومالایکرہ۔
(۷) فتح الباری ۱۰/۲۷۲ کتاب اللباس۔
(۸) ردالمحتار ۵/۲۲۳ باب فی اللبس۔

لباس کے استعمال کی ممانعت معلوم ہوتی ہے لیکن ان میں سے کوئی بھی روایت ایسی نہیں جو درجۂ صحت کو پہنچتی ہو۔ اس کے مقابلہ میں وہ روایات ہیں جو سُرخ رنگ کے استعمال کے جواز کو بتلاتی ہیں۔ چنانچہ حضرت برار بن عازب سے مروی ہے کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سرخ حلہ میں ملبوس دیکھا (۱) اسی وجہ سے شارحین نے اس مسئلہ میں فقہاء و محدثین کے آٹھ اقوال نقل کئے ہیں۔ مالکیہ، شوافع اور اکثر لوگوں سے اس رنگ کا جواز منقول ہے (۲) احناف کا قول مختلف ہے، بعضوں نے مکروہ تحریمی اور بعضوں نے مکروہ تنزیہی قرار دیا ہے کہ امام ابوحنیفہ بھی اس کو مباح قرار دیتے تھے اور بقولِ شامی کراہت اس وقت ہے جب عورتوں سے یا عجمیوں سے تشبہ مقصود ہو یا ازراہِ تکبر اس کا استعمال کرے (۳) تاہم راقم سطور کو اس سلسلہ میں طبری کا قول بہت صحیح معلوم ہوتا ہے جسے ابن حجر نے نقل کیا ہے:

الذی اراہ جواز لبس الثیاب المصبغۃ بکل لون الا انی لا احب لبس ماکان مشبعا بالحمرۃ ولا لبس الاحمر مطلقا ظاھراً فوق الثیاب لکونہ لیس من لباس اھل المروءۃ فی زماننا فان مراعاۃ زی الزمان من المروءۃ مالم یکن اثماً۔ (۴)	ہر رنگ میں رنگے ہوئے کپڑوں کے پہننے کے جواز کا قائل ہوں، ہاں نہ مکمل سرخ کپڑے کا اور نہ اوپری کپڑے میں مطلقاً سرخ رنگ کا کہ یہ ہمارے زمانہ میں اہلِ وقار کا لباس نہیں اور جب تک گناہ کے دائرہ میں نہ آتا ہو وقت کے اصحابِ مروت لوگوں کی وضع اختیار کرنی چاہیے۔

مردوں کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن رنگوں کو ممنوع قرار دیا ہے

---

(۱) بخاری باب الثوب الاحمر کتاب اللباس۔

(۲) سُرخ رنگ کے بارے میں تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو فتح الباری ۱۰/۳۰۴-۳۰۶، تحفۃ الاحوذی ۲/۴۲-۴۳۔

(۳) دیکھئے شامی ۵/۲۲۸۔

(۴) فتح الباری ۱۰/۳۰۶۔

ان میں ایک معصفر کپڑا ہے (۱)۔ فقہاء کا عام رجحان یہی ہے کہ مردوں کے لیے "معصفر" زعفرانی اور زرد کپڑے کا استعمال ممنوع ہے۔ وکرہ المعصفر والمزعفر الاحمر والاصفر للرجال (۲) امام شافعیؒ سے منقول ہے کہ وہ زعفرانی کپڑے تو منع کرتے تھے لیکن معصفر لباس کو جائز قرار دیتے تھے، نووی نے لکھا ہے کہ امام شافعیؒ کا یہ قول اسلئے ہے کہ لباس معصفر سے ممانعت کی حدیثیں آپ تک نہیں پہونچ پائی تھیں، اگر امام شافعیؒ تک یہ حدیث پہنچ گئی ہوتی تو وہ بھی اس کو ضرور منع کرتے ولو بلغ بہ الشافعی قال بہ انشاء اللہ (۳)۔

اغیار سے تشبہ

لباس اور وضع قطع کے سلسلہ میں شریعت کا اہم قاعدہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو کفار، مردوں کو عورتوں اور عورتوں کو مردوں کے تشبہ سے منع کیا گیا ہے۔ حدیث میں ہے کہ من تشبہ بقوم فھو منھم (۴) جس نے کسی قوم کی مشابہت اختیار کی وہ انہی میں سے ہے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ جو دوسروں سے مشابہ ہو وہ ہم سے نہیں، اس لئے یہود و نصاریٰ کا تشبہ اختیار نہ کرو (۵) ایک روایت میں آپؐ نے عورتوں کا تشبہ اختیار کرنے والے مردوں اور مردوں کا تشبہ اختیار کرنے والی عورتوں پر لعنت بھیجی ہے (۶)۔

ایک طرف ان روایات میں تشبہ سے منع کیا گیا ہے، دوسری طرف یہ بھی

---

(۱) دیکھئے نیل الاوطار ۱/۲۸۹ تا ۲۹۱۔

(۲) درعلی ہامش الرد ۵/۲۲۸۔

(۳) شرح مہذب ۴/۴۵۰۔

(۴) ابوداؤد عن ابن عمر باب فی لبس الشہرۃ ۲/۵۵۹، کتاب اللباس۔

(۵) ترمذی عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ باب ما جاء فی کراہیۃ اشارۃ الید فی السلام ۲/۹۹۔

(۶) بخاری عن ابن عباس باب المتشبہین بالنساء والمتشبہات بالرجال، کتاب اللباس ۲/۸۷۴۔

ایک حقیقت ہے کہ ایک قوم کا دوسری قوم سے ہر چھوٹی بڑی بات میں ممتاز ہونا اور تشبہ سے مکمل طور پر مجتنب ہونا عادتاً ممکن نہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ تشبہ کی ایسی حدیں مقرر کی جائیں جن کے ذریعہ احکام متعین کئے جاسکیں کہ کن امور میں اور کس درجہ کا تشبہ ناجائز ہے؟ —————— ان میں ظاہر ہے کہ تشبہ کی سب سے بدترین قسم وہ ہے جو دینی اور مذہبی شعائر میں ہو، یہ بہر طور حرام ہے مثلاً ہندوؤں کی طرح قشقہ لگانا، سکھوں کی طرح ہاتھ میں بالے پہننا یا مخصوص انداز کی پگڑی باندھنا، عیسائیوں کی طرح سینے پر صلیب لٹکانا یا اس کے متبادل ٹائی کا استعمال کرنا، برہمنوں کی طرح زنار پہننا وغیرہ —————— اور شریعت میں اس کی دلیلیں اس کثرت سے ہیں کہ محتاجِ بیان نہیں، یہودیوں اور عیسائیوں کے طریقہ سے ہٹ کر نماز کے لئے اذان کی مشروعیت، ان اوقات میں نماز کی کراہت جو بت پرست اور آفتاب پرست قوموں کی عبادت کے ہیں، یومِ عاشوراء میں ایک روزہ کے اضافہ کی تلقین کہ یہود سے تشبہ نہ ہو اور اس طرح کے دوسرے احکام خود اسی اصل پر مبنی ہیں کہ مذہبی شعائر اور عبادات میں وہ دوسروں سے ممتاز رہیں۔ ملا علی قاری کا خیال ہے کہ جس تشبہ سے منع کیا گیا ہے اس کا تعلق ہے ہی شعائر سے تلت بل الشعار ھو المراد بالتشبہ لا غیر (۱)

جہاں تک معاشرتی اور سماجی زندگی اور باہمی تعلقات کی بات ہے اس میں بھی اسلام کا منشا ہے کہ مسلمان اپنے طور و طریق سے ممتاز رہیں، مثلاً سلام میں یہودیوں اور عیسائیوں کے تشبہ سے رد کا گیا —————— پس ایسی چیزیں کہ جن کے لئے شریعت نے خود اس کے لئے اپنے اصول و قواعد ذکر کر دیئے ہیں جیسے کھانا پینا، داڑھی مونچھ، آدابِ ملاقات، ان امور میں اسلامی طریقے کو نظر انداز کر کے کسی خاص قوم کی وضع کو اختیار کر لینا مکروہ ہوگا۔

---

(۱) حاشیہ ابوداؤد ۲/۵۵۹ بحوالہ مرقاۃ۔

جہاں تک لباس کی بات ہے، لباس کے احکام میں چند خاص قیود و حدود کے ساتھ شریعت نے فراخی رکھی ہے، ان حدود میں ایک یہ بھی ہے کہ لباس ایسا نہ ہو کہ دوسری قوموں سے تشبہ نمایاں ہو، لہذا جب تک کوئی لباس کسی دوسری قوم کی طرف اس طرح منسوب ہو کہ دیکھتے ہی یہ خیال ہو کہ فلاں قوم کا شخص ہے، اسی وقت تک اس میں تشبہ رہتا ہے۔ ہندوستان کے ماضی قریب کے علماء کے فتاویٰ سے بھی اسکا اندازہ ہوتا ہے، مفتی کفایت اللہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

"مگر تشبہ کا حکم اسی صورت میں ہوتا ہے کہ دیکھنے والا اسے دیکھ کر اس شبہ میں پڑ جائے کہ یہ شخص اس قوم کا فرد ہے، مثلاً ہیٹ لگانیوالے کو کرسٹان سمجھا جائے" (۱)

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

"من تشبہ بقومٍ فھو منھم سے مراد یہ ہے کہ کسی قوم کی ایسی چیز میں مشابہت اختیار کی جائے جو اس قوم کے ساتھ مخصوص ہو یا اس کا خاص شعار ہو تو ایسی مشابہت ناجائز ہے" (۲)

اسی اصول پر مسلم خواتین کیلئے ساڑی کے استعمال کے بارے میں فرماتے ہیں:

"جہاں مسلمان عورتوں کے اپنے لباس میں ساڑی داخل ہو وہاں جائز ہے اور جہاں مسلمانوں میں ساڑی مروج نہ ہو صرف غیر مسلم عورتوں کے لباس میں داخل ہوں وہاں مکروہ ہے" (۳)۔

مولانا تھانوی بھی لندن میں انگریزی لباس کے استعمال کے سلسلہ میں جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

---

(۱) کفایت المفتی ۱۵۹/۹ جواب ۱۹۶۔
(۲) حوالہ سابق ۱۶۰/۹ جواب ۲۰۹
(۳) حوالہ سابق ۱۶۱/۹ جواب ۲۱۱

"میں اس باب میں یہ سمجھے ہوا ہوں کہ جس جگہ یہ لباس قومی ہے جیسے ہندوستان میں وہاں اس کا پہننا مَن تشبَّہ بِقومٍ فھو منھم میں داخل ہوتا ہے اور جہاں ملکی ہے جس کی علامت یہ ہے کہ وہاں سب قومیں اور سب مذاہب کے لوگ ایک ہی لباس پہنتے ہیں وہاں پہننا کچھ حرج نہیں (۱)"

واقعہ ہے کہ تشبہ کے مسئلہ میں ان بزرگوں کی رائے نہایت متوازن اور شریعت کے مزاج و مذاق سے قریب ہے کہ جب تک کوئی لباس کسی خاص قوم کے ساتھ یا فاسق و بددین لوگوں کے ساتھ مخصوص ہو، تشبہ مکروہ ہوگا اور جوں جوں اس لباس میں عموم پیدا ہوتا جائے گا، کراہت کم ہوتی جائے گی۔ یہاں تک کہ جب لباس کی کوئی وضع عام ہو جائے اور اسے دیکھ کر یہ شبہ نہ ہوتا ہو کہ یہ فلاں قوم کا آدمی ہے تو اب اس لباس کا پہننا تشبّہ کی بنا پر مکروہ نہیں ہوگا ——— فی زمانہ کوٹ، پینٹ، ساڑی یا اس طرح کے بعض مردانہ اور زنانہ ملبوسات اسی زمرہ میں آتے ہیں۔

اسی طرح مردوں اور عورتوں کو ایک دوسرے سے تشبّہ سے منع کیا گیا ہے وہ بھی ایسے لباس میں ہے جن کو دیکھ کر عورتوں کے مرد یا مرد کے عورت ہونے کا گمان ہوتا ہو، اس کا اندازہ شارحینِ حدیث کی ان عبارتوں سے ہوتا ہے جو مرد و عورت کے باہم تشبہ کے بارے میں ہے مثلاً علامہ عینی لکھتے ہیں:

وتشبہ الرجال بالنساء فی اللباس والزینۃ التی تختص بالنساء مثل لبس المقانع والقلائد والمخانق والاسورۃ والخلاخل والقرط ونحو ذلك مما لیس للرجال لبسہ وتشبہ النساء بالرجالِ	مردوں کا عورتوں کا تشبہ اختیار کرنا یہ ہے کہ عورتوں کا لباس اور ان کے لئے مخصوص زینت و آرائش کا استعمال ہو مثلاً ہار، کنگن، پازیب، آئرنگ وغیرہ کا پہننا جو مردوں کیلئے پہننا روا نہیں۔ عورتوں کے مردوں سے تشبہ سے

---

(۱) امداد الفتاویٰ ۴/۲۶۸ سوال ۳۴۵۔

مثل لبس النعال الرقاق والمشی بھا فی محافل الرجال ولبس الاردیۃ والطیالسۃ والعمائم ونحو ذلك مما لیس لھن استعمالہ (۱)	مراد مثلاً باریک جوتے پہن کر مردوں کی محفلوں میں چلنا اور رومال وعمامہ وغیرہ کا استعمال ہے جو ان (عورتوں) کا لباس نہیں۔

اسی طرح ایسا بھی ممکن ہے کہ بعض علاقوں میں عورتوں اور مردوں کے لباس کی وضع میں کافی یکسانیت پائی جاتی ہے تو ایسی صورت میں ان کے لباس میں یہ تشبہ کراہت کے دائرہ میں نہیں آئے گی، حافظ ابن حجر علامہ طبری سے نقل کرتے ہیں:

فاما ھیئۃ اللباس فتختلف باختلاف عادۃ کل بلد، فرب قوم لا یفترق زی نسائھم من رجالھم فی اللبس، لکن یمتاز النساء بالاحتجاب والاستتار (۲)	لباس کی وضع ہر علاقے کے رواج کے مطابق مختلف ہوسکتی ہے، بعض اقوام میں مردوں اور خواتین کے لباس کی وضع میں کوئی امتیاز نہیں ہوتا، عورتیں پردہ وحجاب سے ممتاز ہوتی ہیں۔

فقہاء کی عبارتوں سے بھی یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ انہوں نے لباس میں تشبہ کو معمولی درجہ کا تشبہ سمجھا ہے اور اگر صاحب لباس نیت کے اعتبار سے مخلص ہو تو لباس کے ظاہری تشبہ کو قابلِ عفو سمجھا ہے، چنانچہ شامی نے تشبہ فی اللباس کے بارے میں لکھا ہے: تزول الکراھۃ باخلاص النیۃ لاظھار نعمۃ اللہ تعالیٰ (۳)

پس حاصل یہ ہے کہ مسلمانوں کو اپنے لباس میں ممکن حد تک غیر مسلموں اور فاسق وفاجر کی مخصوص وضع سے احتراز کرنا چاہیے، نیز مرد وعورت کے لباس اور ان کی وضع قطع میں بھی امتیاز باقی رہنا چاہیے، نیز اپنے زمانہ کے صالحین اور دیندار لوگوں کی وضع اپنانی چاہیے ________ وباللہ التوفیق۔

---

(۱) عینی علی البخاری ۲۲/۴۱ باب المتشبھون بالنساء الخ۔

(۲) فتح الباری ۱۰/۴۰۸ باب المتشبھون بالنساء والمتشبھات بالرجال۔

(۳) شامی ۵/۲۲۸۔

ٹخنہ سے نیچے کپڑے

اسلام چاہتا ہے کہ انسان کا ہر عمل بندگی اور تواضع کا مظہر ہو، تواضع سے زیادہ کوئی وصف نہیں جو خدا کے نزدیک محبوب ہو اور کبر و ترفع سے زیادہ کوئی امر خدا کو مبغوض نہیں۔ شریعت نے یہی مزاج لباس و پوشاک کے باب میں بھی برتا ہے، اسلام سے پہلے شاہانِ مملکت اور رؤسار و سرداران اپنے لباس زمین تک لٹکتے ہوئے رکھتے تھے اور اس کے ذریعہ اپنی بڑائی کا اظہار کرتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا۔ خود آپؐ کا معمولِ مبارک نصف پنڈلی تک تہبند رکھنے کا تھا، جو لوگ اس سے زیادہ رکھنا چاہیں تو ٹخنوں سے اوپر رکھنے کی اجازت دی (۱)، حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ جو کپڑا ٹخنوں سے بھی نیچے ہو جائے وہ حصہ جہنم میں ہے، ما اسفل من الکعبین من الازار ففی النار (۲) اس لئے ایسی قمیص یا پاجامہ یا تہبند کا استعمال جو ٹخنوں سے نیچے چلا جائے سخت مکروہ اور شریعت کی نگاہ میں ناپسندیدہ ہے۔

عمدہ لباس

عمدہ لباس کے استعمال میں مضائقہ نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کے جسم پر معمولی لباس دیکھا تو فرمایا اذا انعم اللہ علی عبدٍ احب ان یری اثر نعمتہ علیہ (۳) یعنی جب اللہ تعالیٰ اپنی نعمت عطا فرماتا ہے تو چاہتا ہے کہ بندہ پر اس کا اثر دیکھے۔ خود آپؐ کا عام معمول جہاں سادہ اور موٹا لباس پہننے کا تھا وہیں بعض دفعہ عمدہ لباس بھی استعمال کرتے تھے۔ ایک بار حضرت سعد نے ایک کپڑا خدمت میں ہدیہ کیا، آپؐ نے اسے زیبِ تن فرمایا، کپڑا اس قدر عمدہ تھا کہ صحابہؓ

---

(۱) ترمذی، باب فی مبلغ اللباس، کتاب اللباس ۴/۲۴۷۔

(۲) بخاری، کتاب اللباس، باب ما اسفل من الکعبین فہو فی النار۔

(۳) مشکوٰۃ، کتاب اللباس ص: ۳۷۷۔

اسے چھونے لگے۔ آپؐ نے فرمایا کہ سعد کے رومال جنت میں اس سے بڑھ کر ہونگے(۱) نقل کیا گیا ہے کہ آپؐ نے بعض دفعہ...... ایک ہزار اور بعض دفعہ چار سو درہم کی چادر استعمال فرمائی ہے(۲) امام ابوحنیفہؒ نے "سنجاب" کے کپڑے استعمال کئے ہیں(۳) بعض اوقات آپؐ نے چار سو دینار کی چادر استعمال کی ہے(۴) ہاں یہ ضرور ہے کہ لباس کی عمدگی اسے کبر و ترفع میں مبتلا نہ کر دے۔ اور اس لباس سے پہلے جو اس کی کیفیت تھی اس لباس کے استعمال کے بعد اس میں تغیر نہ ہو جائے لبس الثیاب الجمیلة مباح اذا کان لایتکبر بھا(۵) غرض اس میں بھی اعتدال رہے، نہ تقشف و رہبانیت اور نہ اسراف و نمائش۔

سر پر رومال

عمامہ یا سر کے اوپر کوئی رومال ڈال لینا جو چہرہ تک آجاتا ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔ سیدنا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ہجرت والی روایت میں آنحضرت کی تشریف آوری کی جو کیفیت نقل کی گئی ہے وہ یہی تھی (۶) حضرت انسؓ کی ایک روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمامہ کے اوپر رومال باندھنے کا بھی ذکر ہے عصب النبی صلی اللہ علیہ وسلم علیٰ رأسہ حاشیة برد(۷) ابن حجر نے "عصابة" اور "تقنع" کا فرق ان الفاظ میں نقل کیا ہے فالتقنع تغطیة الرأس

---

(۱) بخاری باب قبول الہدیة من المشرکین ۱/۳۵۶۔

(۲) ہندیہ ۵/۳۳۳۔

(۳) غیاثیہ ۱۰۹۔

(۴) ہندیہ ۳۳۳۔

(۵) غیاثیہ ۱۰۹۔

(۶) متقنعاً بخاری کتاب اللباس باب التقنع۔

(۷) بخاری باب مذکور۔

والعصابة شد الخرقة علیٰ ما احاط بالعمامة (۱) اسی طرح گرمی سے بچنے کے لئے بھی آپؐ کا روئے مبارک پر اونی یا سوتی رومال کا استعمال ثابت ہے جس کو حدیث میں "خمیصة" سے تعبیر کیا گیا ہے (۲)

عمامہ مبارک

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عام معمول مبارک عمامہ باندھنے کا تھا۔ آپ کے ایک عمامہ کا نام سحابؓ تھا جو آپؐ نے حضرت علیؓ کو باندھا تھا، کبھی صرف عمامہ باندھتے، کبھی ٹوپی کے اوپر باندھتے، بعض دفعہ صرف ٹوپی پہننا بھی ثابت ہے (۳) روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتداءً آپ نے تنہا عمامہ یا ٹوپی کے استعمال کو ناپسند فرمایا تھا اور مسلمان اور غیر مسلموں کے درمیان امتیاز قائم رکھنے کی غرض سے دونوں کے اجتماع کا حکم فرمایا تھا (۴) بعد کو جب تمام عرب مسلمان ہوگیا تو آپؐ نے دونوں طرح استعمال کی اجازت مرحمت فرمادی

عمامہ کے ساتھ بہتر یہ ہے کہ اس کا چھوڑ دونوں مونڈھوں کے درمیان پشت کے وسطی حصہ تک چھوڑ دیا جائے (۵) اکثر روایتوں میں حضورؐ کا عمل اسی طرح منقول ہے (۶) بعض روایتوں میں دائیں جانب کان کی طرف چھوڑ رکھنے کا ذکر بھی آیا ہے (۷)۔ بعض حدیثوں میں آپ کے عمامہ کے دو چھوڑ کا ذکر ہے، ایک آگے اور ایک پیچھے، اخ ا

---

(۱) فتح الباری ۱۰/۴/۲۷۔

(۲) بخاری عن عائشة و ابن عباس کتاب اللباس باب الاکیسة والخمائص۔

(۳) زاد المعاد ۱۲۵، تحقیق شعیب ارنوط، عبد القادر ارنوط، ط، الرسالہ، بیروت۔

(۴) فرق ما بیننا والمشرکین العمائم علی القلانس۔ ترمذی وقال ہذا حدیث غریب واسنادہ لیس بالقائم وقال فیہ الملا علی قاری: رواہ ابو داؤد و سکت عنہ ولعل اسنادہ قائم، مرقاۃ ۸/۲۵۰ ط: امدادیہ۔

(۵) عالمگیری ص: ۳۳۰۔

(۶) کتاب اللباس، باب ما فی سدل العمامة بین الکتفین، ترمذی ۴/۲۲۵۔

(۷) ویرخی لہا من جانب الایمن نحو الاذن، مجمع الزوائد ۵/۱۲۰۔

اعتم ارخی عمامته بین یدیه ومن خلفه (۱) بعض روایات سے اندازہ ہوتا ہے کہ کبھی اس چھوڑ کے بغیر بھی عمامہ باندھتے تھے (۲) بعضوں نے ایک بالشت اور بعضوں نے بیٹھنے کی جگہ تک لانبا چھوڑ رکھنے کو کہا ہے (۳)۔ خود حدیث میں اس چھوڑ کے چار انگلی کے مقدار ہونے کا ذکر ہے (۴) عبداللہ بن زبیر کا معمول تھا کہ ایک بالشت یا اس سے کم اور کبھی ایک ہاتھ کے قریب چھوڑ رکھتے تھے (۵) نووی سے منقول ہے کہ حضورؐ کے دو طرح کے عمامے تھے۔ بڑا جو بارہ ہاتھ کا تھا، چھوٹا جو سات ہاتھ کا تھا (۶) مگر حقیقت یہ ہے کہ عمامہ کی کوئی خاص مقدار آپ سے صحیح اور صریح طور پر ثابت نہیں۔ سیوطی کا بیان ہے:

امامقدار العمامة الشریفة فلم یثبت فی حدیث، یہی بات الفاظ کے تھوڑے تغیر کے ساتھ علامہ جزری نے لکھی ہے (۷) البتہ عمامہ کے فضائل کے سلسلہ میں جو روایات نقل کی جاتی ہیں مثلاً یہ کہ عمامہ کے ساتھ ایک فرض یا نفل پچیس نمازوں کے برابر ہے تو یہ موضوع ہے (۸) یہی حال اس طرح کی دوسری روایات کا بھی ہے۔

ٹوپی:

شریعت کا عام مزاج یہ ہے کہ سر ڈھکا رہے، آپؐ زیادہ تر عمامہ کا استعمال فرماتے لیکن بعض اوقات صرف ٹوپی بھی زیبِ تن کرتے، عالمگیری میں ہے: لا بأس

---

(۱) مجمع الزوائد ۵/۱۲۰ وفیہ حجاج بن رشدین وھو ضعیف۔

(۲) دیکھئے زاد المعاد ۱/۵۰ فصل فی ملابسہ ط: دار احیاء التراث الاسلامی۔

(۳) عالمگیری ۲۳۰۔

(۴) مجمع الزوائد ۵/۱۲۰ باب ماجاء فی العمامة۔

(۵) تحفۃ الاحوذی ۲/۴۹۔

(۶) تحفۃ القاری ۲/۴۹۔

(۷) دیکھئے تحفۃ الاحوذی ۳/۴۹۔

(۸) تحفۃ الاحوذی ۳/۵۱۔

یلبس القلانس وقد صح ان النبی کان یلبسھا (۱) حضرت ابن عمرؓ سے طبرانی نے دو روایتیں نقل کی ہیں کہ آپؐ سفید ٹوپی پہنا کرتے تھے۔ کان رسول اللہ یلبس قلنسوۃ بیضاء (۲) ——— ریشم کے جس طرح دوسرے کپڑے ممنوع ہیں اسی طرح ٹوپی کو بھی منع کیا گیا ہے، چاہے وہ عمامہ کے اندر کیوں نہ ہو، ولکن اکرہ القلنسوۃ ان کانت تحت العمامۃ (۳)

قمیص:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قمیص زیب تن فرمائی ہے اور قمیص آپؐ کو محبوب بھی جس کے آستین گٹوں تک ہوتی، چنانچہ ترمذی میں ہے کہ کان احب الثیاب الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم القمیص (۴) نیز ایک روایت میں ہے کہ کان کمّ ید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الی الرسغ (۵)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قمیص کی وضع ایسی ہوتی تھی جس میں گریبان سینے کے سامنے ہوتا تھا (۶) آپؐ نے جبّہ اور قبا بھی پہنی ہے، تہبند اور چادر کا استعمال بھی فرمایا ہے، چادر عام طور پر ۶ ہاتھ لانبی اور ۲½ ہاتھ چوڑی ہوتی اور تہبند ۴½ ہاتھ لانبی اور ۲½ ہاتھ چوڑی ہوتی (۷)

---

(۱) ہندیہ ۳۳۰/۵۔

(۲) وفیہ عبداللہ بن خراش وثقہ ابن حبان وضعفہ جمہور الائمۃ وفی روایۃ کمۃ بیضاء وفیہ محمد بن حنفیۃ الواسطی وھو ضعیف لیس بالقوی، مجمع الزوائد ۱۲۱/۵۔

(۳) شامی ۲۲۵/۵۔

(۴) ترمذی عن ام سلمۃ ۲۲۷/۲ باب ما جاء فی القمیص۔

(۵) ترمذی عن اسماء بنت یزید ۲۲۸/۲ باب سابق۔

(۶) بخاری کتاب اللباس باب جیب القمیص من عند الصدر وغیرہ۔

(۷) ادا المعاد ۵۱/۱۔

کپڑے آپؐ نے اون کے بھی استعمال فرمائے ہیں، کتان کے بھی اور سوت کے بھی۔ زیادہ تر آپ اور آپ کے اصحاب کا معمول سوتی کپڑے پہننے کا تھا و کان غالب ما یلبس ھو واصحابہ ما نسج من القطن۔ اسی لئے ابن قیم وغیرہ نے بعض صوفیاء کے خاص طور پر اونی لباس ہی کے استعمال کرنے کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا ہے، ان کا خیال ہے کہ آپ کے یہاں اس بارے میں کوئی تکلف نہیں تھا، سوت، اون، کتان جس کا کپڑا میسر آگیا پہن لیتے (۱)

پائجامہ

لباس جتنا زیادہ ساتر ہو، شریعت کی نظر میں اسی قدر بہتر ہے۔ اسی لئے تہ بند کا استعمال بھی جائز ہے لیکن پائجامہ کا استعمال زیادہ بہتر ہے، خود آپ نے پائجامہ خرید فرمایا ہے، مالک بن عمیرہ اسدی سے مروی ہے:

قدمت قبل مهاجرة رسول الله فاشترى من سراويل فارجح لى وما كان ليشتريه عبثا وان كان غالب لبسه الازار (۲)	آپؐ کی ہجرت سے پہلے میں آیا تو آپ نے مجھ سے پائجامہ خرید کیا اور قیمت زیادہ کر کے دی، ظاہر ہے کہ آپ کا یہ خرید کرنا بلا ضرورت تو نہ ہوگا، ہاں زیادہ استعمال ازار کا فرماتے تھے۔

حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ میں ایک دن آپ کے ہمراہ بازار آیا، آپ ایک پارچہ فروش کے پاس بیٹھ گئے اور چار درہم میں پائجامہ خرید فرمایا، میں نے عرض کیا، آپ اور پائجامہ پہنتے ہیں؟ فرمایا، کیوں نہیں؟ سفر و حضر اور شب و روز پہنتا ہوں، اس لئے کہ مجھے بھی تو جسم پوشی کا حکم دیا گیا ہے (۳) اس حدیث سے خیال ہوتا ہے کہ آپ نے پائجامہ کا استعمال

---

(۱) زاد المعاد ۱/۵۲ فصل فی البسۃ الصوف والقطن والکتان۔

(۲) فتح الباری ۱۰/۲۷۲۔

(۳) حوالہ سابق۔

بھی فرمایا ہے اس لئے ابن قیم کہتے ہیں کہ "بظاہر آپ نے استعمال ہی کے لئے خرید کیا ہوگا اور ایک سے زیادہ روایتیں ہیں کہ آپ نے خود بھی پائجامہ پہنا ہے اور دوسرے بھی آپ کی اجازت سے پائجامے استعمال کیا کرتے تھے۔" (۱)

کپڑا پہننے کی سنتیں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں میں سے ایک یہ ہے کہ جب جوتا پہننا ہوتا تو پہلے دائیں پاؤں میں پہنتے پھر بائیں پاؤں میں پہنتے (۲) اور جوتا اتارنا ہوتا تو پہلے بائیں پاؤں کو اتارتے پھر دائیں پاؤں کو (۳) اسی پر قیاس کرتے ہوئے کپڑوں میں بھی پہنتے اور اتارتے ہوئے یہی ترتیب مسنون ہوگی ——— کپڑا پہنتے وقت آپ سے بعض دعائیں بھی منقول ہیں

جب کوئی نیا کپڑا پہنتے تو پہلے اس کا نام لیتے پھر فرماتے:

اللّٰھم لک الحمد انت کسوتنیہ أسالک خیرہ وخیر ما صنع لہ واعوذ بک من شرہ وشر ما صنع لہ۔

خداوندا! آپ کا شکر کہ آپ نے مجھے یہ لباس پہنایا میں آپ سے اسکے اور اس کی ساخت کے مقاصد میں سے خیر کا خواستگار اور اسکے اور اسکی بناوٹ کے مقاصد کے شر سے پناہ خواہ ہوں۔

اور کبھی یہ دعا پڑھتے:

الحمد للہ الذی کسانی ما اواری بہ عورتی واتجمل بہ فی حیاتی۔

خدا کی تعریف جس نے مجھے یہ لباس پہنایا کہ اس سے قابل ستر حصے ڈھک سکوں اور اپنی زندگی میں اس سے تجمل کروں۔

اور کبھی یہ دعا بھی پڑھتے:

الحمد للہ الذی کسانی ھذا ورزقنیہ من غیر حول منی ولا قوۃ (۴)

خدا کی تعریف جس نے یہ پہنایا اور بلا قوت و دخل عطا فرمایا۔

ان تینوں دعاؤں میں سے جو بھی پڑھ لی جائے کافی ہے۔

---

(۱) زاد المعاد ۱/۵۱۔ (۲) بخاری کتاب اللباس باب یبدأ بالنعل الیمنیٰ۔ (۳) بخاری کتاب اللباس باب ینزع نعلہ الیسریٰ۔ (۴) زاد المعاد ۲/۱۹۔

ساتواں باب

زیبائش و آرائش

خدا نے اپنی اس کائنات کو نہایت حسین و جمیل اور خوبصورت بنایا ہے سورج کی روشن کرنیں، چاند کی خنک روشنی، آسماں کی جبیں پر روشن ستاروں کی آرائش، زمین پر سرسبز پودوں کا نکھار اور نوع بہ نوع عطر بیز اور مشکبار اور خوش منظر پھولوں کی بہار، فلک بوس پہاڑیاں اور ان پر سفید و شفاف برف کے دو۔ پٹے، سمندر کا لطف آمیز تموج اور آبشاروں کا کیف پرور تار، غرض پوری کائنات ہے کہ قدرت کی حسن کاری اور اسکی جمال آرائی کی تصویر ہے۔

پھر خود حیوانات میں کیسے کیسے خوبصورت، خوش منظر، چہچہاتے دوڑتے ناچتے رقص کرتے اور اپنے نغموں سے محظوظ کرتے ہوئے چرند و پرند خدا کی اس دنیا میں اپنی اپنی طرف دامنِ دل کو کھینچتے اور نگاہِ شوق کو متوجہ کرتے ہیں لیکن اس پوری کائنات کا سب سے حسین و جمیل وجود حضرت انسان کا ہے جو تمام مخلوقات میں اشرف بھی ہے، ان کا مخدوم بھی اور خدا کی اس بستی کے بسائے جانے کا اصل مقصود بھی۔

انسان اللہ کے دوسرے احسانات اور انعامات کے علاوہ خود جمالیاتی نقطۂ نظر سے اپنے سراپا پر غور کرے اور تناسب و موزونیت پر نگاہ ڈالے تو اس احسن الخالقین کا شکر ادا کئے بغیر نہ رہے۔ فتبارک اللہ احسن الخالقین۔

اور علاوہ اس حسنِ خداداد کے خدا نے اپنی اس مخلوق میں زیبائش و آرائش کا جو سلیقہ اور ذوق عطا فرمایا ہے اس میں بھی اس کا کوئی شریک و سہیم نہیں دنیا میں جتنی مخلوقات ہیں وہ ذوق سے عاری ہیں، نہ مور نے آج تک گیسو سنوارے ہیں، نہ ہرنوں نے پیچ در پیچ سینگوں پر رنگ آرائی کی ہے، نہ خوبصورت پرندوں نے کبھی اپنے جمال و کشش کا اندازہ بھی لگایا ہے، لیکن انسان ہے کہ اس نے سر کے بال سے پاؤں کے ناخن تک حسن آرائی کے ایک سے ایک طریقے دریافت کئے ہیں اور ان کو وجود بخشا ہے، اسلام نے اس مذاق فطرت پر یکسر روک تو نہیں لگائی لیکن اپنے مزاج خاص کے مطابق اس کی تہذیب کی اور اس کے لئے مناسب حدیں قائم کردیں۔

خواتین کیلئے زیورات

خود حدیثوں سے عورتوں کے لئے زیورات کا استعمال ثابت ہے۔
حضرت ابن عباس کی ایک روایت میں ہاتھ اور پاؤں میں انگوٹھیوں کے پہننے کا ذکر ہے (۱) حضرت عائشہ کے ہار کا واقعہ مشہور ہی ہے، کان کے زیور (قرط) کا ذکر بھی حدیث میں ہے (۲) حضرت ام سلمہ کا ہاتھوں میں کنگن کا استعمال کرنا منقول ہے (۳) ایک صحابیہ کا پازیب (خلخال) پہننا روایت میں نقل کیا گیا

(۱) بخاری کتاب اللباس باب الخاتم للنساء۔
(۲) بخاری کتاب اللباس باب القرط للنساء۔
(۳) ابوداؤد باب الکنز ماہو وزکوٰۃ الحلی ۱/۲۱۸۔

ہے (۱) خود قرآن مجید نے لا یبدین زینتھن الا ما ظھر منھا (نور: ۳۱) کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ عورتوں کے جسم کے بعض حصوں پر آرائشی زیورات کے استعمال کی گنجائش ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس آرائش کا اظہار شوہر اور محرم رشتہ داروں کے سامنے ہو اور ایسی کھنک نہ ہو جو غیر محرموں کو اس کی طرف متوجہ کردے۔

دراصل شریعت نے عورتوں کے لئے مناسب طور پر زیبائش و آرائش کی اجازت دی ہے، یہ فطرتِ انسانی کے عین مطابق ہے کہ خالق تعالیٰ نے مردوں میں جرأت و بہادری، طاقت و قوت، حوصلہ و ہمت، تحفظ کی صلاحیت اور اقدام کی قدرت عطا فرمائی ہے نیز فہم و دانش اور معاملہ فہمی و دور اندیشی سے حصۂ وافر عطا فرمایا ہے جو اس کی شخصیت کو نکھارتا، ممتاز و نمایاں کرتا اور عورتوں کے لئے باعث کشش بناتا ہے، اسی طرح عورتوں میں اِن صفات سے محرومی یا کمی کے بدلہ اس صنف کے اندر حسن و جمال، لطف و محبت، نازک اندامی، شانِ محبوبیت اور جذبۂ آرائش نیز ذوق خودنمائی رکھدی ہے جو اس کو ممتا بھری ماں، محبت کرنے والی بیوی اور ناز کرنے والی بیٹی بناتی ہے اور وہ اپنی صنفی کمزوری کے باوجود مردوں کے لئے باعث کشش اور اس کا قبلۂ مقصود قرار پاتی ہے۔ اسی کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ما رأیت من ناقصات عقل و دین اذھب للب الرجل الحازم من احداکن (۲) زیورات کے پہننے اور تزئین و آرائش کی اجازت دینے کا منشا اصل میں عورت کے اسی جذبۂ خلقی اور تقاضۂ طبعی کا اعتراف اور مرد کی عفت و پاکدامنی کی رعایت ہے!

مہندی اور پینٹ:

---

(۱) ابن ماجہ ۲/۱۴۹، باب المظاہر یجامع قبل ان یکفر، عن ابن عباس۔

(۲) بخاری ۱/۴۴ باب مباشرۃ الحیض۔

عورتوں کے لئے چوں کہ زیبائش و آرائش کی رعایت زیادہ کی گئی ہے اس لئے وہ مہندی بھی لگا سکتی ہیں، ہاتھوں میں بھی اور پاؤں میں بھی، مردوں کے لئے گو بچہ کیوں نہ ہو مہندی کا استعمال جائز نہیں (۱) ایسے پینٹ جو جسم تک پانی کے پہونچنے میں مانع ہوں، خواتین ان ایام میں لگائیں جن میں ناپاکی کی وجہ سے نماز کا حکم ان سے متعلق نہیں تو مضائقہ نہیں۔ اسی طرح عورتوں کیلئے کاجل اور سیاہ سرمہ کا استعمال درست ہے، مردوں کے لئے بہتر ہے کہ سفید سرمہ استعمال کریں اور سیاہ بھی استعمال کریں تو زینت مقصود نہ ہو، آرائش کے نقطۂ نظر سے مردوں کیلئے سیاہ سرمہ کا استعمال مکروہ ہے (۲) عورتوں کا سیندور اور ٹکلی کا استعمال کرنا یا جنوبی ہند میں کالی پوتھ کا استعمال کرنا مکروہ ہے، یہ ہندوانہ رسم ہے اور اس میں دوسری اقوام کے ساتھ تشبہ ہے۔

انگوٹھی

زیورات کے قبیل کی جتنی چیزیں ہیں وہ سب صرف عورتوں ہی کیلئے جائز ہیں، مردوں کے لئے جائز نہیں، اس سے صرف انگوٹھی کا استثناء ہے جو خود پیغمبر اسلام ؐ نے استعمال فرمائی ہے، اسی لئے محدثین نے اپنی کتابوں میں اس کو مستقل عنوان بنا کر ذکر کیا ہے۔

خاتم مبارک

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابتداءً انگوٹھی نہیں پہنتے تھے، صلح حدیبیہ کے

---

(۱) عالمگیری ۳۵۹/۵، باب الزینۃ۔

(۲) حوالۂ سابق۔

بعد جب آپؐ نے جزیرۃ العرب کے باہر دعوتِ اسلام کی مہم شروع کی اور مختلف سربراہانِ مملکت کو خطوط لکھے تو لوگوں نے عرض کیا کہ اہلِ روم مہر کے بغیر خطوط قبول نہیں کرتے، چنانچہ آپؐ نے چاندی کی انگوٹھی بنائی اور اس پر "محمد رسول اللہ" کا نقش کندہ کرایا تاکہ اس سے مہر کا کام لیا جاسکے (۱) بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مقصد کے لئے آپؐ نے پہلے سونے کی انگوٹھی استعمال کی، لیکن آپؐ کا دیکھا دیکھی بہت سے صحابہ نے بھی سونے کی انگوٹھیاں بنوالیں آپؐ نے اپنی انگوٹھی پھینک دی اور اعلانیہ فرمایا کہ میں یہ پھر نہیں پہنوں گا۔ اس کے بعد آپؐ نے چاندی کی انگوٹھی بنوائی جو آپؐ کے بعد خلفاءِ راشدین کے پاس رہا کرتی۔ یہاں تک کہ عہدِ عثمانی میں "بیر اریس" میں گری اور پھر مل نہ سکی (۲)۔ اسی روایت سے اہلِ علم نے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ آغازِ اسلام میں مردوں کے لئے سونے کی انگوٹھی استعمال کرنے کی اجازت تھی۔ بعد کو ممانعت کردی گئی (۳) بلکہ مردوں کو آپؐ نے مطلق سونے ہی کے استعمال سے منع فرمادیا (۴)۔

خاتم مبارک کا حلقہ تو چاندی کا تھا ہی، نگینہ بھی چاندی ہی کا تھا (۵) البتہ اس کی وضع اور ساخت حبشی تھی (۶) دائیں بائیں دونوں ہاتھ میں انگوٹھی پہننا ثابت ہے (۷) انگوٹھی جس ہاتھ میں بھی ہو خنصر (چھوٹی انگلی) میں پہنے (۸)

---

(۱) بخاری عن انسؓ باب اتخاذ الخاتم لیختم بہ الشیٔ الخ ۲/۸۷۳۔

(۲) بخاری عن ابن عمرؓ باب خاتم الفضۃ ۲/۸۷۱۔

(۳) کتاب الاعتبار للحازمی ۲۲۷، باب اباحۃ لبس خاتم الذہب ونسخہا۔

(۴) بخاری عن براء بن عازب، باب خواتیم الذہب ۲/۸۷۱۔

(۵) بخاری عن انسؓ باب فص الخاتم ۲/۸۷۲۔

(۶) ابوداؤد عن انسؓ باب ماجاء فی اتخاذ الخاتم ۲/۵۷۹، حدیث کا یہی مفہوم ملا علی قاری نے بتایا ہے مرقاۃ ۴/۴۴۴۔

(۷) ابوداؤد عن علی وابن عمرؓ باب ماجاء فی التختم فی الیمین اوالیسار ۲/۵۸۰۔

(۸) ابوداؤد عن ابن عمرو بن عباس، باب مذکور ۲/۵۸۰۔

انگشت شہادت اور درمیانی انگلی میں پہننے سے صراحۃً منع فرمایا (۱) اور ابہام و بنصر میں کبھی پہننا ثابت نہیں (۲) آپ انگوٹھی کا استعمال چوں کہ ازراہِ ضرورت ہی فرماتے تھے اور زینت کا پہلو پیشِ نظر نہیں تھا اس لئے نگینہ کے حصہ کو اندر کی طرف رکھنے کا معمول تھا۔(۳) انگوٹھی پر "محمد رسول اللہ" کا نقش تھا اور ہدایت تھی کہ اس نقش پر کوئی اور انگوٹھی نہ بنائے (۴) کہ اس سے التباس و مغالطہ کا اندیشہ تھا، غالباً آپ کے پاس ایک سے زیادہ انگوٹھیاں تھیں، بعض خالص چاندی کی اور بعض لوہے کی جس پر چاندی کا پتر چڑھایا ہوا تھا (۵)

انگوٹھی سے متعلق احکام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معمولات مبارکہ سے معلوم ہوا کہ مردوں کے لئے صرف چاندی ہی کی انگوٹھی جائز ہے گو بہتر انگوٹھی کا نہ پہننا ہی ہے اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ضرورتاً ہی انگوٹھی استعمال فرمائی تھی، ابتدا سے انگوٹھی نہیں پہنی۔ اسی لئے بعض تابعین سے منقول ہے کہ تین ہی اشخاص انگوٹھی پہنتے ہیں، سلطان، قاضی اور بے وقوف (۶) بے وقوف سے مراد وہ شخص ہے، جو بلا ضرورت انگوٹھی کا استعمال کرے۔

فی زمانہ چونکہ انگوٹھی کے بجائے مستقل مہریں بننے لگی ہیں اس لئے امیر و قاضی اور عہدیداروں کے لئے بھی انگوٹھی کی حاجت نہیں رہی، انگوٹھی دائیں اور

---

(۱) مسلم عن علی ۲/۱۹۷۔
(۲) مرقاۃ المفاتیح ۴/۴۴۵۔
(۳) بخاری باب من جعل فص الخاتم فی بطن کفہ، عن ابن عمر ۲/۸۷۳۔
(۴) بخاری عن انس، باب قول النبی لا ینقش علی نقش خاتمہ ۲/۸۷۳۔
(۵) دیکھئے: ابوداؤد عن ایاس بن حارث۔ باب ما جاء فی خاتم الحدید ۲/۵۸۰۔
(۶) شامی، ۵/۲۳۱۔

بائیں دونوں ہاتھ میں پہنی جا سکتی ہے۔ دوسری انگلیوں میں پہننے کو امام نوویؒ نے مکروہ تنزیہی قرار دیا ہے البتہ عورتیں تمام ہی انگلیوں میں پہن سکتی ہیں (۱) دائیں ہاتھ کی فضیلت کی وجہ سے اکثر علماء کی رائے ہے کہ انگوٹھی دائیں ہاتھ میں پہنی جائے (۲)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیتل اور لوہے کی انگوٹھی سے منع فرمایا (۳) ہاں جیسا کہ مذکور ہوا اگر لوہے کی انگوٹھی کے اوپر چاندی کا پتر چڑھا دیا جائے تو مضائقہ نہیں یہ کراہت مردوں کے لئے بھی ہے اور عورتوں کے لئے بھی (۴) مرد انگوٹھی کا نگینہ اندر کی سمت رکھے البتہ عورتیں باہر رکھ سکتی ہیں (۵) مَرد چاندی کے علاوہ کسی اور چیز کی انگوٹھی نہیں پہن سکتے لیکن انگوٹھی کا نگینہ کسی پتھر یا شیشہ کا ہو تو مضائقہ نہیں (۶) ——— آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چاندی کی انگوٹھی میں بھی یہ شرط لگائی ہے کہ ایک مثقال سے کم ہو (ولا تتمہ مثقالاً) (۷) یہی رائے فقہائے احناف کی ہے (۸) ایک مثقال کی مقدار موجودہ اوزان میں ۴ ماشہ ۴ رتی ہوتی ہے (۹) جیسا کہ مذکور ہوا خواتین کے لئے سونے کی انگوٹھی استعمال کرنا درست ہے اور دوسرے زیورات بھی (۱۰)

---

(۱) مرقاۃ ۴/۴۴۵۔

(۲) حوالۂ سابق

(۳) ابوداؤد عن بریدہ باب ما جاء فی خاتم الحدید ۲/۵۸۰۔

(۴) دیکھئے عون المعبود ۱۱/۲۸۲، شامی ۵/۲۳۰

(۵) شامی ۵/۲۳۰۔ (۶) درمختار علی ہامش الرد ۵/۲۳۰۔

(۷) ابوداؤد عن بریدہ ۲/۵۸۰ باب ما جاء فی خاتم الحدید۔

(۸) درمختار علی ہامش الرد ۵/۲۳۰۔ شوافع کی ایک جماعت ایک مثقال سے زیادہ کو حرام اور کچھ لوگ محض مکروہ تنزیہی قرار دیتے ہیں، مرقاۃ ۴/۴۴۶۔

(۹) جواہر الفقہ ۱/۴۲۸۔

(۱۰) ملاحظہ ہو باب الخاتم للنساء، بخاری عن ابن عباس ۲/۸۷۳۔

انگوٹھی پر موعظت خیز فقرے

صحابہ اور بعض اہل علم سے اپنی انگوٹھیوں پر خاص قسم کے عبرت خیز اور موعظت آمیز فقرے لکھنا منقول ہے، یہاں ان کا نقل کر دینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ	:	نعم القادر اللّٰہ	(اللہ کیا ہی قادر ہے۔)
حضرت عمر فاروقؓ	:	کفیٰ بالموت واعظاً	(موت عبرت کیلئے کافی ہے)
حضرت عثمان غنیؓ	:	لتصبرنّ اولتندمنّ	(صبر کروگے یا ندامت اٹھاؤگے)
حضرت علی مرتضیٰؓ	:	الملك لله	(حکومت اللہ کے لئے ہے)
امام ابو حنیفہؒ	:	قُلِ الخیر والّا فاسکت	(اچھی بات کہو ورنہ چپ رہو۔)
امام ابو یوسفؒ	:	من عمل برأیه فقد ندم	(جس نے خود رائی کی اس نے ندامت اُٹھائی)
امام محمدؒ	:	من صبر ظفر (۱)	(جس نے صبر کیا کامیاب ہوا)

خوشبو اور عطریات

خوشبو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت پسند تھی اور بدبو اسی درجہ ناپسندیدہ۔ ایک روایت میں آپ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ پاکیزہ ہے اور پاکیزگی و خوشبو کو پسند کرتا ہے انّ اللّٰہ طیّب یحبّ الطیب —— ایک موقع پر ارشاد فرمایا کہ ہر مسلمان کو ہفتہ میں ایک بار ضرور ہی غسل کر لینا چاہیے اور خوشبو ہو تو اس کا بھی استعمال کرے۔ بخاری شریف میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمولِ مبارک نقل کیا گیا ہے کہ کوئی تحفہ میں خوشبو پیش کرتا تو واپس نہیں فرماتے۔ مسلم شریف کی ایک روایت میں آپؐ کی ہدایت موجود ہے کہ خوشبودار پھول پیش کیا جائے تو

(۱) ردالمحتار ۵/۲۳۰۔

واپس نہ کرے من عرض علیہ ریحاناً فلا یردہ ۔ ابوداؤد کی ایک روایت میں مطلقاً خوشبو کے بارے میں ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ اسے واپس نہ کیا جائے (۱)

ہاں مردوں کے لئے آپؐ نے تیز لیکن بے رنگ خوشبو اور عورت کے لئے رنگ دار لیکن کم خوشبو دار عطریات کو پسند فرمایا ہے۔

بیوٹی سرجری اور کریم وغیرہ کا استعمال

حسن وجمال کی طرف رغبت اور جذبۂ خودنمائی انسانی فطرت میں ودیعت ہے۔ اسلام نے اس تقاضۂ طبعی کی رعایت بھی کی ہے اور تہذیب بھی، ایک طرف آپؐ نے صفائی ستھرائی، اچھے کپڑے پہننے، بالوں کی آرائش، وضع قطع کی اصلاح اور خواتین کے لئے ریشم اور شوخ رنگ کے کپڑے نیز زیورات کو جائز رکھا ہے۔ دوسری طرف جذبۂ آرائش میں تکلف اور مبالغہ آمیز حد تک تزئین کو منع بھی فرمایا ہے چنانچہ آپؐ نے گودنے، دانتوں کو مصنوعی طور پر نوکدار بنانے، دانتوں کے درمیان مصنوعی فصل پیدا کرنے، اپنے بال کے ساتھ دوسروں کے بال جوڑنے اور بھوں کے بال اکھاڑ کر باریک بنانے کو ناپسند فرمایا ہے اور اللہ کی تخلیق میں تغیر قرار دیا ہے۔

اسی لئے فقہاء بھی اس باب میں اعتدال ومیانہ روی ہی کو پسند کرتے ہیں۔ اگر کسی کو غیر فطری طریقہ پر چھٹی انگلی نکل آئے تو آپریشن کے ذریعہ اس کو کاٹ دینا جائز ہوگا (۲) اس باب میں فقہاء شوہر کے مزاج کو بھی ایک گونہ اہمیت دیتے ہیں۔ چنانچہ اگر شوہر موٹاپے کو پسند کرتا ہو تو عورت کے لئے خصوصیت سے

---

(۱) زاد المعاد ۱۸۳/۳ فصل فی ہدیہ صلی اللہ علیہ وسلم فی حفظ الصحۃ فی الطیب۔

(۲) ہندیہ۔

ثرید کھانے کی اجازت دی گئی ہے (۱) غور کیا جائے کہ پہلی صورت میں خلافِ فطرت اضافہ کو آپریشن کے ذریعہ دور کرنے کی اجازت دی گئی ہے اور دوسری صورت میں محض غذا کے ذریعہ اس کی جسمانی نشوونما میں بڑھوتری کی گئی ہے لہذا کریم اور پاوڈر وغیرہ کے ذریعہ آرائش میں مضائقہ نہیں۔ اس سے تغییر خلق نہیں ہوتا ہے۔ اسی طرح مسّے یا گوشت کا غیر معمولی اُبھار وغیرہ کو آپریشن کے ذریعہ دور کر لیا جائے تو کوئی حرج نہیں لیکن بہ تقاضۂ طبعی چہروں پر جو جھریاں پڑ جاتی ہیں، آپریشن کے ذریعہ ان کو دور کرنا، ناک کو کھڑی کرانا وغیرہ جائز نہیں ہوگا کہ یہ تغییرِ خلق ہے اور نہ ان حدیثوں کی روشنی میں جو بال جوڑنے کی ممانعت کے سلسلہ میں وارد ہیں، یہ جائز نظر آتی ہیں۔

تعمیر مکان میں اعتدال

مکانات اور اس کی تعمیر میں ڈیزائن اور نقشوں کا تنوع فی زمانہ آرائش کا بڑا ذریعہ ہے بلکہ ہر زمانہ میں رہا کیا ہے، خود قرآن مجید نے قوم عاد وثمود کے ذوقِ تعمیر اور اس میں افراط وتعیش اور پھر اللہ تعالی کی طرف سے پکڑ کا ذکر کیا ہے، خدا کی زمین پر آج بھی اپنے نافرمان بندوں پر عتاب اور "بطش شدید" کے آثار سامانِ عبرت ہیں ———— مگر اس کے باوجود غالباً یہ ذوق آپ کے تربیت یافتہ صحابہ کو چھوڑ کر کبھی کم نہ ہو پایا بلکہ گذشتہ قوموں میں تعمیری تفاخر کا جو جذبہ فرمانرواؤں اور رؤساء وحکمرانوں میں تھا، جدید ترقیات نے اس کو اتنا عام کر دیا ہے کہ اَب یہ ذوقِ تعیش متوسط طبقہ میں بھی نفوذ کر گیا ہے۔

---

(۱) ردالمحتار ۲۷۵/۵۔

اسلام نے گو تعمیر کے سلسلہ میں قانون کی سطح پر کوئی قید و بند عائد نہیں کی اور نہ کسی خاص نقشہ کی تعیین کی، سوائے اس کے کہ اس کا مکان دوسرے پڑوسیوں کے لئے ضرر کا باعث نہ بنے، لیکن اخلاقی طور پر اس میں حد سے گذرے ہوئے غلو اور افراط کو ناپسند کیا ہے۔ تعمیر مکان کی طرف زیادہ توجہ اور اس کی تزئین و آرائش میں افراط اور مقابلوں کے نتیجہ میں انسان اپنی دولت کا بڑا حصہ اس مد میں صرف کر دیتا ہے، یہ رقم جو اینٹ اور گارڈے، پتھر اور چونے کی صورت میں منجمد ہو جاتی ہے، ایک طرف خود اس کی دولت میں نمو اور بڑھوتری کو روک دیتی ہے۔ دوسری طرف اس سے بالواسطہ اس کی قوم کے دوسرے لوگوں کو بھی نقصان پہنچتا ہے کہ اس سرمایہ کے گردش میں رہنے کی وجہ سے دوسروں کو اس سے جو نفع پہونچتا وہ اس سے رک جاتا ہے اس کے علاوہ اخلاقی طور پر اکثر کم ظرف لوگوں میں اس کی وجہ سے کبر اور ترفع کا مزاج پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی لئے اسلام نے کافی سے زیادہ تعمیر کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا ہے۔

عبداللہ بن عمرو سے مروی ہے کہ حضورؐ میرے پاس سے گذرے، میں اور میری والدہ دیوار پر مٹی کا پلاسٹر کر رہے تھے (دانا اطین حائطاً) آپؐ نے اس پر ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا اور ارشاد فرمایا: موت کا معاملہ اس عمارت سے زیادہ قریب ہے "الامر اسرع من ذلك" (۱) ایک روایت میں ہے کہ حضورؐ نے ایک صاحب کے مکان پر بلند گنبد دیکھا۔ آپ کو یہ تعمیر پسند نہیں آئی، ان صاحب مکان نے سلام کیا تو ازراہِ اصلاح منھ پھیر لیا، انہوں نے محسوس کر لیا اور گنبد کو ڈھا دیا، آپ نے یہ دیکھا تو خوش ہوئے اور فرمایا کہ: ہر تعمیر

---

(۱) ابوداؤد باب فی البناء۔ کتاب الادب ۲/۷۱۰۔

صاحب تعمیر کے لئے وبال ہے، سوائے اس کے جو اس کے لئے ضروری ہو۔(۱)

البتہ چوں کہ مختلف لوگوں کی ضروریات الگ الگ ہو سکتی ہیں، مزاج و مذاق میں بھی تفاوت ہوتا ہے نیز ہر زمانہ اور عہد کے تعمیری انداز جداگانہ ہوتے ہیں، موسموں کا فرق بھی تعمیر کے انداز میں فرق پیدا کرتے ہیں اس لئے مکانات کے لئے کوئی خاص وضع اور حد مقرر نہیں کی جا سکتی تھی، خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بھی ثابت ہے کہ حجرۂ اقدس پر بالا خانہ بھی بنائے ہوئے تھے(۲)

مساجد کی تزئین وآرائش

ذاتی تعمیرات کے علاوہ خود مسجد کی تعمیر میں بھی غیر معمولی آرائش کو پسند نہیں کیا گیا ہے اور آپ نے ایک حد تک اس سے منع فرمایا ہے۔ ایک روایت میں آپ نے اسے قیامت کی علامت قرار دیا ہے کہ لوگ مساجد کی تزئین وسعت وخوبصورتی اور بلندی میں ایک دوسرے پر فخر کرنے لگیں(۳) آپؐ کے عہد میں خود مسجد نبوی کی دیواریں کچی اینٹوں کی تھیں، چھت کھجور کی ٹہنیوں کی اور ستون بھی کھجور کے تھے، حضرت ابوبکر وعمر کے عہد میں مسجد میں توسیع ہوئی لیکن تعمیری سامان اس کا بھی یہی رہا۔ حضرت عثمان غنیؓ نے اپنے عہد خلافت میں عمدہ منقش پتھر اور گچ کی دیواریں بنائیں، ساگوان کی چھت ڈالی اور منقش پتھروں کے ستون لگائے(۴) مسجد نبوی کی اس مرحلہ وار ارتقاء نے جہاں یہ بات بتائی کہ مساجد کی تعمیر میں حد سے زیادہ تکلف وتزین اور تفاخر مناسب

---

(۱) کل بناء وبال علی صاحبہ الا مالا ابدلہ ۔ ابوداؤد، باب فی البناء، کتاب الادب ۲/۷۱۰۔

(۲) ابوداؤد، باب فی اتخاذ الغرف عن ابن سعید المزنی ۲/۷۱۱۔

(۳) ابوداؤد باب فی بناء المسجد ۱/۶۵ وحاشیہ بحوالہ ملا علی قاری ۱/۶۵، نسائی ۱/۱۱۲

(۴) حوالۂ مذکور۔ المباحات فی المساجد۔

نہیں، وہیں یہ بھی معلوم ہوا کہ تعمیر میں اپنے عہد اور زمانے کے تعمیری معیار کو بھی پیشِ نظر رکھنا اور لوگ جس سہولت و آسانی کے عادی ہو گئے ہیں اس کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے۔ اگر تفاخر اور ایک دوسرے پر مادی سبقت کی نیت نہ ہو بلکہ مقصود اللہ کے گھر کو پرکشش اور جاذب بنانا ہو اور نمازیوں کو سہولت پہنچانا ہو تو خوبصورت وسیع اور بلند مسجدوں کی تعمیر میں بھی مضائقہ نہیں۔

کتا پالنا

کتا ایک موذی اور تکلیف دہ جانور ہے اور انسان کو صرف زخمی ہی نہیں کرتا ہے بلکہ اپنے زہر کے ذریعہ دماغی توازن بھی متاثر کر دیتا ہے اور انسان کو اس کی وجہ سے تکلیف دہ موت سے دوچار ہونا پڑتا ہے، اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتوں کی پرورش اور اس سے زیادہ قربت کو پسند نہیں فرمایا ہے آپ کی ہدایات کا حاصل یہ ہے کہ جو شخص کسی واقعی ضرورت کے بغیر کتا رکھے اس کے اجر میں کمی کر دی جاتی ہے اس لئے کہ اس کی وجہ سے دوسروں کو ایذاء کا خطرہ رہتا ہے اور آپؐ کے حسب ارشاد ایسے مکان میں فرشتۂ رحمت کی آمد نہیں ہوتی[1]

کن ضروریات کی بنا پر کتا رکھا جا سکتا ہے، اس سلسلہ میں روایات میں مختلف صورتوں کا ذکر ملتا ہے، شکار کا کتا، کھیت کی حفاظت کیلئے، قافلہ کی حفاظت کے لئے، بکری وغیرہ کی حفاظت کے لئے (۲) گھر کی حفاظت اور موجودہ زمانے میں جرم کی تفتیش اور مجرم کی شناخت کے لئے استعمال کئے جانے والے کتے بھی اسی حکم میں ہیں اور ان مقاصد کے لئے کتوں کے چھوٹے بچوں کی پرورش

---

(۱) شرح نووی علی مسلم ۲/۲۱۔
(۲) دیکھئے مسلم ۲/۲۱ باب الامر بقتل الکلاب الخ۔

پرورش بھی کی جا سکتی ہے (۱)، ہمارے زمانہ میں مغربی تہذیب میں کتا لاکھنے اور کتا پالنے اور انسانوں سے بڑھ کر اس کی خدمت کرنے نیز یورپ کے بعض علاقوں میں بہ مقابلہ شوہر کے کتوں کی رفاقت کو ترجیح دینے کا مذاق نہ صرف اخلاقی، مذہبی اور تمدنی و تہذیبی اعتبار سے قابل نفریں ہیں بلکہ طبی اور صحت جسمانی کے لحاظ سے بھی نہایت مضر اور غیر سائنسی عمل ہے لیکن تُف ہے اس تہذیب پر جس نے جنوں کا نام خرد اور خرد کا نام جنوں رکھا ہوا ہے۔

ٹی وی:

ٹی وی دورِ جدید کی حیرت انگیز ایجادات میں سے ایک ہے، اس نے معاشرہ کی فکر و عمل پر جو غلبہ حاصل کیا ہے وہ محتاجِ اظہار نہیں، اہل علم کے درمیان ابھی یہ موضوع زیر بحث ہے کہ ٹی وی کی حیثیت تصویر کی ہے یا عکس کی اور وہ فی نفسہ جائز ہے یا ناجائز؟ لیکن شریعت میں کسی بھی امر کا حکم متعین کرتے ہوئے اس بات کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ عملاً اس میں نقصان اور نفع کا تناسب کیا ہے۔ اور معاشرہ پر اس کا جو اثر پڑ رہا ہے وہ دینی اور اخلاقی اعتبار سے مثبت ہے یا منفی؟ میرا خیال ہے کہ کم سے کم ہندوستان میں ٹی وی کا جس طریقہ پر استعمال ہو رہا ہے اور اس کے ذریعہ جس قسم کے تصورات اور معاشرہ کو فروغ مل رہا ہے وہ نہایت تکلیف دہ اور نہ صرف مسلمانوں بلکہ اخلاقی اور مذہبی قدروں کے قدردانوں کے لئے لمحۂ فکریہ ہے، اس لئے ٹی وی اور ویڈیو کی حیثیت سے قطع نظر اس کے استعمال اور اثرات و نتائج کو دیکھتے ہوئے یہ بہت بڑی آفت اور مسلمانوں کی مذہبی زندگی کے لئے ابتلاء محسوس ہوتی ہے بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ شریعت نے جس طرح شراب کو ام الخبائث قرار دیا ہے، ٹی وی اس عہد کی ام الفواحش ہے اور اس سے اجتناب واجب ہے۔

---

(۱) نووی علی مسلم ۲/۲۰۔

تصویر،

تصویر اور صورت گری کی ایک صورت "مجسمہ سازی" ہے جس کو عام طور پر تمثال یا صنم کے الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، دوسری صورت منقوش تصویر کی ہے جیسے کپڑوں، دیواروں اور کاغذ پر نقش، اس کی ترقی یافتہ صورت موجودہ عکسی تصویر (فوٹوگرافی) ہے ——— قرآن مجید کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی امتوں میں تصویر کی یہ دونوں ہی صورتیں جائز تھیں، چنانچہ نبی وقت سیدنا حضرت سلیمان علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حکم سے جنات ان کے لئے مجسمے بنایا کرتے تھے۔ یعملون له مایشاء من محاریبَ وتماثیلَ وجفانٍ کالجواب (سبا: ۱۳)

لیکن چوں کہ یہ مجسمہ سازی اور تصویر سازی مختلف اقوام میں بتدریج شرک کا باعث بنتی رہی ہیں، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم جن کی بعثت شریعت کی تکمیل، عقیدۂ توحید کے قیامت تک کے لئے غلبہ و اظہار اور دین حقیقی کو ہر طرح کی تحریف و تصحیف سے محفوظ رکھنے لئے وجود پذیر ہوئی تھی، نے ضروری جانا کہ اس چور دروازہ کو بند کر دیا جائے تاکہ اس امت میں فتنہ در نہ آسکے۔

تصویر کے سلسلے میں سب سے پہلے ہم کو احادیث پر نظر کرنی چاہیئے ——— تصویر کے متعلق احادیث میں بظاہر اختلاف و تعارض محسوس ہوتا ہے۔

بے جان تصویریں

۱۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مطلقاً تصویر حرام ہے، جاندار کی ہو یا بے جان اشیاء کی ——— حضرت ابو ذرعہ سے مروی ہے کہ وہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ مدینہ کے ایک گھر گئے تو گھر کے بالائی حصہ میں ایک تصویر پر نظر پڑی، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

یں نے آپؐ سے سنا ہے کہ اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو خدا کی طرح تخلیق کرنے لگے، وہ ایک دانہ اور ذرہ کی تخلیق کر کے ہی بتائے (۱)

یہاں "حبہ" اور "ذرہ" کے لفظ سے اشارہ محسوس ہوتا ہے کہ خدا کی کسی بھی مخلوق خواہ جاندار ہو یا بے جان، کی تصویر بنانی جائز نہیں۔ چنانچہ ابن عباس کے مایۂ ناز شاگرد کی طرف منسوب ہے کہ وہ پھلدار درخت کی تصویر بنانے کو بھی منع فرماتے تھے (۲)

جاندار کی تصویر

۲۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جاندار اور ذی روح کی تصویریں ممنوع ہیں، بے جان اشیاء کی تصویروں میں مضائقہ نہیں ـــــ چنانچہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ میں نے آپؐ سے سنا کہ جو تصویر بنائے گا اللہ تعالیٰ اس وقت تک اس کو عذاب دے گا جب تک کہ وہ روح نہ پھونک دے اور ظاہر ہے کہ انسان روح نہ پھونک سکے گا۔ حتی ینفخ فیہ الروح و لیس بنافخ ابداً (۳)

تاہم روایت کے لب و لہجہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ غیر ذی روح کی تصویر بنانے اور اس کو ذریعہ معاش بنانا بھی کچھ پسندیدہ امر نہیں، چنانچہ آگے ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اگر تم اس سے باز آنے کو تیار نہ ہو تو زیادہ سے زیادہ درخت اور بے روح چیزوں کی تصویر پر اکتفا کرو: ان ابیت الا ان تصنع

---

(۱) بخاری عن ابی ہریرہؓ، باب عذاب المصورین یوم القیامۃ ۸۸۰/۲۔

(۲) بحر ۳۱/۲، رد المحتار ۴۳۶/۱۔

(۳) بخاری ۲۹۶/۱ باب بیع التصاویر التی لیس فیہا روح۔

فعليك بهذا الشجر وكل شئ ليس فيه روح (۱)

اس طرح کی متعدد روایات ہیں جو مطلقاً ذی روح کی تصویر کو ناجائز قرار دیتی ہیں۔ چنانچہ فقہاء کی ایک بڑی جماعت نے جاندار کی تصویر کو مطلقاً اور بہر صورت حرام قرار دیا ہے اس سلسلے میں امام نووی کی وضاحت خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے، فرماتے ہیں:۔

وقال اصحابنا وغيرهم من العلماء تصوير صورة الحيوان شديد التحريم وهو الكبائر (۲)

ہمارے اصحاب اور دوسرے اہلِ علم کا کہنا ہے کہ حیوان کی تصویر شدید حد تک حرام ہے اور کبائر میں سے ہے۔

تصویریں بطریق احترام

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جاندار کی تصویریں بھی اس وقت حرام ہیں جب کہ لٹکی ہوئی ہوں، بلند مقام پر ہوں اور اس طرح رکھی گئی ہوں کہ تصویر کی تعظیم کا احساس ہوتا ہو، چنانچہ ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ:۔

كان في بيتي ثوب فيه تصاوير فجعلته الى سهوة في البيت فكان النبي يصلي اليه فقال يا عائشة! اخريه عني قالت فنزعته فجعلته وسائد (۳)

میرے گھر میں کپڑا تھا جس میں تصویریں تھیں، میں نے اسے طاق میں رکھدیا، حضورؐ اس کی طرف نماز پڑھنے لگے پھر ارشاد فرمایا، اے عائشہ! اس کو مجھ سے دور کر دے، پس میں نے اس کو اتار کر تکیہ بنا دیا۔

---

(۱) شرح مسلم ۱۹۹/۲۔
(۲) صحیح مسلم مع النووی ۲۰۱/۲۔
(۳) نسائی عن ابی ہریرۃ، باب التصادیر ۳۰۰/۲۔

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے ایک مصوّر پردے کے حجرۂ اقدس میں موجودگی کی وجہ سے آنے سے انکار کر دیا اور آپؐ سے کہا کہ یا تو آپؐ ان تصویروں کے سر کاٹ دیں یا اس کو فرش بنا دیں؛ فاما ان تقطع رؤسھا او تجعل بساطاً یوطأ (۱) چنانچہ کتب حدیث کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض صحابہ اور اجلۂ تابعین نے مصور تکیے استعمال کیے ہیں۔

فقہاء اور سلف صالحین کی ایک بڑی جماعت اسی کی قائل رہی ہے۔

شارح بخاری علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ رقمطراز ہیں:۔

...... وخالف الآخرون هؤلاء المذكورين وهم النخعي والثوري وابوحنيفة ومالك والشافعي واحمد فى رواية وقالوا اذا كانت الصور على البسط والفرش التى توطأ بها الاقدام فلا باس بها واما اذا كانت على الثياب والستائر ونحوهما فانها تحرم ــــ وقال ابو عمر ذكر ابن القاسم قال كان مالك يكره التماثيل فى الاسرة والقباب واما البسط والوسائد والثياب فلا باس به (۲)

دوسرے لوگوں نے ان مذکورہ حضرات سے اختلاف کیا ہے اور وہ نخعی، ثوری، ابوحنیفہ، مالک، شافعی اور ایک... روایت کے مطابق احمد ہیں۔ ان حضرات نے کہا کہ تصویریں بستروں اور فروش پر ہوں جو پاؤں سے روندے جاتے ہوں تو کوئی حرج نہیں۔ کپڑے، پردے وغیرہ پر ہوں تو حرام ہیں۔ ابو عمر ابن قاسم کے حوالہ سے امام مالک سے ناقل ہیں کہ آپ تخت اور گنبدوں پر تصویریں مکروہ سمجھتے تھے، فروش، تکیوں اور کپڑوں پر نہیں۔

ابن عابدین شامیؒ متاخرین میں جن کا پایۂ علمی محتاج اظہار نہیں صاحب ہدایہ سے نقل کرتے ہیں:

---

(۱) نسائی عن ابی ہریرہؓ باب التصاویر ۲/۳۰۱۔ (۲) عمدۃ القاری ۱۲/۴۰۔

ولو كانت الصورة على وسادة ملقاة او على بساط مفروش لا يكره لانها تداس وتوطأ (۱)	پڑے ہوئے تکیے یا بچھے ہوئے بستر پر تصویر ہو تو مکروہ نہیں کہ اسے روندا جاتا ہے۔

. . . .

پھر آگے وضاحت کرتے ہیں کہ دراصل دو صورتوں میں تصویر کی کراہت ہے، ایک اس وقت جب اس کی تعظیم کی صورت اختیار کی جائے۔ دوسرے اس وقت جب غیر مسلموں سے تشبہ پیدا ہو جائے، جیسے نماز کے وقت سامنے کھڑی کر کے تصویر رکھنا، یا ایسی تصویریں جن کی غیر مسلم پرستش کرتے ہیں۔

الذی یظهر من کلامهم ان العلة اما التعظیم او التشبه (۲)	ان کے کلام سے یہ بات ظاہر ہے کہ اصل علت تصویر کی تعظیم یا تشبہ ہے۔

جو حضرات فرش وغیرہ کی تصویر کو درست کہتے ہیں ان کے پاس جیسا ذکر کیا گیا متعدد روایات اور آثار موجود ہیں جن میں بعض نہایت واضح اور سند کے اعتبار سے بھی قوی ہیں مثلاً حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ناقل ہیں کہ ان کا ایک پردہ تھا جس پر پرندہ کی تصویر تھی، آپؐ جب تشریف لاتے تو اس کا سامنا ہوتا، آپؐ نے فرمایا: اسے ہٹا دو "حولی هذا" کہ میں جب داخل ہوتا ہوں اور نظر پڑتی ہے تو دنیا یاد آتی ہے (۳)

اب دیکھئے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتداءً آپؐ نے منع ہی نہیں فرمایا پھر منع کیا تو دنیا یاد آنے کو علت قرار دیا، پھر صرف ہٹانے کا حکم دیا، نہ پھاڑنے کا اور نہ تصویر کو مسخ کرنے کا، بلکہ ایک اور سند میں صراحت ہے کہ آپ نے قطع کرنے کا حکم نہیں فرمایا (۴)

---

(۱) رد المحتار ۱/۴۳۵ (۲) حوالۂ سابق ص: ۴۳۶۔
(۳) صحیح مسلم ۲/۲۰۰۔
(۴) حوالۂ سابق۔ فلم یأمرنا رسول اللہ۔

تاہم جو لوگ ایسی تصویروں کو بھی منع کرتے ہیں، ان کے حق میں بھی بعض صریح حدیثیں موجود ہیں مثلاً حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: میں اپنی غلطی سے بارگاہ خداوندی میں تائب ہوں۔ آپؐ نے فرمایا: یہ گدا کس کے لئے ہے؟ عرض کناں ہوئیں، اس لئے کہ آپؐ تشریف رکھیں اور اس کا تکیہ لیں۔ فرمایا: ان تصویر والوں کو قیامت کے دن عذاب ہوگا (۱)

بے سایہ تصویریں

۴۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مجسمے حرام ہیں، وہ تصویریں جو کپڑے وغیرہ پر منقش ہوں، ممنوع نہیں ہیں۔ بسرؓ راوی ہیں کہ زید بن خالد بیمار ہوئے، ہم عیادت کے لئے گئے تو دروازہ پر ایسا پردہ پایا جس میں تصویر تھی، میں نے عبداللہ خولانی سے دریافت کیا کہ اس سے پہلے تو حضرت زیدؓ نے تصویروں کی ممانعت کی بابت نقل کیا تھا۔ عبیداللہؓ نے کہا: حضرت زید کا فقرہ نہیں سنا تھا کہ اس سے وہ تصویر مستثنیٰ ہے جو کپڑے پر نقش ہو۔ "الا رقماً فی ثوب (۲)" اس مضمون کی ایک روایت حضرت سہل بن حنیف سے بھی مروی ہے؛ حضرت ابوطلحہؓ بیمار تھے۔ آپؐ نے ایک شخص کو بلایا کہ گدا نکال دے، حضرت سہلؓ نے وجہ دریافت کی، ابوطلحہؓ نے فرمایا! اس میں تصویریں ہیں، سہلؓ نے کہا: کیا آپؐ نے نہیں فرمایا، وہ تصویریں ممنوع نہیں جو کپڑے پر نقش ہو۔ "الا ما کان رقماً فی ثوب"۔ جواب دیا، ہاں، مگر دل کو یہی بھاتا ہے ولکنہ اطیب لنفسی (۳)۔

---

(۱) بخاری باب من کرہ القعود علی الصورۃ ۲/۸۰، ۸۱۔ نیز صحیح مسلم ۲/۲۰۱۔

(۲) صحیح بخاری مع الفتح ۱۰/۳۲۰۔

(۳) ترمذی نے اس حدیث کے متعلق کہا ہے: ہذا حدیث حسن صحیح ۱/۲۰۸ باب ما جاء فی الصورۃ۔

اسی بنا پر سلف صالحین ہی کے زمانہ سے ایک گروہ ایسی تصویر کی حرمت کا قائل رہا ہے جو سایہ دار ہو یعنی مجسمے۔ بے سایہ تصویریں جیسے کاغذی تصویریں ان کے نزدیک جائز ہیں، عینی کا بیان ہے: وقال قوم انما کرہ من ذلک ما له ظل ولا ظل له فلیس به بأس (۱) امام نووی نے بھی ایک جماعت علماء سے ایسی تصویروں کا جواز نقل کیا ہے (۲) اور اسی بنا پر قاضی عیاض نے صرف سایہ دار تصویر یعنی مجسمہ کی حرمت پر اجماع و اتفاق نقل کیا ہے اور اس سے بھی گڑیا کو مستثنیٰ رکھا ہے: وقال عیاض واجمعوا علی منع ما کان له ظل (۳)

شیخ عبدالرحمٰن جزیری ؒ مالکیہ کا مسلک ان الفاظ میں نقل کرتے ہیں:

ثانیها ان تکون مجسدة سواء کانت ماخوذة من مادة تبقی کالخشب والحدید والعجین والسکر اولا کقشر البطیخ ..... اما اذا لم تکن مجسدة کصورة الحیوان والانسان التی ترسم علی الورق والثیاب والحیطان والسقف ففیها خلاف	تصویر کے حرام ہونے کی دوسری شرط یہ ہے کہ وہ مجسم ہو چاہے وہ باقی رہنے والے مادہ جیسے لکڑی، لوہا، گوندھا ہوا آٹا اور شکر سے بنی ہو یا ناپائدار مادہ مثلاً خربوزہ کے چھلکے سے بنی ہو ...... اگر حیوان اور انسان کی صورت کی طرح مجسمہ نہ ہو جو کپڑے، کاغذ، دیوار اور چھت پر نقش کیا جاتا ہے تو اس میں اختلاف ہے ....
اربعها ان یکون لها ظل فان کانت مجسدة ولکن لا ظل لها بان بنیت فی الحائط ولم یظهر منها سوی شیئ	تصویر کے حرام ہونے کی چوتھی شرط یہ ہے کہ وہ سایہ دار بھی ہو، اگر وہ مجسمہ کی شکل ہو لیکن سایہ دار نہ ہو مثلاً دیوار میں اس طرح

(۱) عمدۃ القاری ۱۲/۴۰۔

(۲) شرح مسلم ۲۰/۱۹۹

(۳) عمدۃ القاری ۱۲/۴۰۔

لاظل لہ فانہا لاتحرم۔ بنائی گئی ہو کہ اس کا سایہ نہ بن پاتا ہو تو وہ حرام نہیں۔

مشرکانہ تصویریں:

اسی طرح بعض روایات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ممانعت کی اصل وجہ یہ ہے کہ تصویر بتدریج آدمی کو شرک تک پہنچا دیتی ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جب بعض ازواج مطہرات نے حبش کے گرجاؤں کی خوبصورتی اور تصویروں کا ذکر کیا تو آپ کو ناگواری ہوئی۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا:

اولئك اذا مات فيهم الرجل الصالح بنوا على قبره مسجد اُثم صوروا فيه تلك الصور، اولئك شرار خلق الله۔ (۱) ان میں سے جب کسی نیک شخص کی موت ہوتی تھی تو اس کی قبر پر مسجد بنا دیتے تھے پھر اس میں تصویریں بنا دیتے تھے۔ یہ لوگ بدترین مخلوق ہیں۔

اسی بنا پر آپؐ جس چیز میں "صلیب" پاتے اسے گھر میں نہیں رہنے دیتے

كان لا يترك في بيته شيئاً فيه صليب (۲)

چنانچہ شامی کا بیان ہے:

والظاهر انه يلحق به الصليب وان لم يكن تمثال ذى روح لان فيه تشبها بالنصارىٰ (۳) ظاہر یہ ہے کہ اس کا حکم صلیب کا ہوگا اگرچہ اس میں جاندار کا مجسمہ نہ ہو، کیوں کہ اس میں نصاریٰ سے مشابہت ہے۔

اس کا تقاضا ہے کہ ذی روح ہوں یا غیر ذی روح، دیوار میں آویزاں

---

(۱) باب بناء المسجد علی القبر، بخاری ۱/۱۷۹۔ مسلم عن عائشہ رضؓ۔

(۲) نسائی کتاب اللباس عن عائشہ رضؓ۔ (۳) رد المحتار ۱/۴۳۵۔

ہوں یا نہ ہوں اور بڑی ہوں یا چھوٹی، جن تصویروں کی کسی قوم اور طبقہ میں پرستش ہوتی ہوں وہ حرام ہوں گی۔

بعض اور احکام

یہ حکم تو نمایاں تصاویر سے متعلق ہے، چھوٹی تصویریں جو بے تکلف پہچان میں نہ آتی ہوں، جائز ہیں: ولو کانت صغیرۃ بحیث لا تبدو للناظر الا بتأمل. لا یکرہ (۱) خزانۃ الروایات سے نقل کیا گیا ہے کہ پرندہ کی مقدار جو تصویر ہو وہ مکروہ ہوگی، اس سے چھوٹی تصویر مکروہ نہ ہوگی: ان کانت مقدار طیر مکروہ و ان کانت اصغر فلا (۲) سر کٹی تصویریں بھی جائز ہیں، یہی حکم ایسی تصویر کا ہے جس کا کوئی عضو محو کر دیا گیا ہو کہ اس کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا: او محوۃ عضو لا تعیش بدونہ (۳)

خلاصہ یہ ہے کہ:

(۱) مجسمے جو سایہ دار ہوں ان کی حرمت پر اجماع ہے جیسا کہ قاضی عیاضؒ نے نقل کیا ہے۔

(۲) غیر ذی روح کی تصویریں جائز ہیں بہ شرطیکہ کوئی قوم اسکی پرستش نہ کرتی ہو۔

(۳) چھوٹی تصویریں ذی روح کی بھی جائز ہیں جیسے روپے اور انگوٹھی وغیرہ کی تصویریں۔ البتہ چھوٹی اور بڑی کی تحدید میں اختلاف ہے بعض حضرات کے نزدیک بڑی وہ ہے جو بے تکلف پہچان میں

---

(۱) ہندیہ ۱/۱۰۷۔ (۲) رد المحتار ۱/۴۳۷۔

(۳) در مختار علی الرد ۱/۴۳۷۔

آجائے اور بعضوں کے نزدیک وہ جو پرندہ سے کم حجم کی ہو۔

(۴) ذی روح کی بڑی بے سایہ تصویروں کے سلسلہ میں فقہاء کے اندر اختلاف ہے۔ سلف صالحین کی ایک جماعت اور خصوصیت سے فقہاء مالکیہ کا ایک طبقہ اس کے جواز کا قائل ہے جب کہ اکثر فقہاء اس کو اصلاً ناجائز کہتے ہیں۔

(۵) جو لوگ ذی روح کی تصویروں کو ناجائز قرار دیتے ہیں اُن میں بھی بعض بہر صورت اس کو منع کرتے ہیں لیکن اکثر فقہاء کی رائے ہے کہ یہ ممانعت اس وقت ہے جب کہ اس کو بطریق احترام رکھا جائے، فرش، کپڑے اور تکیہ میں ایسی تصویر ہو تو مضائقہ نہیں۔

(۶) ضرورتاً مثلاً پاسپورٹ، شناختی کارڈ، بس وریلوے پاس، مجرموں کی شناخت کے لئے تصویروں کی حفاظت یا کسی بڑی قومی مصلحت کے تحت تصویر کشی جائز ہوگی کہ دشواریوں کی وجہ سے احکامِ شرع میں سہولت پیدا ہو جاتی ہے؛ المشقة تجلب التيسير

(۷) جو تصویریں ناجائز ہیں ان کا کھینچنا اور کھچوانا دونوں ناجائز ہے اور ایسی تصویر کشی کا پیشہ بھی درست نہیں۔

آٹھواں باب

تفریح و ادب

انسانی فطرت میں یہ بات رکھی گئی ہے کہ وہ اپنی ذہنی اور فکری تکان کو دُور کرنے اور طبیعت کو تازہ دم کرنے کے لئے چند ساعت فرحت و انبساط کے ساتھ گذار دے، یہ ذوق جسمانی حرکات کے سانچہ میں ڈھلتا ہے تو کھیل کود اور ورزش و ریاضت کی صورت اختیار کرتا ہے اور تخیلات کا روپ دھارتا ہے تو شعر و سخن، طنز و مزاح اور ادب و آرٹ سے موسوم ہوتا ہے۔

اسلام نے انسان کے اس ذوق کی تسکین کا سامان بھی فراہم کیا ہے البتہ اس بات کا خیال رکھا ہے کہ یہ ذوق لطیف اپنا سفر صحیح سمت اور صحیح رُخ پر کرے۔

شعر و سخن

شعر گوئی اور شعر سے دلچسپی ایک حد تک علم اور زبان کی فطرت میں داخل ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اشعار کلام کی نہایت زود اثر صنف ہے اور اس کے ذریعہ کم الفاظ میں زیادہ مؤثر ڈھنگ سے بات کہی جا سکتی ہے، تاہم یہ بھی ایک حقیقت

ہے کہ شعراء نے اپنی زبردست صلاحیت کا استعمال ذہن و اخلاق کی تعمیر کے لئے کم اور اپنے رکیک جذبات کے اظہار کیلئے زیادہ کیا ہے، غالباً ان ہی دونوں جہتوں کو سامنے رکھ کر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے کہیں اس کی تعریف کی ہے اور کہیں اس کی مذمت۔ آپؐ نے شعر کی تاثیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ قریش پر تیر سے زیادہ سخت ہے (۱) اور شعر کے مضمون کے بارے میں فرمایا کہ بعض اوقات اس میں حکمت کی باتیں ہوتی ہیں ان من الشعر لحکمۃ (۲) ایک اور روایت میں اشعار کے ذریعہ دشمن کے مقابلہ کو جہاد باللسان فرمایا گیا (۳) دوسری طرف زبان حق ترجمان نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ شعر سے پیٹ بھرنے سے بہتر پیپ سے پیٹ بھرنا ہے (۴) قرآن نے شعراء کے بارے میں فرمایا:

الشعراء یتبعھم الغاوٗن۔ بے راہ لوگ ہی شعراء کی پیروی کرتے ہیں۔ (الشعراء: ۲۲۴)

لیکن دراصل آپؐ کے ان ارشادات میں کوئی تضاد نہیں ہے، اصل یہ ہے کہ شعر فی نفسہٖ ایک ذریعۂ اظہار ہے، اگر صحیح مقاصد کا اظہار پیشِ نظر ہو تو عین بہتر ہے اور غلط افکار کی نمائندگی کی جائے تو مذموم ہے۔ خود آپؐ کے ایک ارشاد سے اس کی وضاحت ہوتی ہے۔ حضرت عائشہ راوی ہیں کہ آپؐ کے سامنے شعر کا ذکر آیا تو فرمایا کہ وہ بھی ایک کلام ہے، اچھی بات کہی گئی ہو تو اچھا ہے، بُری بات کہی گئی ہو تو بُرا ہے، ھو کلام فحسنہ حسنٌ وقبیحہ قبیحٌ (۵) خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسّان سے اشعار پڑھوائے ہیں اور دعائیں دی ہیں کہ اے اللہ روح القدس کے ذریعہ

---

(۱) مسلم عن عائشہ مشکوٰۃ بحوالۂ مسلم ۲/۴۰۹۔

(۲) بخاری عن ابی بن کعب ۲/۹۰۸ باب ما یجوز من الشعر۔

(۳) مشکوٰۃ عن کعب بن مالک، الفصل الثانی باب البیان بالشعر /۴۱۰۔

(۴) مسلم عن سعد، کتاب الشعر ۲/۲۴۰۔

(۵) مشکوٰۃ بحوالۂ دار قطنی کتاب الشعر، الفصل الثالث /۴۱۰۔

ان کی مدد فرما(۱) ایک موقعہ پر حضرت حسّان اسلام کی طرف سے مدافعت کے اشعار پڑھ رہے تھے، آپؐ نے ان کے لئے مسجد نبوی میں منبر رکھوائے۔(۲)

اچھے اشعار کبھی کبھی آپؐ خود بھی پڑھتے، لبید کا شعر ؎

الا کل شیٔ ماخلا اللہ باطل　　خدا کے سوا ہر چیز فانی ہے۔

تو آپ کو بہت ہی پسند تھا(۳) ——— غزوۂ خندق کے موقعہ سے جب اپنے پروانوں کے ساتھ خود چراغ نبوتؐ بھی خندق کھودنے اور اس کی مٹی ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے میں مصروف تھا، زبانِ مبارک پر یہ اشعار جاری تھے، ؎

واللہ لولا ما اھتدینا　　ولا تصدقنا ولا صلینا

فانزلن سکینۃ علینا　　وثبت الاقدام ان لاقینا

ان الاولیٰ قد بغوا علینا　　اذا ارادوا فتنۃ ابینا(۴)

اگر اللہ (کا کرم) نہ ہوتا تو راہِ ہدایت نہ پاتے　　صدقہ ادا کرتے اور نہ نماز پڑھتے۔

اے اللہ تو ہم پر سکینت نازل فرما　　دشمنوں سے مڈبھیڑ ہو تو ہمیں ثابت قدمی عطا فرما۔

لوگوں نے ہمارے ساتھ شرارت کی ہے　　جب انہوں نے کوئی فتنہ اٹھایا تو ہم نے ان کی بات ماننے سے انکار کردیا۔

پیغمبر اسلامؐ اور شعر گوئی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوں تو شعر گوئی سے شغف نہیں رکھتے تھے لیکن بعض دفعہ ایسا ہوا ہے کہ بے تکلف اور بے ساختہ آپ کی زبان پر چند مصرعے موزوں

---

(۱) بخاری عن عبدالرحمن بن عوف ۱/۶۴۔

(۲) بخاری عن عائشہ۔　　مشکوٰۃ بحوالہ بخاری /۴۱۰۔

(۳) مسلم عن ابی ہریرہ، کتاب الشعر ۲/۲۳۹۔

(۴) بخاری عن براء بن عازب باب غزوۃ الخندق ۲/۵۸۹۔

ہو گئے، اسی غزوۂ خندق کے موقع سے جب انصار جوش میں یہ شعر پڑھتے ؎

نحن الذین بایعوا محمداً — علی الجهاد ومابقینا ابداً

ہم لوگ وہ ہیں جنہوں نے حضرت محمدؐ سے جہاد پر بیعت کی ہے جبتک ہم زندہ رہیں۔
تو اپنے وفاداروں اور سرفروشوں کے اس رجزیہ شعر کا جواب ان دعائیہ کلمات میں زبان مبارک سے نکلتا ؎

اللّٰھم لاعیش الا عیش الاٰخرۃ — فاغفر للانصار والمهاجرۃ (۱)

اے اللہ آخرت کے سوا کوئی زندگی نہیں — انصار اور مہاجرین کی مغفرت فرما۔

ایک غزوہ کے موقع سے کہ آپ کی انگلی زخمی اور خوں آلود ہو گئی تھی، ارشاد ہوا:

هَل انت الا اصبع دمیتِ — وفی سَبیل اللّٰہِ مَا لقیتِ (۲)

اے انگلی! تو اللہ کے راستہ میں زخمی اور خون آلود ہوئی۔ کوئی بڑی آزمائش سے دوچار نہ ہوئی

یہ اور اس طرح کے مصرعے جو کبھی اتفاقاً زبان مبارک سے جاری ہوئے ہیں شعر گوئی کا مصداق نہیں بلکہ بے ارادہ بے تکلف اور بے ساختہ فقرے ہیں جو موزون ہو گئے ہیں (۳) البتہ آپ کے متعدد صحابہ حضرت علی، حضرت حسان، حضرت کعب اور حضرت عبداللہ ابن رواحہ وغیرہ بلند پایہ شعراء میں تھے اور ان کے سامنے ہمیشہ اسلام کی سربلندی ہوا کرتی تھی اسی لئے فقہاء نے بھی مباح اشعار کے پڑھنے کو جائز قرار دیا ہے، اشعار میں عورتوں کا اور ان کے حسن وجمال کا اس طرح ذکر جس سے سفلی جذبات غیر معتدل ہو جائیں جائز نہیں البتہ اگر مطلق عورت کے اوصاف بیان کئے جائیں، متعین زندہ عورت کے اوصاف بیان نہ کئے جائیں اور وہ جیسا کہ مذکور ہوا، نفسانی جذبات برانگیختہ کرنے والے نہ ہوں تو جائز ہے (۴)، اگر آدمی دوسرے اور بہتر ضروری کاموں کو چھوڑ کر مشق سخن میں لگا ہے تو یہ

---

(۱) بخاری عن انس باب غزوۃ الخندق ۲/۵۸۹۔

(۲) بخاری عن جندب باب مایجوز من الشعر ۲/۹۰۸

(۳) مرقاۃ المفاتیح ۴/۶۱۳ — (۴) دیکھئے عالمگیری ۵/۳۵۱۔

بھی مکروہ ہے (۱) اچھے اشعار پر انعام دیا جائے تو قباحت نہیں کہ آپ نے حضرت کعبؓ کو اپنی چادر عنایت فرمائی تھی، لیکن اشعار پڑھ کر اس کی اجرت طلب کرنا اور اس کو ذریعہ معاش بنا لینا جائز نہیں (۲)

ناول افسانے

شعر و سخن کی طرح ادب کی دوسری اہم صنف نثر ہے۔ نثر کبھی تو وقائع نگاری کے لئے استعمال کی جاتی ہے اور کبھی مفروضہ کردار اور واقعات کے لئے جو آج کی زبان میں ناول اور افسانے کہلاتے ہیں، قدیم زمانہ میں بھی اس قسم کی کہانی نویسی کی مثالیں موجود ہیں۔ شیخ سعدیؒ کی گلستاں اور مولانا روم کی مثنوی کہا جا سکتا ہے کہ ایسی کہانیوں کا شاہکار اور معراجِ کمال ہے۔

اگر یہ مفروضہ کہانیاں عبرت آموز اور نصیحت خیز ہوں، صالح مقصد کی حامل ہوں اور تعمیری ہوں تو نہ صرف جائز بلکہ بہتر ہیں ——— لیکن اگر ان کا مقصد سفلی جذبات کو برانگیختہ کرنا اور اباحیت اور اخلاقی انارکی پیدا کرنا ہو تو ظاہر ہے کہ سخت گناہ اور ناجائز ہیں۔ ہاں ایسی تحریریں جن کا مقصد اسلام کی حفاظت و اشاعت ہے عظیم ترین عبادت ہے اور یہی اس حدیث کا مصداق ہے کہ علماء کے قلم کی روشنائی اور شہداء کا خون دونوں قیامت میں ہم وزن ہوں گے۔

تقریر و خطابت کے آداب

تقریر و خطابت کو اسلام میں دعوتِ دین اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر

---

(۱) الفتاویٰ الہندیہ ۵/۳۵۱۔

(۲) رد المحتار ۵/۲۷۲۔

کا ایک اہم ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ اسی مقصد کے تحت جمعہ و عیدین اور بعض دوسرے مواقع پر خطبات رکھے گئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنی نبوت کا اعلان بھی ایک مؤثر اور مدلل خطاب ہی کے ذریعہ فرمایا۔ خطاب میں مؤثر لب و لہجہ اور اسلوب کا اختیار کرنا کہ لوگوں پر اس کا اثر ہو، بُری بات نہیں۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبات عربیت کے لحاظ سے نہایت بلیغ، سادگی کے باوجود نہایت مؤثر، جامع اور پُر معنی ہوا کرتے تھے۔ غزوۂ حنین کے بعد حجۃ الوداع کے موقعہ سے اور اسی طرح بعض دوسرے موقعوں پر آپؐ نے جو خطبات ارشاد فرمائے ہیں وہ اتنے پُرتاثیر ہیں کہ آج بھی ان کو پڑھ کر آنکھیں نم ہوتی ہیں ——— البتہ اس میں تکلف اور تصنع کو آپؐ نے پسند نہیں فرمایا، ارشاد ہوا: ھلك المتنطعون۔ شارحین حدیث نے لکھا ہے کہ "متنطعون" سے مراد وہ لوگ ہیں جو فصاحت و بلاغت میں تکلف کرتے ہوں اور از راہِ تصنع انتہائے حلق سے آواز نکالتے ہیں (۱) ایک اور روایت میں ہے کہ تم میں سب سے زیادہ مبغوض اور قیامت کے دن مجھ سے دور وہ لوگ ہوں گے جو بدخلق، بہت گفتگو کرنے والے (ثرثارون) غیر محتاط اور تضحیک آمیز باتیں کرنے والے (متشدقون) اور کبر آمیز باتیں کہنے والے (متفیھقون) ہوں گے (۲)

تقریر میں رنگ آمیزی کے لئے جھوٹے واقعات اور موضوع اور غیر مستند روایات کا نقل کرنا عظیم ترین کبیرہ گناہوں میں سے ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے جانتے بوجھتے مجھ پر جھوٹ کہا تو اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔ بلکہ جب تک کسی مستند کتاب، صاحبِ نظر عالم سے تحقیق نہ ہو جائے ہر سنی اور دیکھی ہوئی روایت کا نقل کرنا جائز نہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ کسی آدمی کے جھوٹے ہونے کے لئے کافی ہے کہ وہ

---

(۱) ۔۔۔ۃ ۴/۶۱۱۔

(۲) ۔۔۔ۃ بحوالہ بیہقی عن ابی ثعلبہ الخشنی، کتاب الشعر ۴/۱۰۔

ہر سنی ہوئی روایت کو نقل کردے کفی بالمرء کذباً ان یحدث بکل ما سمع (۱)۔ صحابہؓ اس بارے میں اس درجہ محتاط تھے کہ وہ آپ کی طرف منسوب کرکے کسی روایت کو بیان کرتے تو مارے خوف کے پسینہ آجاتا اور ازراہِ احتیاط اخیر میں یہ بھی فرماتے تھے کہ اوکما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ افسوس کہ ہمارے زمانے کے غیر محتاط واعظین اور رلانے ہنسانے کے خوگر مقررین محض اپنی تقریر میں رنگ وآہنگ پیدا کرنے کے لئے نہایت بے احتیاطی سے صحیح وغیر صحیح روایات کا استعمال کرتے ہیں۔ والی اللہ المشتکی۔

بعض لوگ اپنی خداداد صلاحیت کا فائدہ اٹھا کر وعظ فروشی شروع کردیتے ہیں اور اپنی تقریروں کی قیمت متعین رکھتے ہیں بلکہ سامانِ خرید وفروخت کی طرح بھاؤ تاؤ سے بھی باز نہیں آتے۔ یہ ایک قبیح عادت ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے قربِ قیامت کی علامت قرار دیا کہ لوگ اپنی زبان کو معاش کا ذریعہ بنالیں (۲)

ہاں اگر کسی شخص نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو اپنا مقصد بنالیا ہے اور وہ کسی دینی ادارے یا اسلامی حکومت کی طرف سے اس کام پر مامور ہے تو اس کے لئے اس کی تنخواہ لینی جائز ہے، اسی طرح مسلمانوں کے مطالبہ پر جو لوگ دور دراز کا سفر کریں ان کا کرایہ کی رقم لینا یا لوگوں کا بطور خود کسی مطالبہ کے بغیر تعاون کرنا اور اس تعاون کو قبول کرنا یہ سب جائز ہوگا۔

مزاح وظرافت

ادب کی ایک صنف مزاح وظرافت ہے، بات یہ ہے کہ انسان دنیا میں مسائل کے درمیان گھرا رہتا ہے، فطرت تقاضا کرتی ہے کہ انسان کبھی ساعت دو ساعت ذہن کو اس بوجھ سے آزاد کرے۔ اسی لئے ربّ کائنات نے نیند کا نظام رکھا جو بیداری

---

(۱) مسلم ۱/۱۸۔
(۲) مشکوٰۃ بحوالہ مسند احمد عن سعد بن ابی وقاص کتاب الشعر ۲/۴۱۰۔

کی تکان کو اتارتی ہے، انسانی ذہن و دماغ کے ساتھ بھول اور نسیان کا رشتہ بھی جوڑ دیا کہ اس سے غم غلط ہوتا ہے اور دماغی الجھنیں کم ہوتی ہیں۔ اسی مقصد کے لئے انسان مزاح اور ظرافت کا سہارا لیتا ہے، اس سے باہمی محبت اور الفت بھی بڑھتی ہے، مساوات و برابری کا اظہار ہوتا ہے اور دوسروں کو ایک لحہ خوش ہونے کا موقعہ میسر آتا ہے، پس شریعت نے بھی مزاح کو جائز رکھا ہے۔ خود انسان کامل پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم مزاح فرمایا کرتے تھے۔

حدیث کی کتابوں میں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ ایک شخص نے جنابِ قدسؐ میں سواری کی درخواست کی، فرمایا کہ میں اونٹنی کا بچہ دے سکتا ہوں۔ سائل نے عرض کیا کہ اونٹنی کے بچہ سے بھلا کیا ہوگا؟ آپؐ نے فرمایا کہ ہر اونٹ اونٹنی ہی کا بچہ تو ہوتا ہے (۱) ایک صاحب سے مزاحاً کہا کہ اے دو کانوں والے (۲) ایک بوڑھی خاتون آئیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ بوڑھی عورت جنت میں داخل نہیں ہوگی۔ وہ قرآن پڑھا کرتی تھیں، کہنے لگیں، بوڑھی عورتوں کا کیا قصور کہ وہ جنت میں نہیں جائیں گی، ارشاد فرمایا کہ تم نے قرآن نہیں پڑھا کہ اللہ تعالیٰ ان پر ان کی جوانی لوٹا دیں گے۔ مقصد یہ ہے کہ بڑھاپے کی حالت میں وہ نہیں جائیں گی (۳) ———— کبھی کبھی آپؐ عملاً بھی مزاح فرمایا کرتے زاہر بن حرام آپ کے دیہاتی ساتھی تھے، آپؐ ان سے ایک گونہ بے تکلف تھے، شکل و شباہت بہت اچھی نہ تھی، ایک دن اپنا سامان بیچنے میں مصروف تھے۔ آپؐ آن دیکھی میں پیچھے سے آئے اور پکڑ لیا۔ انہوں نے نہیں سمجھا، کہنے لگے، کون ہیں؟ مجھے چھوڑ دو۔ پھر جب گوشۂ چشم سے دیکھا تو اپنی پشت سینۂ مبارک سے تبرکاً چمٹانے لگے، آپؐ نے فرمایا کہ کون اس غلام کو خریدے گا، حضرت زاہر نے کہا کہ آپ مجھے معمولی اور کھوٹا سودا پائیں گے۔

---

(۱) ترمذی عن انس باب ماجاء فی المزاح ۲/۲۰۔
(۲) ابو داؤد عن انس باب ماجاء فی المزاح ۲/۶۸۳۔
(۳) مشکوٰۃ المصابیح عن انس باب المزاح /۴۱۶۔

ارشاد ہوا: لیکن تم خدا کی نظر میں کھوٹے نہیں (۱)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بے تکلفی اور شفقت صحابہ میں بھی یہ ہمت پیدا کرتی تھی کہ وہ گاہے ماہے آپؐ سے مذاق کرلیا کرتے اور مزاح میں بھی آپکے احترام کی پوری رعایت کرتے۔ عوف بن مالک اشجعیؓ اور حضرت عمرؓ وغیرہ سے آپکے سامنے ایسی گفتگو کرنا ثابت ہے جس سے ہنسی آئے (۲) تاہم اس باب میں بھی غلو اور افراط شریعت کو پسند نہیں اور نہ ایسا مزاح پسند ہے جو لطف و محبت میں اضافہ کے بجائے ایذاء اور محبت میں کمی کا سبب ہوجائے، اسی پسِ منظر میں آپ سے مزاح کی ممانعت بھی منقول ہے ولا تمازح (۳)

مزاح کے اصول میں یہ بھی ہے کہ اس میں جھوٹی اور غلط بات نہ کہی جائے۔ ایک بار حضرت ابوہریرہؓ نے آپ سے تعجب کے ساتھ عرض کیا۔ آپ بھی ہم لوگوں سے مزاح فرماتے ہیں؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا: بہر طور میری زبان سے سچ کے سوا کچھ اور نہیں نکلتا لا اقول الاحقاً (۴) ______ ملا علی قاریؒ نے امام نووی سے مزاح کے سلسلہ میں شریعت کے نقطۂ نظر کو بڑے جچے تلے الفاظ میں اسطرح نقل کیا ہے:

"وہ مزاح جس سے منع کیا گیا ہے ایسا مزاح ہے جس میں افراط ہو اور کثرت و دوام ہو اس کی وجہ سے کثرت سے ہنسی آتی ہے، قلب میں سختی پیدا ہوتی ہے، اللہ کی یاد اور دین کی اہم باتوں میں غور و فکر سے غفلت پیدا ہوتی ہے، بسا اوقات ایذا اور حسد کا باعث ہوجاتا ہے اور رعب و وقار کو ختم کردیتا ہے۔ ایسا مزاح جو ان باتوں سے خالی ہو، مباح ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کبھی فرمایا کرتے تھے اور مقصود مخاطب کی تالیف اور ان سے اُنس کا اظہار ہوا کرتا تھا جو کہ محبوب سنت ہے" (۵)

---

(۱) مشکوٰۃ، الفصل الثانی باب المزاح /۴۱۶۔
(۲) دیکھئے مشکوٰۃ المصابیح باب المزاح کی آخری حدیثیں /۴۱۷۔
(۳) ترمذی عن ابن عباس باب ماجاء فی المراء ۲/۲۰۔
(۴) ترمذی فی الشمائل عن ابی ہریرۃ، باب ماجاء فی صفۃ مزاح رسول اللہؐ /۱۶۔
(۵) مرقاۃ ۴/۶۴۸۔

لطیفہ گوئی اور طنزیات میں زبان کو ذریعہ بنایا جائے یا قلم کو ان ہی اصولوں کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے، اور ہاں ایسا مزاح جو تعمیری مقصد کے لیے نہ ہو بلکہ وقتی تفریح کے لیے ہو، کو مستقل مشغلہ بھی نہ بنانا چاہیے، نیز لطیفہ گوئی کو ذریعہ معاش بنانا اور اس کی اجرت وصول کرنا فقہاء کی نگاہ میں مکروہ اور ارشادِ خداوندی من یشتری لھو الحدیث (لقمان: ۶) کا مصداق ہے (۱)

ترنم و موسیقی

گانا اور بجانا بھی ان امور میں سے ہے جو انسانی طبیعت پر گہرا اثر ڈالتا ہے اور اس کو متاثر کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں شریعت کے عام اصول وہی ہیں جو اشعار کے سلسلہ میں ہیں یعنی اگر اشعار غلط جذبات کو ہوا دینے والے ہوں اور ہیجان انگیز ہوں، ان کا سننا اور سنانا تو بہر حال کراہت سے خالی نہ ہوگا۔ اسی طرح اگر عورتیں غیر محرم اور اجنبی مردوں کے درمیان آکر گائیں تو یہ بھی ناجائز ہی ہوگا کہ شریعت نے اس باب میں جو احتیاط برتی ہے یہ اس کے خلاف ہے، اسی طرح اگر گانے کے ساتھ مزامیر اور دوسرے آلات ہوں تو اس طرح گانا بجانا بھی جائز نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے۔ عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ تم گانا اور موسیقی کے سننے سے بچو ایاکم واستماع المعازف والغناء (۲) حضرت علی کی ایک روایت میں امت کے ایک طبقہ پر عذاب کا اندیشہ ظاہر کیا گیا ہے جو شراب پیتے ہوں، ریشم پہنتے ہوں اور دف بجاتے ہوں (۳) البتہ اگر ان مفاسد سے بچ کر ترنم سے اشعار پڑھے اور سنے جائیں تو مضائقہ نہیں۔

علامہ شامی نے نقل کیا ہے کہ گانے (غناء) کا اطلاق اس وقت ہوگا جب کہ

---

(۱) درمختار و رد المحتار ۵/۲۷۲۔

(۲) کنز العمال عن ابن مسعود ۱۹/۱۶۰۔

(۳) کنز العمال ۱۹/۱۶۲۔

تین باتیں پائی جائیں، اشعار ہوں ان کو لحن کے ساتھ پڑھا جائے اور اس کے ساتھ تالی بجائی جائے، اگر ان میں سے کوئی ایک بات نہ پائی جائے تو اس پر غنا اور گانے کا اطلاق نہ ہوگا۔ اسی طرح ایسے اشعار پر گانے کا اطلاق ہوگا جس میں کسی متعین زندہ مرد یا عورت کے اوصاف بیان کئے جائیں، شراب کی ترغیب ہو یا کسی مسلمان کی ہجو ہو اور یہی پڑھنے والے کا مقصود ہو، اگر اس کو عربی زبان کے کسی اسلوب کو ثابت کرنے یا فصاحت بلاغت کے سیکھنے کیلئے پڑھا جائے یا ایسے اشعار ہوں جس میں اچھے مضامین ہوں ان کو ترنم سے پڑھنے میں کوئی مضائقہ نہیں جب تک کہ آلات موسیقی کی شرکت نہ ہو، نیز صوفیاء کے یہاں قوالی اور ان احکام کی رعایت کے بغیر سماع اور وجد وحال کی جو رسم جاری ہے وہ مکروہ اور دین میں بے اصل ہے (۱) فقہ حنفی کی مشہور کتاب بزازیہ سے نقل کیا گیا ہے کہ ڈھول، طبلہ وغیرہ کی آواز کا سننا حرام ومعصیت اور وہاں بیٹھنا فسق ہے (۲) کسی کی تعیین کے بغیر ایسے اشعار جس میں عارض وگیسو اور قد وقامت اور عورتوں اور امردوں کے دوسرے اوصاف ذکر کئے جائیں، ان کا گانا بھی اہل دین کے لئے مناسب نہیں اور ایسے لوگوں کے درمیان پڑھنا جن پر ہوا اور نفسانیت کا غلبہ ہو، ناجائز ہے، آلاتِ موسیقی کے ساتھ گانا گانے اور سننے کی حرمت ائمہ اربعہ کے درمیان متفق علیہ ہے (۳)

ان تفصیلات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ موجودہ زمانہ میں جن مختلف آلات موسیقی کا استعمال کیا جاتا ہے وہ جائز نہیں ہیں۔

صحت افزا کھیل وورزش

ایسے کھیل جس سے جسمانی قوت یا سواری وغیرہ میں مہارت پیدا ہو جائز ہے۔

---

(۱) شامی ۲۲۲/۵۔

(۲) درمختار علی ہامش الرد ۲۲۲/۵۔

(۳) الفقہ الاسلامی وادلتہ ۵۷۴/۳۔ احیاء علوم الدین ۲/ ۲۶۹ ـ ۲۶۸ کتاب آداب السماع والوجد۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ثنیۃ الوداع اور مسجد بنو حنیف کے درمیان گھوڑ دوڑ کرائی ہے (۱)، نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیر اندازی اور شمشیر زنی اونٹ اور گھوڑے وغیرہ کی دوڑ میں مسابقت کی حوصلہ افزائی فرمائی ہے (۲) اسی لئے فقہاء نے مختلف جانوروں کے علاوہ پیدل دوڑ کو بھی مستحب قرار دیا ہے، نیز اس پر انعام کا مقرر کیا جانا بھی درست ہے، البتہ انعام اور شرط کے جائز ہونے کی تین صورتیں ہیں:

۱۔ کوئی تیسرا شخص جو دوڑ میں شامل نہ ہو۔ شرکاء میں سے سبقت لانے والے کے لئے انعام کا اعلان کرے۔

۲۔ دو شخص شریک ہوں لیکن شرط ایک ہی جانب سے ہو مثلاً رشید و حمید میں سے اگر رشید سبقت لے جائے تو حمید اسے حسبِ شرط مال ادا کرے، حمید سبقت لے جائے تو رشید کچھ ادا نہ کرے۔

۳۔ تین یا اس سے زیادہ آدمی شریک ہوں، دو آدمیوں میں یہ شرط ہو کہ ہم دو میں سے جو سبقت لے جائے اس کو دوسرا مشروط رقم ادا کرے گا، بقیہ دوسرے اشخاص کے لئے کوئی شرط نہ ہو۔ اگر تمام شرکاء کے ساتھ اس طرح کی شرط ہو کہ سبقت لے جانے والے کو مشروط و مقرر مال ادا کریں گے تو یہ جوا ہو گا اور اس طرح کا کھیل جائز نہیں ہو گا (۳)

موجودہ زمانہ میں بھی جن کھیلوں سے جسمانی ورزش ہوتی ہے جیسے کبڈی فٹ بال، والی بال یا گاڑیوں کی ریس وغیرہ۔ ان کے احکام اسی طرح کے ہوں گے جو گھوڑ دوڑ وغیرہ کے ہیں۔

---

(۱) نسائی باب اضمار الخیل للسبق ۲/۱۲۴

(۲) نسائی عن ابی ہریرۃ باب السبق ۲/۱۲۵۔

(۳) درمختار ۵/۲۵۸۔

دفاع میں معاون کھیل

ایسے ہی وہ کھیل جن سے دفاع اور حفاظت کی قوت پیدا ہوتی ہو، نہ صرف جائز بلکہ مستحسن ہیں۔ اوپر گذر چکا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیر اندازی کی حوصلہ افزائی فرمائی ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اہل حبش نیزوں سے کھیلتے تھے (۱) تیر اندازی کے مقابلہ میں تو بعض دفعہ آپ نے بہ نفسِ نفیس شرکت فرمائی ہے (۲)۔

اس لئے موجودہ زمانہ کے وہ تمام کھیل جس سے آدمی اپنی حفاظت کے لائق ہوسکے، نہ صرف درست بلکہ مستحسن ہوں گے مثلاً کشتی کھیلنا، کراٹے، لاٹھی چلانا، مکابازی وغیرہ۔ فقہاء شافعیہ نے صحیح لکھا ہے کہ تیرنا اور بندوق کا نشانہ کرنا وغیرہ کھیل جائز ہیں (۳)۔

تاہم خیال رہے کہ کھیل کود اور ورزش کا یہ جواز اس وقت ہے جب کہ شریعت کے احکامِ ستر کی پوری پوری رعایت ہو اور لڑکے اور لڑکیوں کا اختلاط نہ ہو۔

شطرنج اور بعض نئے کھیل

شطرنج کے ساتھ اگر جوا بھی ہو تب تو اس کے ناجائز ہونے پر اتفاق ہے ہی اگر جوا نہ ہو تب بھی اکثر فقہاء کے نزدیک گناہ اور حرام ہے (۴) حضرت علیؓ کا کچھ شطرنج کھیلنے والوں پر گذر ہوا تو فرمایا یہ کیسے بت ہیں جن پر تم جھکے پڑے ہو

---

(۱) بخاری باب اللعب بالحراب ونحوھا ۴۰۶/۱۔

(۲) بخاری باب التحریض علی الرمی ۴۰۸/۱۔

(۳) درمختار علی ہامش الرد ۲۵۹/۵۔

(۴) الفقہ الاسلامی وادلتہ ۵۷۲/۲ نیز دیکھئے الجامع لاحکام القرآن ۲۹۱/۶۔

ماھٰذہ التماثیل التی انتم لھا عاکفون۔

اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ جن لوگوں کو شطرنج سے دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے وہ واقعی اور حقیقی مسائل سے بے توجہ ہو جاتے ہیں کیوں کہ یہ ایسا کھیل ہے کہ انسان کے اندر جسمانی تکان نہیں ہوتی اور وہ بلا قید و تحدید وقت کھیلتا چلا جاتا ہے، جو کھیل جسمانی مشقت اور ورزش کے ہوتے ہیں ان کو مسلسل اور بہت دیر تک کھیلا نہیں جا سکتا۔ اسی لئے فقہاء نے شطرنج اور عام کھیلوں کے درمیان فرق ۔۔۔۔ کیا ہے اس لئے صحیح یہی ہے کہ اگر قمار اور جوا نہ ہو تب بھی شطرنج کراہت سے خالی نہیں (۱)

مجھے خیال ہوتا ہے کہ فی زمانہ کرکٹ کا مروجہ کھیل شطرنج ہی کے حکم میں ہے اور ضروری اور حقیقی مسائل سے غفلت پیدا کرنے میں کہا جا سکتا ہے کہ شطرنج سے بھی بڑھ کر ہے اور یہی حکم کیرم بورڈ اور لوڈو (Ludo) وغیرہ کا ہونا چاہیئے۔

واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) اگر شطرنج کے ساتھ جوا نہ ہو تو امام شافعی اور ایک روایت کے مطابق امام ابو یوسفؒ اسے مباح قرار دیتے ہیں۔ درمختار علیٰ ہامش الرد ۲۵۲/۵۔

نواں باب

نکاح وطلاق

انسان کے اندر جو طبعی تقاضے رکھے گئے ہیں ان میں ایک اہم چیز اپنی صنف مخالف کی طرف رجحان ومیلان ہے، بچپن میں یہ جذبہ محدود ہوتا ہے لیکن انسان جوں جوں بلوغ کی طرف قدم بڑھاتا ہے اس تقاضائے طبعی میں شدت پیدا ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ بعض اوقات اس کی شدت جنون کی سرحد تک پہونچ جاتی ہے، نظامِ قدرت کچھ ایسا ہے کہ صنفِ مخالف کی ایک ایک ادا اور اس کے حرکت وسکون کا ایک ایک سماں اس آگ کو بھڑکاتا اور شعلہ بار کرتا جاتا ہے۔ پھر ربِّ کائنات نے اپنی اس حسین اور خوبصورت دنیا میں قدم قدم پر ایسے محرکات ودواعی رکھدیئے ہیں جو اس کے تقاضائے صنفی کو حرکت دیتے اور بڑھاتے رہتے ہیں، چاند کی ٹھنڈک، گلاب کی رنگت، موتیوں اور بیلوں کی خوشبو، بادِ نسیم کے جھونکے، ساون کی بہار اور برسات کا نکھار، اِن میں سے کوئی چیز نہیں جو انسان کے نفسانی جذبات کیلئے مہمیز کا کام نہ کرتی ہوں، اور پھر خود انسان نے اپنے ان جذبات کے نشو ونما اور

بقاء وارتقاء کے لئے کیا کچھ سامان نہیں کیا ہے؟ نغموں کی شیرینی اور شاعروں کی خیال آرائی اور بلند پروازی ان سب سے سوا ہے۔

غور کرو کہ فاطرِ کائنات کی طرف سے قرار و اطمینان سے محرومی اور اضطراب وبے سکونی کے یہ سامان حضرت انسان کے لئے کیوں کئے گئے ہیں؟ اسی لئے کہ انسان کے ورع و احتیاط، اطاعت و فرمانبرداری اور تقویٰ و رضا جوئی کا امتحان لیا جا سکے اور اس سے بڑھ کر دوسرا مقصود یہ ہے کہ نسلِ انسانی کی افزائش اور اس میں تسلسل برقرار رہے، پھر افزائش نسل کی ایک صورت یہ ہو سکتی تھی کہ عصمتِ انسانی بھی ہوا اور پانی کی طرح عام اور بے قید ہو۔ لیکن اس میں جو بے اعتدالی، بے غیرتی و بے حیائی، منافست باہمی، نسل انسانی کی اپنی شناخت سے محرومی اور اعتماد و اعتبار کا فقدان ظہور میں آتا، اور اس سے معاشرہ میں جو بگاڑ اور فساد پیدا ہوتا وہ محتاجِ اظہار نہیں، تاریخ میں کئی ایسے مراحل آئے ہیں جب حیوان نما انسانوں اور شیطان حقیقی کو شرمندہ کر دینے والے شیطانوں نے اس کا تجربہ کیا ہے، ایسا تجربہ کہ جس کے ذکر اور تصور سے بھی حیا کا لہو ٹپکتا ہے۔ روم پر وہ دور انحطاط جب طوائف بننا معاشرہ کیلئے ایک آئیڈیل تھا اور مزدک کی وہ تحریک جس میں ماں اور بہن بیٹی کی تمیز بھی روا نہیں تھی، اس کی شرمناک مثالیں ہیں اور افسوس کہ مغرب کی جاہلیتِ جدیدہ نے ایک بار پھر تہذیب و ثقافت کے پیرہن میں ملبوس ہو کر اسی تاریخ بد انجام کو دُہرانے کی سعی کی ہے۔

وَالَی اللّٰہِ المشتکیٰ

اس افراط کے مقابلہ اس تفریط کا ظہور ہوا کہ مرد و زن کے رشتۂ صنفی کو بہر طور ایک ناپاکی اور نجاست تصور کر لیا گیا اور ناقابلِ عفو گناہ ٹھیرایا گیا، روم میں بھی بے قید اباحت کے مقابلہ یہی ردعمل پیدا ہوا اور ایران میں

بھی مزدک کی تحریک کے مقابلہ مانی کی تحریک شروع ہوئی جس نے رہبانیت کو جنم دیا اور اس رہبانیت نے فکر و خیال میں ایسی شدت پیدا کردی کہ اولاد کی نگاہ میں خود ماں باپ کا وجود ایک گناہ ٹھیرا، بلکہ انسانوں کو خود اپنے آپ سے گھن آنے لگی کہ وہ بھی ایک گناہ اور غلطی کا نتیجہ ہے، اس فکری بے اعتدالی سے انسانی سماج میں جو نفرت، بے رحمی اور بے مروتی وجود میں آئے گی اور انسانی معاشرت سے فرار کے جذبات پروان چڑھیں گے نسل انسانی کی افزائش میں جو کمی واقع ہوگی اور فطرت انسانی پر غیر طبعی روک لگانے کی وجہ سے جو اخلاقی نفسیاتی اور طبی نقصانات ہوں گے وہ ظاہر ہیں۔

اسلام نے جو دین فطرت ہے اور ایک طرف فطرت انسانی کی رعایت بھی کرتا ہے اور دوسری طرف اس کی تہذیب بھی، اس نے اس باب میں بھی وہی اعتدال و توازن کی راہ اختیار کی ہے، ایک طرف جائز راستہ سے اس تقاضے کی تکمیل کے لئے نکاح کو نہ صرف جائز بلکہ مستحسن قرار دیا اور دوسری طرف زنا کے بارے میں اسی درجہ سختی اور شدت برتی۔

واقعہ ہے کہ جو شخص بھی نکاح کے بارے میں اسلام کے معتدل و متوازن تصورات کا مطالعہ کرے گا، اس کو فطرت کی میزان پر پرکھے گا اور مذاہبِ عالم کے نقطۂ نظر سے مقابلہ کرے گا اس کی روح وجد میں آئے گی اور اس کی زبانِ دل بے ساختہ اسلام کی قانون فطرت سے ہم آہنگی، اعتدال و توازن اور رب کائنات کی طرف سے اس کے نزول وحصول کا اعتراف کرے گا کہ ان الدین عند اللہ الاسلام۔

نکاح کی حوصلہ افزائی

اسلام نے نکاح کی نہ صرف اجازت دی ہے بلکہ اسے پسند کیا ہے اور اس کی ترغیب دی ہے اور تجرد کی زندگی کو منع کیا ہے، مسلم سماج کے بے نکاح لوگوں کے نکاح کی طرف توجہ دلاتے ہوئے ارشاد ہوا وانکحوا الایامی منکم (نور - ۳۲) عورتوں کی تجرد کی زندگی کو روکتے ہوئے فرمایا گیا ولا تعضلوھن ان ینکحن ازواجھن (البقرۃ - ۲۳۲) انبیاء کے اوصاف میں یہ بات شمار کی گئی کہ وہ شادی شدہ اور صاحبِ اولاد ہوا کرتے تھے ولقد ارسلنا رسلاً من قبلک وجعلنا لھم ازواجاً وذریۃ (رعد - ۳۸) اپنے صالح بندوں کی اس دعا کو سراہا گیا کہ وہ سکون بخش بیوی اور اولاد کے لئے خدا کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہیں ربنا ھب لنا من ازواجنا وذریتنا قرۃ اعین (فرقان - ۷۴)

حدیثیں بھی کثرت سے نکاح کی ترغیب اور حوصلہ افزائی کے سلسلہ میں موجود ہیں، آپؐ نے نوجوانوں کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے جو نکاح کی استطاعت رکھتا ہو وہ ضرور ہی نکاح کر لے "من استطاع منکم الباءۃ فلیتزوج (۱) کچھ صحابہؓ نے یہ ارادہ کیا کہ وہ نکاح نہیں کریں گے تو آپؐ نے اس پر ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا اور فرمایا کہ میں تم میں سب سے زیادہ صاحبِ تقویٰ اور صاحبِ خشیت ہوں اس کے باوجود عورتوں سے نکاح کرتا ہوں تو جس نے میرے طریقہ سے انحراف کیا وہ مجھ میں سے نہیں ہے (۲) آپؐ نے نکاح کو نہ صرف اپنی سنت بلکہ اللہ کے رسولوں اور نبیوں کی سنت قرار دیا (۳) نیز آپؐ نے نکاح کی حاجت پیدا ہونے کے

---

(۱) بخاری ۲/۷۵۸ باب قول النبیؐ من استطاع منکم الخ۔

(۲) اتزوج النساء ومن رغب عن سنتی - بخاری، باب الترغیب فی النکاح ۲/۷۵۷۔

(۳) مجمع الزوائد بحوالہ طبرانی عن ابن عباس ۴/۲۵۳ وفیہ اسماعیل بن شیبہ قال الذہبی: واہن۔

بعد ابتداءِ عمر میں ہی نکاح کو پسند فرمایا اور اس بات کی طرف اشارہ فرمایا کہ یہ عمل اس کی شیطان کی دام سے حفاظت کرتا ہے (۱) بعض صحابہ نے اس لئے تجرد کی زندگی گذارنے کی اجازت چاہی کہ اپنا وقت زیادہ سے زیادہ عبادت میں استعمال کر سکیں لیکن آپؐ نے اس کو بھی ناپسند فرمایا اور اجازت نہیں دی[۲] خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف قبائل میں متعدد نکاح فرمائے ہیں۔

نکاح کا حکم

نکاح کے بارے میں ان تاکیدات اور خود لوگوں کی ضروریات و حالات کو سامنے رکھتے ہوئے فقہاء نے تعیین کی ہے کہ کن حالات میں شرعی نقطۂ نظر سے نکاح کی کیا اہمیت ہوگی؟

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر نکاح نہ کرنے کی صورت میں گناہ میں مبتلا ہو جانے کا اندیشہ ہو تو نکاح واجب ہوگا تاکہ اپنے آپ کو پاک دامن رکھ سکے اور حرام سے بچا رہے۔ جنسی تقاضہ کے اعتبار سے نکاح کی حاجت رکھتا ہو لیکن اس درجہ شدید تقاضہ نہ ہو کہ نکاح نہ کرنے کی صورت میں گناہ میں پڑ جائے، اپنے نفس کے بارے میں مطمئن ہو تو ایسے شخص کو نکاح کر لینا چاہیئے۔ بعضوں نے ان حالات میں نکاح کو مسنون اور بعضوں نے مستحب لکھا ہے مگر اصل میں ان حالات میں نکاح سنت سے کم درجہ نہیں اور جن حضرات نے مستحب لکھا ہے ان کا بھی مقصود یہی ہے (۳)

---

(۱) مجمع الزوائد بحوالۂ طبرانی عن جابر ۴/۲۵۳۔

(۲) بخاری، باب مایکرہ من التبتل والخصاء۔

(۳) وکثیرا مایتساہل فی اطلاق المستحب علی السنۃ، ردّ المحتار ۲/۲۶۴۔

روایات اس بارے میں جس کثرت اور قوت کے ساتھ منقول ہیں ان کا بھی یہی تقاضہ ہے۔
وہ شخص جس میں جنسی خواہش نہ ہو اور صنفی تعلقات سے معذور ہو، خواہ پیدائشی طور پر ایسا ہو، یا درازی عمر اور بیماری وغیرہ کی وجہ سے ایسا ہوا ہو، اس کو نکاح نہیں کرنا چاہیئے اس لیئے کہ وہ نکاح کے واجبات کی ادائی اور بیوی کی عصمت وعفت کی حفاظت سے قاصر و عاجز ہے (۱) ہاں اگر کوئی سن رسیدہ شخص اپنی عمر ہی کے لحاظ سے سن رسیدہ عورت سے نکاح کرلے تاکہ بڑھاپے میں ایک دوسرے کی خدمت کرسکیں تو مضائقہ نہیں۔ اس لئے کہ اس کے اس عمل کی وجہ سے عورت کی بے عفتی کا اندیشہ نہیں۔

زمانۂ جاہلیت کے نکاح

اسلام سے پہلے نکاح کے نام پر مختلف ایسے طریقے رائج تھے جو فحاشی و بے حیائی کی بدترین مثال تھے، چنانچہ ام المؤمنین حضرت عائشہ رضؓ سے مروی ہے کہ جاہلیت میں چار قسم کے نکاح ہوتے تھے، پیشہ ور فاحشہ عورتیں اپنے دروازے پر جھنڈا نصب کردیتیں جو ان کے پیشہ کی علامت ہوتی، ایسی عورتوں کے پاس مرد آتے، اس کو "نکاح رایات" کہا جاتا۔ دوسری قسم "نکاح رھط" کی تھی، ایک قبیلہ یا علاقہ کے متعدد لوگ ایک عورت سے مقاربت کرتے اور وہ عورت ان کے علاوہ کسی اور مرد سے تعلق نہیں رکھتی پھر ولادت کے بعد مشابہت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ان میں سے کسی ایک کی طرف مولود بچہ کی نسبت کرتی، تیسری قسم "نکاح استبضاع" کی تھی، عورت شریف اور اچھے لڑکے کے حصول کیلئے مختلف قبائل کے ممتاز لوگوں سے جنسی تعلق قائم کرتی (۲) اسلام نے نکاح کی ان تمام

(۱) المغنی ۷/۳۔۵ "ملخص" (۲) شرح مہذب ۱۷/۰۳

حیا سوز طریقوں کو منع کر دیا اور نسوانیت کو اس تذلیل واہانت سے نجات بخشی۔

اسلام کا طریق نکاح

اسلام نے نکاح کا جو طریقہ مقرر کیا وہ نہایت آسان، سادہ، صرفہ اور اخراجات کے لحاظ سے سہل ہے۔ اسلام کے طریقہ نکاح کا خلاصہ یہ ہے کہ دو بالغ مرد وعورت دو گواہوں کے سامنے ایک دوسرے کے ساتھ ازدواجی رشتہ کو قبول کر لیں (۱) عاقدین میں کوئی ایک یا دونوں نابالغ ہوں تو ان کے اولیاء کا نکاح کو قبول کرنا اور معاملہ کو طے کرنا ضروری ہوگا (۲) لڑکی بالغہ ہو تو احناف کے نزدیک اس کی طرف سے ولی کا مجلس نکاح میں ایجاب و قبول کا طے کرنا بہتر ہے لیکن اگر وہ خود بھی نکاح کو قبول کر لیں تو کافی ہے (۳) اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: الایم احق بنفسھا من ولیھا (۴) لڑکی خود اپنے نفس کی زیادہ حقدار ہے، قرآنِ مجید نے ایک سے زیادہ مواقع پر خود عورت کی طرف نکاح کی نسبت[5] کی ہے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ام المؤمنین حضرت ام سلمہؓ سے بلا ولی کے توسط کے بغیر نکاح کیا اور یہی شریعت کے عام اصول و قواعد کا تقاضہ ہے۔ اس لئے کہ نکاح ایک عقد اور معاملہ ہے اور شریعت نے تمام عقود اور معاملات میں عورت کی شخصیت کو ہر طرح مستقل مانا ہے۔

---

(۱) ہدایہ ۲/۲۰۶۔

(۲) ہدایہ ۲/

(۳) مبسوط ۵/۱۰۔

(۴) مسلم ۱/۴۵۵۔

(۵) بقرۃ: ۲۳۰۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ عورت کی طبعی حیا کا تقاضہ ہے کہ اس کی پسند اور رضامندی کو ملحوظ رکھا جائے لیکن براہ راست ایجاب وقبول کی ذمہ داری اس پر نہ رہے۔ اس بنا پر شریعت نے بالغہ لڑکی کی طرف سے بھی ولی کی وساطت کو بہتر اور مستحب قرار دیا اور یہی منشا ہے ان روایات کا جن میں عورت کے نکاح کیلئے ولی کی ضرورت ظاہر کی گئی ہے اور اس کی تاکید کی گئی ہے (۱) ——— دوسرے فقہاء نے عورتوں کے نکاح کے لئے ولی کی موجودگی کو ایک ضروری شرط مانا ہے (۲) نکاح کے اس سیدھے سادے طریقہ کا دوسری اقوام کے طریقۂ نکاح سے موازنہ کیا جائے تو اسلام کی شانِ رحمت کا اندازہ ہوتا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ اسلام نے نکاح کے معاملہ میں اعلام واظہار کو پسند کیا ہے اسی لئے نکاح کے لئے گواہوں کی موجودگی کو ضروری قرار دیا گیا[۳] نکاح کے اعلان کا حکم فرمایا گیا ہے (۴) اور اعلانِ نکاح کے لئے دف وغیرہ بجانے کی اجازت دی گئی ہے (۵) مسجد میں نکاح کرنے کو بہتر قرار دیا گیا ہے جہاں فطری طور پر لوگوں کا اجتماع ہوتا ہے پھر اس کے ساتھ دعوتِ ولیمہ بھی جوڑ دی گئی ہے تاکہ اعزہ واقرباء، دوست احباب پوری طرح واقف ہو جائیں لیکن فی زمانہ عقدِ نکاح کے لئے جو تکلفات کئے جاتے ہیں، دُور دراز سے نکاح میں شرکت کے لئے آتے ہیں، ایک شہر سے دوسرے شہر باراتیں جاتی ہیں اور لڑکی والوں کو ان کے لئے پر تکلف کھانوں کا نظم کرنا پڑتا ہے، پھر تمام دوست

---

(۱) مشکوٰۃ، باب الولی واستیذان المرأۃ فی النکاح۔

(۲) ہدایہ ۲/۴/۳۱۴، باب الاولیاء والاکفاء۔

(۳) مجمع الزوائد ۴/۲۸۵ باب ماجاء فی الولی والشہود۔

(۴) ترمذی ج: ۱، باب ماجاء فی اعلان النکاح۔

(۵) حوالۂ سابق۔

احباب اور اعزہ واقربا ربادات میں شرکت کو اپنا حق جانتے ہیں، یہ تمام مزاجِ شریعت کے قطعاً مغائر، ناپسندیدہ اور غلط ہے، ہاں اتنا ضرور ہے کہ گواہان نکاح کے علاوہ کچھ صالحین اور نیک لوگوں کو جمع کرلینا آدابِ نکاح میں سے ہے[۱]۔

متعہ

نکاح کے اس شریفانہ طریقہ کے علاوہ اور کوئی صورت اسلام نے روا نہیں رکھی، اس کے سوا جتنی صورتیں تھیں ان میں سے کوئی بھی بے حیائی سے خالی نہیں ـــــــــــــ اس میں شبہ نہیں کہ اسلام نے ابتداءً زمانۂ جاہلیت کے ایک اور طریقہ نکاح نکاحِ متعہ کو جائز رکھا تھا جس میں ایک یا چند دن کے لئے باہم مقررہ مہر پر نکاح کیا جاتا تھا۔ لیکن بعد کو چل کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بھی منع فرمادیا۔ ایک روایت میں آپؐ نے صاف ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اب قیامت تک کے لئے متعہ کو حرام قرار دیا ہے[۲]۔ سیدنا حضرت علیؓ بھی شدت سے متعہ کی حرمت کے قائل تھے اور اس سلسلہ میں انہوں نے عبداللہ بن عباس کی فہمائش بھی کی تھی (۳) عبداللہ بن عباس کی طرف بعض لوگوں نے متعہ کے جواز کی نسبت کی ہے حالانکہ وہ بھی ابتداءً اضطرار کی حالت میں نکاح متعہ کے جواز کے قائل تھے، ایسے اضطرار میں کہ جس میں انسان کے لئے سوّر تک کھانا جائز ہو جاتا ہے (۴) لیکن بعد میں انہوں

(۱) احیاء علوم الدین ۲/۳۶۔

(۲) مسلم عن سبرۃ الجہنی ۱/۴۵۱۔

(۳) مجمع الزوائد ۴/۲۶۵، باب نکاح المتعہ۔

(۴) حوالۂ سابق بحوالۂ طبرانی عن سعید بن جبیر۔

نے اس سے رجوع فرمالیا تھا (۱) اس لئے متعہ کی حرمت پر امت کا اجماع ہے اور صرف روافض ہی ہیں جو اس شنیع طریقہ کو جائز قرار دیتے ہیں۔

نکاحِ حلالہ

نکاحِ متعہ سے قریبی ایک اور مسئلہ اس نکاح کا ہے جو طلاقِ مغلظہ کی وجہ سے علیحدہ ہونے والی عورت کو اس کے شوہر اول کیلئے حلال کرنے کی نیت سے کیا جاتا ہے ـــــــــــ صورتِ حال یہ ہے کہ شریعت نے تین طلاق کو روکنے اور مرد کو متنبہ کرنے کی غرض سے تین طلاق کے بعد عورت کو اس پر کلیۃً حرام قرار دیا ہے اور اب دوبارہ ازدواجی رشتہ کے حلت کی ایک ہی صورت رہ جاتی ہے کہ وہ کسی مرد کے نکاح میں جائے اور صنفی تعلقات کے ذریعہ وہ ایک دوسرے سے محظوظ ہوں۔ اب اس کے بعد وہ شوہرِ اول کیلئے حلال ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ ظاہر ہے کہ وہ ایک غیرت مند شوہر کی غیرت کیلئے شدید چوٹ کا درجہ رکھتی ہے۔

مگر بعض لوگوں نے اس کے لئے یہ بہانہ تلاش کر لیا کہ وہ کسی مطلقہ عورت کا کسی مرد سے دن دو دن کا نکاح کرا لیتے، وہ مرد ہم بستری کے بعد اسے طلاق دیدیتا تاکہ وہ شوہر اول کے نکاح میں آسکے اور نکاح کے وقت ہی یہ جان رہا ہوتا کہ وہ محض عارضی اور وقتی ضرورت کی تکمیل کے لئے نکاح کر رہا ہے اور اس عورت کے ساتھ مستقل ازدواجی زندگی گذارنے میں سنجیدہ نہیں، نکاح کی یہ صورت بعینہٖ متعہ کے مماثل ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ نکاحِ متعہ میں عاقدین معاہدۂ نکاح کے وقت صراحۃً اس نکاح کے عارضی اور وقتی

---

(۱) اکثر شارحینِ حدیث نے اس کو نقل کیا ہے۔

ہونے کا اظہار کردیتے ہیں اور اس نکاح میں یہ بات ان کے دل میں ہوتی ہے، زبان تک نہیں آتی، اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شدت کے ساتھ اس پر ناگواری کا اظہار فرمایا بلکہ اللہ تعالیٰ کی لعنت بھیجی ہے جو ایک صاحبِ ایمان کو بے چین کردینے اور تڑپا دینے کے لئے کافی ہے (۱) البتہ اگر کوئی شخص ایسا کر ہی گذرے تو نکاح منعقد ہوگا یا نہیں؟ اس میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔

عام فقہاء کی رائے یہی ہے کہ نکاح منعقد ہوجائے گا، وہ عورت شوہرِ اول کے لئے حلال ہوجائے گی (۲) البتہ فقہاءِ حنابلہ اور احناف میں قاضی ابو یوسف ایسے نکاح کو تحلیل کے لئے ناکافی قرار دیتے ہیں (۳) ______ صحیح یہی ہے کہ گو ایسا شخص عنداللہ سخت عاصی اور گنہ گار ہے اور یہ طرزِ عمل مذموم اور نہایت ناپسندیدہ ہے لیکن حلت پیدا کرنے کیلئے کافی ہے، اس لئے کہ خود اس حدیث میں بھی شوہرِ دوم کو حلال قرار دینے والا (محلل) اور شوہرِ اول کو محلل لہٗ (جس کے لئے عورت کو حلال کیا گیا) قرار دیا گیا ہے اور اسلامی قانون میں ایسی نظیریں موجود ہیں کہ ایک فعل بجائے خود ممنوع اور ناپسندیدہ رہتا ہے لیکن اس سے جو نتائج اور اثرات متعلق ہوتے ہیں وہ بہرحال ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

نکاح کے مقاصِد

اَب ایک نظر ان مقاصد پر بھی ڈالنا مناسب ہوگا جن کے لئے اسلام نے نکاح کو نہ صرف جائز قرار دیا ہے بلکہ اس کو معاملات سے بڑھ کر عبادات کے خانہ میں جگہ دی ہے اور جن کی وجہ سے مسلمانوں کے بڑے طبقہ کی نگاہ میں تاہل کی زندگی

---

(۱) لعن اللہ المحلل والمحلل لہٗ۔ ابوداؤد، باب التحلیل ۱/۲۸۴۔

(۲) دیکھئے شرح مہذب ۱۶/۲۴۹، ہدایہ ۲/

(۳) المغنی ۷/۱۲۸۔

تجرد کی اس زندگی سے افضل ہے جس میں نفل عبادت میں اپنا وقت مصروف رکھا جائے کہ احکام ہمیشہ مقاصد کے تابع ہوتے ہیں اور مقاصد کو سمجھے بغیر نہ اس شعبہ کے متعلق کسی نظامِ حیات کے مزاج و مذاق کو سمجھا جاسکتا ہے اور نہ احکام کی تفصیلات کو۔

اسلام کی نگاہ میں نکاح کا اصل مقصود توالد و تناسل ہے، اس لئے قرآن مجید نے بیوی کو مرد کیلئے کھیتی قرار دیا ہے۔ فأتوا حرثکم انّٰی شئتم (بقرہ: ۲۲۲) پیغمبر اسلام ؐ نے مناکحت کی ترغیب دیتے ہوئے اس کو افزائشِ امت کا باعث فرمایا تناکحوا تناسلوا (۱) بعض روایات میں خاص طور پر ایسی عورت سے نکاح کرنے کی ہدایت فرمائی جس میں تولید کی قوت و صلاحیت زیادہ ہو تزوجوا الودود الولود (۲) قرآن نے صالحین اور نیکوکار بندوں سے ایک ساتھ بیوی اور اولاد دونوں کی دعا کرائی ہے ھب لنا من ازواجنا وذریاتنا قرۃ اعینٍ (فرقان: ۷۴) یہ ساری باتیں اسلام کے اس تصور کو واضح کرتی ہیں کہ نکاح کا اصل، بنیادی اور اساسی مقصود نسلِ انسانی کی افزائش ہے۔ اسی لئے شریعت اسلامی اصولی طور پر ضبطِ ولادت کے نظریہ کی حامی نہیں ہے جس کا آگے ذکر آئے گا۔

نکاح کا دوسرا اہم مقصد عفت و عصمت کی حفاظت ہے اور فطری طریقہ پر انسان کی نفسانی ضرورت کی تکمیل۔ یہی وجہ ہے کہ آپؐ نے نکاح کو ایمان کا حصہ قرار دیا ہے، آپؐ نے فرمایا کہ نکاح انسان کو بدنگاہی سے بچاتا ہے اور بے عفتی سے حفاظت کرتا ہے فانہ اغض للبصر واحصن للفرج (۳) قرآن مجید نے شادی شدہ مرد و عورت کو "محصن" اور "محصنہ" سے تعبیر کیا ہے جس کے معنی قلعہ بند کے ہیں، گویا نکاح کے ذریعہ انسان اپنے آپ کو عفت و عصمت کے قلعہ میں محفوظ کرلیتا ہے اور شیطان اس پر تسلط حاصل نہیں کرپاتا۔

---

(۱) بخاری ۲/

(۲) مشکوٰۃ ۲/۲۶۷۔ (۳) حوالۂ سابق۔

انسان کی طبیعت میں یہ بات داخل ہے کہ وہ دوسرے انسان کے ذریعہ سکون اور قرار حاصل کرتا ہے، وہ جب پیدا ہوتا ہے تو ماں کی ممتا، باپ کی شفقت اور بھائی بہنوں کا پیار اور دل کا قرار ہوتا ہے اور جوں جوں بڑا ہوتا جاتا ہے ان رشتوں سے اس کا جذباتی اور والہانہ لگاؤ کم ہوتا جاتا ہے اور بیوی اس کمی کو پورا کرتی ہے اور اگر نیک اور صالح ہو تو قلب کی ٹھنڈک اور ذہن ودماغ کی راحت کا سامان بن جاتی ہے، پھر جوں جوں عمر ڈھلتی جاتی ہے اولاد کی محبت بیوی کی محبت پر غالب ہوتی جاتی ہے لیکن موت تک اس کے لئے اصل سامانِ سکون، حزن ومسرت کی شریک، دل کے زخموں کا مرہم اور خلوت وجلوت کی ہمراز ودمساز یہی بیوی ہوتی ہے، اسی لئے قرآن نے کہا لتسکنوا الیہا (روم: ۲۱) اور میاں بیوی کے باہمی تعلق کے لئے نہایت عمدہ تعبیر" لباس" کا استعمال فرمایا کہ تم دونوں ایک دوسرے کے لئے لباس ہو ھن لباس لکم وانتم لباس لھن. (بقرۃ: ۱۸۷) کہ لباس سے زیادہ کوئی چیز جسم انسانی کی ہمراز، انسان کے خوبی و خامی سے باخبر اور موسموں کی شدت سے صحت کی محافظ نہیں ہوتی۔

غور کیا جائے تو نکاح کے تمام احکام انہی تینوں مقاصد کے گرد گردش کرتے ہیں، عدت اور ثبوتِ نسب کے تمام احکام اور تعلق ازدواجی کی بابت تمام ہدایات اسی لئے ہیں کہ افزائشِ نسل کی ضرورت پوری ہو اور نسلِ انسانی کی شناخت باقی رہے۔

نکاح سے پہلے منگیتر کو دیکھنے کی اجازت، زنا کی حرمت اور بیوی سے زن وشوہر کے تعلق کی ترغیب، ایک دوسرے کے مقتضیات نفس کی رعایت کی ہدایت، مردوں کے لئے ایک تا چار بیویوں کی اجازت وغیرہ احکام کا مقصود محض عفت وپاکدامنی اور عصمتِ انسانی کا تحفظ ہے۔

رشتہ میں زوجین کی پسند اور ضروری امور میں کفاءت کا لحاظ، حسنِ معاشرت کے احکام، طلاق کی ممانعت، لیکن جہاں نفرت نے محبت وسکون کیلئے جگہ باقی نہیں رکھی ہو، وہاں طلاق اور خلع کی اجازت اور بعض خاص امراض اور اعذار کی وجہ سے عورت کے مطالبۂ تفریق کا حق، یہ اور اس طرح کے بہت سے احکام ہیں جو اس لئے ہیں کہ زوجین کے درمیان محبت وسکون کی فضا برقرار رہے بلکہ پروان چڑھے۔

دنیا کے بعض مذاہب نے نکاح کو ایسا اٹوٹ رشتہ بنادیا ہے کہ نفرت کی بنیادوں پر بھی اس کی کھوکھلی دیوار کو قائم رکھنا ضروری ہے، مغرب کی جدید ترین تہذیب میں نکاح محض خواہشِ نفس کی تکمیل کا ایک ذریعہ ہے، نہ اس کے ساتھ توالد وتناسل کا جذبہ ہے اور نہ پائیدار محبت وسکون کی دنیا اور نہ رشتۂ نکاح کے ساتھ عفت وعصمت کی برقراری۔ اگر جاہلیت کے ان جدید وقدیم تبکدوں کا جائزہ لیا جائے اور ان کے چہروں سے تہذیب وثقافت کی مصنوعی قلعی کو کھرچ کر دیکھا جائے اور ان کا اسلام کی فطری، معتدل اور متوازن تعلیمات سے تقابل کیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسلام ہی وہ نظامِ حیات ہے کہ جس نے متوازن اصولوں اور بہترین مقاصد پر احکامِ نکاح کی بنیاد رکھی ہے اور ہر جگہ افراط وتفریط سے دامن بچائے رکھا ہے۔

منگیتر کو دیکھنا

شریعتِ اسلامی چاہتی ہے کہ رشتۂ نکاح ایک پائیدار رشتہ ہو، اس لئے وہ ابتداءً ہی ناپائیداری کے تمام دروازوں کو بند کردیتی ہے اسی لئے اس لڑکی کو دیکھنے کی اجازت دی گئی بلکہ آپ ﷺ نے اس کی ترغیب فرمائی کہ جس کو نکاح

کا پیام دیا جائے، پہلے اس کو دیکھ لیا جائے۔

اذا خطب احدکم المرأۃ فان	جب تم میں سے کوئی کسی خاتون کے یہاں نکاح
استطاع ان ینظر الی ما یدعوہ الی نکاحہا	کا پیام بھیجے تو جو چیز اس کے نکاح کی داعی بن
فلیفعل (۱)	ہے اس کو دیکھ سکے تو دیکھ لے۔

یہ بھی ضروری نہیں کہ لڑکی اور اس کے اولیاء سے پیشگی اجازت لے لے بلکہ غیر محسوس طور پر دیکھ لے تو یہ بھی کافی ہے۔ حضرت جابرؓ کی مذکورہ روایت میں خود اس امر کی صراحت ہے کہ میں نے ایک عورت کو نکاح کا پیام دیا اور چھپ کر اسے دیکھا (۲) اجازت سے بھی دیکھ سکتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے ام کلثوم صاحبزادی حضرت علیؓ کو ان کی اجازت ہی سے دیکھا تھا۔ تاہم خیال ہوتا ہے کہ بلا اظہار دیکھنا زیادہ مناسب ہے کہ لڑکی کو دیکھ کر پھر رشتہ رد کر دیا جائے تو اس کا نفسیاتی اثر اچھا نہیں ہوتا، لڑکا خود دیکھنے کے بجائے گھر کی دوسری عورتوں کے ذریعہ لڑکی دکھلوائے اور ان کی خبر پر اعتماد کرے تو یہ بھی کافی ہے، ویسے جیسا کہ مذکور ہوا لڑکا خود بھی لڑکی دیکھ سکتا ہے۔ ہندوستان میں لوگ اس کو معیوب سمجھتے ہیں، یہ صحیح نہیں۔

منگیتر کا ہاتھ اور چہرہ ہی دیکھ سکتا ہے (۳) اور کپڑے کے اوپر سے جسم کا مجموعی قد و قامت اور بس۔ عورتیں دیکھیں تو شریعت کے عام اصول و قواعد کے مطابق، ناف سے گھٹنوں تک کا حصہ چھوڑ کر جسم کے بقیہ حصے حسبِ ضرورت دیکھ سکتی ہیں (۴) البتہ لڑکے کے لئے ضروری ہے کہ نکاح کے ارادہ

---

(۱) ابوداؤد عن جابر بن عبداللہ، باب الرجل ینظر الی المرأۃ وہو یرید تزوجہا، ۲/۲۸۴۔

(۲) حوالۂ مذکور۔

(۳) حاشیہ ابوداؤد ۲/۲۸۴، مطبوعہ دہلی۔

(۴) رد المحتار ۵/۲۳۷، باب الحظر والاباحۃ۔

سے دیکھے، بدنظری مقصود نہ ہو، اگر نکاح کے ارادہ سے دیکھے تو گو شہوت کا اندیشہ ہو پھر بھی دیکھنا جائز ہے (۱) یہ ایک شرعی ضرورت ہے ———— مغربی تہذیب کی اباحیت نے یہ نعرہ بھی لگایا ہے کہ زوجین کو عقد سے پہلے ایک دوسرے کے ساتھ ایک عرصہ تک وقت بھی گذارنا چاہیئے اور باہم محبت اور پیار کے تعلقات رکھنے چاہئیں، لیکن اسلام اس طرح کے بے حیائی کے عمل کو حرام اور گناہِ عظیم تصور کرتا ہے ۔۔۔۔ اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ایک اجنبی مرد عورت کا ایک دوسرے کے ساتھ تخلیہ میں ملنا جائز نہیں (۲) اس لیئے کہ ایسا کرنا ایک عورت کے ساتھ کھلی زیادتی اور ظلم ہے کیونکہ اس تجربہ نے اگر صنفی تعلقات کے تجربہ تک پہنچادی اور پھر رشتہ نہ ہوسکا تو اس کا خمیازہ تنہا عورت ہی کو بھگتنا پڑے گا۔

پیام پر پیام

پیغام نکاح دینے میں آپؐ نے اس بات کی بھی ہدایت فرمائی کہ اگر ایک شخص کسی لڑکی کو پیام دے چکا ہو تو اب تم اپنی طرف سے پیام نہ دو لا یخطب بعضکم علیٰ خطبۃ اخیہ (۳) کہ اس سے باہم منافست، رقابت اور نفرت پیدا ہوتی ہے لیکن یہ اس وقت ہے جبکہ اس پیام میں لوگ دلچسپی لینے لگیں، اگر لڑکی کی طرف سے اس پیشکش کو رد کردیا جائے یا اس کی طرف کوئی میلان ورجحان نہ ہو تو پیام دے سکتے ہیں۔ رشتہ کی پیشکش گو لڑکے اور لڑکی کسی طرف سے بھی ہوسکتی ہے لیکن بہتر ہے کہ لڑکے کی طرف سے ہو، اکثر ازواجِ مطہرات کیلیے

---

(۱) المغنی ۷/۴۵۷۔

(۲) مشکوٰۃ المصابیح، کتاب النکاح۔

(۳) بخاری ۲/۷۷۳، کتاب النکاح۔

آپؐ نے خود نکاح کی پیش کش کی تھی، صحابہ کا عمل بالعموم اسی پر تھا، گو ایک آدھ مثال اس کے خلاف بھی ملتی ہے، اس لئے کہ لڑکی کی طرف سے نکاح کی پیشکش بہ ظاہر حیا کے خلاف محسوس ہوتی ہے اور مردوں کی طرف سے بیوی کی تلاش اس کی قوامیت اور ازدواجی زندگی میں اس کی ایک گونہ برتری کے عین مطابق ہے۔

انتخاب رشتہ کا معیار

مرد و عورت اور اولیاء رشتہ کے انتخاب و ترجیح میں کس معیار کو ملحوظ رکھیں؟ آپؐ نے اس کو بھی واضح فرما دیا ہے، آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ جب ایسے رشتے آجائیں جن کی دینی و اخلاقی حالت سے تم مطمئن ہو (من ترضون دینه وخلقه) تو قبول کرلو کہ ایسا نہ کرو گے تو فتنہ و فساد پیدا ہوگا (۱) ایک اور روایت میں ہے کہ عورتوں سے چار وجوہ کی بنا پر نکاح کیا جاتا ہے، مال، حسب و خاندان، جمال اور دین، ان میں دیندار سے شادی کر کے ازدواجی زندگی کی کامیابی حاصل کرو (۲)

پس گو نکاح میں خوبصورتی اور طبیعت کے مطابق کسی اور مرغوب وصف کو بھی معیار بنایا جاسکتا ہے جس کی طرف قرآن نے " ما طاب لكم من النساء" (جو عورت تجھے پسند ہو) کے لفظ سے اشارہ کیا ہے لیکن بہتر طریقہ یہ ہے کہ لڑکی اور لڑکے کی دینداری اور اخلاق ہی کو معیار بنایا جائے، علامہ کاسانی کا بیان ہے:

وعندنا الافضل اعتبار الدين والاقتصار عليه (۳)	ہمارے نزدیک دین کا اعتبار اور صرف اسی پر اکتفاء کرنا افضل ہے۔

---

(۱) ترمذی، کتاب النکاح ۱/۲۰۷۔

(۲) ترمذی عن ابی ہریرۃ ۱/۲۰۷ باب ماجاء فی من ترضون دینہ۔

(۳) بدائع الصنائع ۲/۲۱۷۔

کفارت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض روایات میں نکاح میں کفارت یعنی برابری اور ہمسری کا لحاظ کرنے کو کہا گیا ہے، عام طور پر اس سلسلہ میں جو حدیثیں نقل کی جاتی ہیں وہ ضعیف اور نامعتبر ہیں۔ تاہم فقہاء نے مجموعی طور پر نو امور میں کفارت کا اعتبار کیا ہے: نسب[1] وخاندان، آزادی[2] وغلامی، خاندانی مسلمان[3] یا نو مسلم ہونا، دیانت[4] وتقوی، مال اور معاشی[5] سطح، حسب[6]، پیشہ وذریعہ[7] معاش، جسمانی عیوب[8] سے محفوظ ہونا اور عقل[9] وفہم ——— لیکن حقیقت یہ ہے کہ اصل میں جو چیز قابلِ توجہ ہے وہ محض دین واخلاق ہے۔

خاندان اور برادری کے لحاظ میں غلو اسلام کی شانِ مساوات اور مذاقِ اخوت کے خلاف ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نے تم سے جاہلیت کا امتیاز اور آباء واجداد پر فخر کو ختم کر دیا ہے، انسان یا تو مؤمن تقی ہے یا فاجر شقی۔(۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ نے خود اپنے عمل کے ذریعہ اس کی مثال پیش فرمائی، آپؐ نے اپنی چچا زاد بہن حضرت زینب کا نکاح اپنے غلام حضرت زید بن حارثہؓ سے فرمایا(۲) انہی حضرت زید کے لڑکے حضرت اسامہؓ کا نکاح آپؐ نے فاطمہ بنت قیس سے فرمایا جو قریشی خاتون تھیں(۳) حضرت ضباعہ بنت زبیر بن عبد المطلب کا نکاح مقداد بن اسود سے فرمایا اور یہ بھی فرمایا کہ مقداد اور زید کا نکاح ہم نے اس طرح اس لئے کیا ہے کہ اخلاق شرافت کا معیار بن جائے" لیکون اشرفکم عند اللہ احسنکم خلقاً(۴) آپؐ کی اور آپ کے صحابہؓ کی حیات میں

---

(۱) ابو داؤد، باب التفاخر بالانساب۔

(۲) بیہقی ۷/۱۳۴۔

(۳) بخاری ومسلم۔

(۴) بیہقی ۷/۱۳۵۔

اس طرح کی مثالیں کثرت سے موجود ہیں ——— اس لئے جیسا کہ اوپر مذکور ہوا، رہن سہن، دین، حالت، دیانت اور اخلاق یہی چیزیں ہیں جو رشتہ کے انتخاب کے وقت ملحوظ رکھے جانے کے لائق ہیں، یوں انسانی طبیعتوں کے فرق کو سامنے رکھتے ہوئے خاندان، ذریعۂ معاش، معاشی سطح اور اسلام میں قدامت و جدت وغیرہ کو بھی ملحوظ رکھنے کی اجازت دی گئی ہے (۱)

خطبۂ نکاح

اسلام سے پہلے بھی زمانۂ جاہلیت میں نکاح سے پہلے خطبے دیئے جاتے تھے لیکن وہ خطبے فخر و تعلی اور نسبی تفاخر اور اپنے آباء و اجداد کی مبالغہ آمیز مدح سرائی کا مجموعہ ہوتا تھا، اسلام جس کے نزدیک سوائے دین کے کوئی چیز وجہِ تفاخر نہیں اور جو انسان سے زندگی کے ہر عمل میں تواضع و فروتنی اور عجز و انکسار کا طالب اور خدا کی حمد و ثنا اور اس سے دعا و التجا کا معلم ہے، اس نے خطبۂ نکاح کو تو باقی رکھا لیکن اسکی کیفیت اور مضامین یکسر بدل کر رکھ دیئے اور اس کی جگہ ایسا خطبہ مقرر کیا جس میں خدا کی حمد و ثنا ہو، توحید و رسالت کا اعتراف و اقرار ہو، قرآن کی وہ آیات ہوں جن کا مقصد زندگی کے معاملات سے متعلق تنبیہ اور رہبری ہے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے اس موقعہ کے لئے جو خطبہ منقول ہے وہ یہ ہے:

الحمدُ لِلّٰه نحمدہٗ ونستعینه	تمام تعریف اللہ ہی کے لئے ہے، ہم اسی کی حمد
ونعوذ باللّٰه من شرور انفسنا	بیان کرتے ہیں اور اسی سے مدد چاہتے ہیں اور ہم اپنے

---

(۱) مسئلۂ کفارت کی شرعی حیثیت پر تفصیلی مطالعہ کیلئے ملاحظہ ہو راقم سطور کی تحریر "مسئلہ کفارت پر ایک نظر"، جو جدید فقہی مسائل حصہ دوم "، کے تازہ ایڈیشن میں شریکِ اشاعت ہے۔

ومن سیئاتِ اعمالنا من یهده
الله فلا مضل له ومن یضلله
فلا هادی له واشهد ان لا الٰه الاّ
الله وحده لا شریك له واشهد ان
محمداً عبده ورسوله ۔
اتقوا الله حق تقاته و
لا تموتن الا وانتم مسلمون اتقوا
الله الذی تساءلون به والارحام
ان الله كان علیكم رقیباً ،
اتقوا الله وقولوا قولاً سدیداً
یصلح لكم اعمالكم ویغفر لكم
ذنوبكم ومن یطع الله ورسوله
فقد فاز فوزاً عظیماً (۱)

بُرے اعمال اور نفس کے شرور سے خدا کی پناہ چاہتے ہیں
جسے خدا راہ یاب کر دے اسے کوئی گمراہ نہیں کر سکتا اور جسے
خدا گمراہ کر دے اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا، میں گواہی
دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور اس کے ساتھ کوئی
شریک نہیں اور محمد خدا کے بندے اور رسول ہیں۔
اللہ سے ڈرو جو اس کے ڈرنے کا حق ہے اور جان
نہ دینا بجز اس کے کہ تم مسلم ہو، اللہ سے تقویٰ اختیار
کرو جس کے واسطہ سے ایک دوسرے سے مانگتے ہو
اور قرابتوں کے باب میں بھی (تقویٰ اختیار کرو)
بیشک اللہ تمہارے اوپر نگراں ہے، وہ تمہارے
اعمال کی اصلاح کرتا ہے اور تمہارے گناہوں کو
معاف کرتا ہے اور جو خدا اور اس کے رسول کی اطاعت
کرے وہی کامیاب و فلاح یاب ہے۔

اس کو عام طور پر حدیث میں "خطبة الحاجة" یا "تشهد الحاجة" کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے، منشا یہ ہے کہ ہر ضرورت کے موقع پر یہ خطبہ پڑھا جا سکتا ہے، لیکن بیہقی کی ایک روایت میں نکاح کا صراحت سے ذکر موجود ہے اذا اراد احدكم ان یخطب لحاجة من النكاح اوغیره الخ (۲) اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خصوصیت سے نکاح کے موقعہ پر یہ خطبہ دیا جانا چاہئے، سلف کا تبرکاً مذکورہ آیات کے بعد نکاح سے متعلق چند حدیثیں اور دعائیہ کلمات بھی پڑھے جانے کا معمول ہے۔

---

(۱) مجمع الزوائد ۴/۲۸۸۔
(۲) نیل الاوطار ۶/۲۹۔

مستحبات وآداب

نکاح کے مستحبات وآداب میں سے یہ ہے کہ آپؐ نے فرمایا" اعلنوا ھذا النکاح ـــــ یہ بھی مسنون ہے کہ نکاح مسجد میں کیا جائے، ارشادِ نبوی ہے: واجعلوہ فی المساجد (۱) یوں تو اسلام میں کوئی وقت منحوس نہیں لیکن چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت عائشہؓ سے نکاح اور یکجائی دونوں شوال کے مہینہ میں ہوئی اس لئے بعض اہلِ علم نے شوال میں نکاح کرنے کو مستحب قرار دیا ہے (۲) بعض علاقوں میں لوگ محرم، صفر، ذوقعدہ کے مہینوں کو نکاح کیلئے منحوس اور نامناسب جانتے ہیں یہ قطعاً اسلامی تعلیمات کے خلاف اور اسلامی تصورات کے مغائر ہے۔ اہلِ علم نے یہ بھی لکھا ہے کہ نکاح کیلئے بہتر اور مستحب دن جمعہ کا ہے (۳)

کھجور لٹانا

مجلس نکاح میں کھجور اور مصری وغیرہ کا لٹانا ہمارے علاقوں میں مروج ہے اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ فی نفسہٖ کھجور کا حاضرین کے درمیان لٹانا اور حاضرین کا لوٹنا حلال ومباح ہے اور اس پر اکلِ حرام کا اطلاق نہیں ہوگا لیکن چوں کہ اس لوٹنے میں باہم مزاحمت اور مخاصمت کی صورت پیدا ہوسکتی ہے، اس لئے امام مالک امام شافعی اور ایک روایت کے مطابق امام احمد اس کو منع کرتے ہیں، امام ابوحنیفہ اور بعض اہل علم کے نزدیک اس میں کوئی کراہت نہیں، امام احمد کی بھی ایک روایت اسی کے مطابق ہے۔

---

(۱) ترمذی ۱/۱۳۸، وقال ہذا حدیث حسن غریب۔

(۲) احیاء علوم الدین ۲/۳۶۔ (۳) فتح القدیر ۳/۱۰۲۔

جو لوگ جواز کے قائل ہیں ان کے پیش نظر یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پانچ یا چھ اونٹنیوں کا نحر فرمایا اور فرمایا کہ جو چاہے اس میں سے کاٹ لے، من شاء اقتطع ۔ یہ اجازت اور لٹائی ہوئی چیزیں میں سے لوٹنے کی اجازت بظاہر ایک ہی درجہ رکھتی ہے (۱) ــــــــــ بعض اہل علم نے اس کے جواز پر ایک انصاری کے واقعۂ نکاح سے استدلال کیا ہے جس میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میوے لٹائے تھے مگر واقعہ یہ ہے کہ اس روایت سے استدلال قرینِ انصاف نہیں کیوں کہ اس میں بشر بن ابراہیم نامی راوی آیا ہے جس کے بارے میں محدثین کا خیال ہے کہ وہ حدیثیں وضع کیا کرتا تھا (۲)

تاہم اوپر جو باتیں مذکور ہوئیں وہی اس کے جواز کو ثابت کرنے کیلئے کافی ہیں اور تجربہ یہ ہے کہ ایسی تقریبات میں مزاحمت اور مخاصمت اور باہم نزاع کی سی کیفیت پیدا نہیں ہوتی، محض خوشی کا اظہار مقصود ہوتا ہے، فتاویٰ عالمگیری میں بھی اس موقعہ پر میٹھی چیز یا درہم وغیرہ لٹانے کا جواز نقل کیا گیا ہے (۳) ہاں اگر کہیں اس کی وجہ سے مجلس میں بدتہذیبی اور ناشائستگی پیدا ہونے کا اندیشہ ہو تو تقسیم کر دینا بہتر ہے ۔

مبارک باد

آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بھی ثابت ہے کہ نکاح کے بعد مبارکباد کے الفاظ کس طرح کہے جائیں، حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نکاح کے بعد یوں مبارکباد دیتے :

---

(۱) المغنی ۷/۲۱۹۔

(۲) مجمع الزوائد ۴/۲۹۰۔

(۳) فتاویٰ عالمگیری [illegible]

بارك الله وبارك عليك ۔۔۔ اللہ برکت دے، تم پر برکت فرمائے اور تم
وجمع بينكما في خيرٍ (۱) ۔۔۔ دونوں کو خیر پر جمع کرے۔

حضرت عقیل بن ابی طالب کی روایت میں یہ الفاظ منقول ہیں:

بارك الله فيك وبارك ۔۔۔ اللہ تعالیٰ تمہاری ذات کو اور تمہارے لئے
لك فيها (۲) ۔۔۔ اس کی ذات کو مبارک کرے۔

دف وغیرہ

نکاح میں چوں کہ اعلان اور اظہار مقصود ہے، اس لئے آپؐ نے دف بجانے کی اجازت مرحمت فرمائی ہے، ارشاد ہے: واضربوا عليه بالدفوف (۳) بلکہ عید کے موقعہ سے بھی آپؐ نے کم عمر بچیوں کو دف بجانے سے منع نہیں فرمایا (۴) بعد کو چل کر حالاتِ زمانہ کو سامنے رکھتے ہوئے گو دف جائز ہونے اور نہ ہونے میں اہلِ علم کی رائیں مختلف ہوگئیں (۵) لیکن زیادہ تر فقہاء کا رجحان اس کے جائز ہونے کی طرف ہے، یہی امام ابو یوسف سے منقول ہے (۶) اور اسی طرح کی بات حنابلہ وغیرہ نے لکھی ہے (۷) لیکن یہ بات ذہن نشیں رہے کہ گانا بجانا، مزامیر کا استعمال، تالیاں، طبلے، عورتوں کا برسرِ محفل پڑھنا، یہ قبیح رسمیں جو ہمارے یہاں رائج ہوگئی ہیں، قطعاً ناجائز اور حرام ہیں اور فی زمانہ ان غیر شرعی رسوم کے سدّباب

---

(۱) ترمذی ۱۳۸/۲۔
(۲) نیل الاوطار ۴۰/۶
(۳) ترمذی ۱۳۸/۱۔
(۴) بخاری ومسلم عن عائشہؓ۔
(۵) البحر الرائق ۴۲۹/۲۔
(۶) عالمگیری ۳۵۲/۵۔

کیلئے دف کو بھی ممنوع قرار دینا ضروری ہے۔

دلہن کو رخصت کرنا

نکاح کے بعد عورتوں کا لڑکی کو سنوارنا اور شوہر کے ہاں پہنچانا یا رخصت کرنا جس کو "زفاف" کہا جاتا ہے، جائز ہے۔ سیدنا حضرت عائشہؓ کی ایک روایت میں اس کا ذکر موجود ہے (۱) اور فقہاء نے بھی اس کو جائز قرار دیا ہے بشرطیکہ کوئی مفسدہ دینی نہ ہو (۲) ——— لیکن عورتوں کا ایسا اجتماع جس میں بے پردگی اور خلاف شریعت باتوں کا ارتکاب ہوتا ہو، چوں کہ دینی مفسدہ سے خالی نہیں، اس لئے جائز نہ ہوگا۔

ولیمہ

نکاح چوں کہ ایک تقاضۂ انسانی کی تکمیل کا حلال و جائز ذریعہ ہے، اس لئے شریعت نے اس کی زیادہ سے زیادہ تشہیر و اظہار کو پسند کیا ہے، اسی تشہیر اور اظہار کا ایک طریقہ ولیمہ بھی ہے جس میں دعوتِ عام کے ذریعہ مَرد و زن کے دَرمیان تعلق ازدواجی کو ظاہر کیا جاتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ولیمے کئے ہیں اور صحابہ کو بھی اس کی ترغیب دی ہے، حضرت عبد الرحمٰن بن عوفؓ نے نکاح کیا تو آپؐ نے ان سے بھی ولیمہ کیلئے تاکید فرمائی اور فرمایا اولم ولو بشاۃ (۳) ——— لہذا ولیمہ رسولؐ کی خاص سنتوں میں ہے (۴)

---

(۱) بخاری ۲/۷۷۵

(۲) درمختار

(۳) بخاری ۲/۷۷۷۔

(۴) المغنی ۷/۲۱۲۔

ولیمہ میں کس طرح کے کھانے بنائے جائیں؟ یہ دعوتِ ولیمہ دینے والے کی معاشی سطح پر موقوف ہے، چنانچہ خود حضورؐ نے جہاں حضرت زینب کے نکاح میں بکری ذبح کرکے ولیمہ فرمایا (۱) وہیں بعض ازواج مطہرات کا ولیمہ محض تھوڑی سی جَو کے ذریعہ فرمایا ہے بمدین من شعیر (۲) اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ولیمہ کا تعلق آدمی کی معاشی حیثیت اور سطح سے ہے۔ ولیمہ میں بہت زیادہ تکلفات اور حیثیت سے بڑھ کر خرچ کرنا شریعت میں پسندیدہ نہیں۔

ولیمہ بیوی کے ساتھ تعلقِ ازدواجی کے بعد ہونا چاہیئے۔ ایک روایت میں صراحت کے ساتھ موجود ہے کہ جب آپؐ کی حضرت زینب کے ساتھ شب عروسی ہوگئی تب آپ نے قوم کو بلایا اور ان حضرات نے کھانا تناول فرمایا (۳) حدیثوں میں دعوتِ ولیمہ قبول کرنے کی بڑی تاکید آئی ہے، ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ جب کسی کو دعوتِ ولیمہ دی جائے تو اسے ضرور آنا چاہیئے (۴) بعض روایات میں دعوتِ ولیمہ قبول نہ کرنے کو نافرمانی اور معصیت سے تعبیر کیا گیا ہے (۵) علامہ ابن عبدالبر نے امام مالک، امام ابوحنیفہ، امام شافعی وغیرہ سے دعوتِ ولیمہ کے قبول کرنے کا واجب ہونا نقل کیا ہے، بشرطیکہ متعین طور پر کسی شخص کو دعوت دی جائے (۶) لیکن صحیح بات یہی ہے کہ اس دعوت کا قبول کرنا بھی مسنون ہے البتہ شریعت میں اس کی بڑی تاکید و اہتمام ہے دقالت

---

(۱) بخاری ۲/۷۷۷۔

(۲) بخاری ۲/۷۷۷۔

(۳) بخاری ۲/۷۷۶۔

(۴) بخاری عن ابن عمر۔

(۵) مسلم، باب زواج زینب بنت جحش و نزول الحجاب و اثبات الولیمۃ /۴۶۲۔

(۶) المغنی ۷/۲۱۳۔

العامۃ ھی السنۃ (۱) ____________ غیر مسلم دعوت دے اور اپنے یہاں تقریب نکاح میں بلائے تو اس میں بھی شرکت جائز ہے، اگر دعوت ولیمہ میں منکراتِ شرعیہ کا ارتکاب ہو تو اس میں شریک نہیں ہونا چاہیے۔ اس سلسلہ میں اصول وہی ہیں جو عام دعوتوں کے سلسلہ میں ہیں اور ان کا ذکر پہلے ہو چکا ہے (۲)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اگلے دن ولیمہ کو حق، دوسرے دن درست اور تیسرے دن ریاکاری قرار دیا ہے (۳) اس لئے مسلسل دو تین دنوں تک یا اس سے زیادہ ولیمہ کا اہتمام اور دعوت کا سلسلہ مکروہ اور ناپسندیدہ ہے، ہاں اگر تفاخر کا جذبہ نہ ہو، لوگ زیادہ ہوں اور ایک آدمی ایک ہی بار شریک طعام ہو، دوسرے اور تیسرے دن کے مدعوئین الگ ہوں تو ایک سے زیادہ دنوں بھی ولیمہ کا اہتمام جائز ہے، حضرت انسؓ کے بیان کے مطابق آپؐ نے حضرت صفیہ سے نکاح کے موقعہ پر تین دنوں تک ولیمہ فرمایا ہے (۴) بلکہ حفصہ بنت سیرین ناقل ہیں کہ ان کے والد نے تو سات دنوں تک ان کا ولیمہ کیا اور مختلف صحابہ کو مختلف دنوں میں دعوت دی (۵) ہمارے فقہاء نے عام طور پر یکجائی کے بعد اس دن یا دوسرے دن دعوتِ ولیمہ منعقد کرنے کو کہا ہے اور لکھا ہے کہ اس کے بعد ولیمہ نہیں ہوگا (۶)

مہر

نکاح کی وجہ سے عصمتِ انسانی کے احترام کے اظہار کے لئے شریعت نے

---

(۱) عالمگیری ۳۴۳/۵۔

(۲) درمختار، باب الحظر والاباحۃ۔

(۳) ابوداؤد ۱۷۰/۲۔

(۴) دیکھئے فتح الباری ۲۱۰/۹۔

(۵) حوالۂ مذکور۔

(۶) ولا بأس بان یدعو یومئذٍ من الغد وبعد الغد ثم ینقطع العرس والولیمۃ۔ ہندیہ ۳۴۳/۵۔

شوہر پر بیوی کا ایک خاص مالی حق رکھا ہے، جس کو مہر کہا جاتا ہے، حدیث میں بعض مواقع پر "صداق" یا کسی اور نام سے بھی تعبیر کیا گیا ہے، ارشادِ خداوندی ہے کہ عورتوں کو ان کے مہر خوش دلی کے ساتھ ادا کر دیئے جائیں، واٰتوا النساء صدقٰتھن نحلة (نساء : ۴) بلکہ اسی مہر کے ذریعہ ایک خاص معاہدہ کے تحت عورت کی عصمت مرد کے لیئے حلال ہوتی ہے، واحل لکم ماوراء ذلکم ان تبتغوا باموالکم (نساء ــــ ۲۴) مرد کو عورت پر ازدواجی زندگی میں جو ایک گونہ بالادستی حاصل ہے اس کی وجہ جہاں مَرد کی بعض فطری خصوصیات ہیں وہیں یہ بھی ہے کہ مہر اور دوسری مالی ذمہ داریاں مَردوں کے سَر رکھی گئی ہیں (نساء ــ ۳۴)

مہر کی مِقدار

قرآن مجید نے اس بات کی توضاحت کر دی ہے کہ مہر کی زیادہ سے زیادہ کوئی مقدار متعین نہیں (نساء : ۲۰) حضرت حسن بن علیؓ کے بارے میں ثابت ہے کہ آپ نے ایک خاتون سے نکاح کیا تو اسے سَو باندیاں بھیجیں اور ہر باندی کے ساتھ ایک ہزار درہم (۱) ـــــــــــ مہر کی کم سے کم مِقدار کے سلسلہ میں فقہاء کی رائیں مختلف ہیں، بعض فقہاء کے نزدیک کم سے کم کوئی مقدار مقرر نہیں (۲) بعضوں کا خیال ہے کہ کم سے کم مہر کی مقدار ¼ دینار (تقریباً ½ ۴ ماشہ سونا) ہونا چاہیئے (۳) امام ابو حنیفہ کے نزدیک مہر کی کم سے کم مقدار دَس درہم ہے (۴) ۲ تولہ ½ ۷ ماشہ چاندی کے مساوی ہوتا ہے ـــ ان تمام ہی فقہاء کے پاس اپنی آراء کے لیئے

---

(۱) مجمع الزوائد ۴/۲۸۴، باب الصداق، بحوالہ طبرانی عن ابن سیرین ورجالہ رجال صحیح۔

(۲) المغنی ۷/۱۶۱۔

(۳) ترمذی ۱/۲۱۱ باب ماجاء فی مہور النساء۔

(۴) بدائع الصنائع ۲/۲۷۵۔

مناسب دلیلیں موجود ہیں ۔ احناف کے پیشِ نظر وہ روایت ہے جس میں فرمایا گیا کہ مہر دس درہم سے کم نہ ہونا چاہیئے ۔ لا مھر اقل من عشرۃ دراھم (۱)
مہر کی تعیین میں اعتدال ہونا چاہیئے ، نہ مہر اتنا معمولی ہو کہ اس کی کوئی قدر باقی نہ رہے ، نہ اتنا زیادہ ہو کہ اس کی ادائیگی دشوار ہو جائے اور مرد کی معاشی حالت اس کی متحمل نہ ہو ، سیدنا حضرت عمرؓ نے مہر کی کثرت میں غلو کو بہت ناپسند فرمایا ہے ۔ اور فرمایا کہ مہر کی کثرت اگر فخر و شرافت کی بات ہوتی تو ازواجِ مطہراتؓ کا مہر زیادہ ہوتا (۲) ازواجِ مطہرات کا مہر بالعموم پانچسو درہم تھا (۳) اور صاحبزادیِ رسولؐ سیدہ فاطمہ کا مہر چارسو اسی (۴۸۰) درہم (۴) ——— پانچسو درہم موجودہ ۱۰ گرام کے تولہ کے حساب سے ڈیڑھ کیلو ۳۰ گرام اور نوسو ملی گرام چاندی ہوتا ہے ——— ظاہر ہے کہ اس مقدار میں مہر کی تعیین زیادہ بہتر ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ازواجِ مطہرات ، بناتِ طاہرات اور حضرات صحابیاتؓ کے مہر اسی طرح چاندی یا سونے سے مقرر کئے جاتے تھے ، پس روپیہ یا کسی اور شکل میں مہر مقرر کرنے کی بجائے سونے چاندی کی صورت میں مہر کی تعیین سنت سے قریب بھی ہے اور عورت کے لئے قرینِ انصاف بھی کہ سکّوں کی مقدار دِن بہ دِن گھٹتی جاتی ہے اور سکّوں میں مقرر کیا ہوا مہر ایک عرصہ بعد اپنی قدر کھو دیتا ہے ۔

مہر کے احکام

اگر نکاح کے وقت مہر مقرر نہ کیا گیا تب بھی نکاح درست ہو جاتا ہے

---

(۱) الدرایۃ فی تخریج احادیث الہدایہ ۲/۴۴۳ ۔
(۲) مجمع الزوائد ۴/۲۸۳ ۔ باب الصداق ۔
(۳) مشکوٰۃ ۲/۲۷۷ ۔
(۴) مجمع الزوائد ۴/۲۸۳ ۔

جیسا کہ خود قرآن کے بیان سے ظاہر ہے (نساء : ۴) لیکن مستحب طریقہ یہ ہے کہ عقد کے وقت ہی مہر مقرر کر لیا جائے (۱) مختلف عورتوں کے لیئے مہر کے احکام اس طرح ہیں:

۱۔ نکاح کے وقت مہر مقرر ہو چکا ہے اور عورت کے ساتھ تنہائی بھی ہو چکی ہے تو پورا مقررہ مہر واجب ہو گا (۲)۔

۲۔ نکاح کے وقت مہر مقرر ہو چکا ہے مگر یکجائی سے پہلے ہی علٰحدگی ہو گئی تو نصف مہر مقررہ واجب ہو گا (۳)۔

۳۔ نکاح کے وقت مہر مقرر نہیں ہوا تھا اور شوہر کی بیوی کے ساتھ یکجائی بھی ہو چکی، اب مہر مثل واجب ہو گا۔ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے ایک عورت کے حق میں اسی طرح کا فیصلہ فرمایا اور حضرت معقل بن یسارؓ نے اس کی تائید کی اور فرمایا کہ حضورؐ نے بھی بردع بنت واشق کے بارے میں یہی فیصلہ فرمایا تھا (۴) ——— مہر مثل سے مراد اس عورت کے خاندان کی عورتوں کا عمومی مہر ہے جو عمر، تموّل، خوبصورتی، عقل و اخلاق اور کنوارپن میں ہمسر ہو (۵)

۴۔ اگر مہر بھی مقرر نہ ہوا تھا اور مرد و زن کی یکجائی بھی نہ ہوئی کہ نوبت طلاق کی آگئی تو متعہ واجب ہو گا (۶) متعہ کی مقدار متعین نہیں بلکہ مرد کی حیثیت اور گنجائش پر منحصر ہے، علی الموسع قدرہ وعلی المقتر قدرہٗ (بقرہ : ۲۳۶)

متعہ کی کم سے کم مقدار کیا ہو؟ اس سلسلہ میں سلف سے مختلف رائیں منقول

---

(۱) المغنی ۷/۱۶۰ کتاب الصداق۔

(۲) نساء : ۲۰، ۲۱۔

(۳) بقرہ : ۲۳۷۔

(۴) ابوداؤد۔

(۵) ہدایہ ۲/۳۲۳۔

(۶) بقرہ : ۲۳۶۔

ہیں اور یہ سب رائے اور اجتہاد پر مبنی ہیں۔ ابن عمر کہتے تھے کہ کم از کم تیس ۳۰ درہم یا اس مالیت کا کوئی اور سامان دیدیا جائے۔ عبداللہ بن عباس کی رائے تھی کہ ایک خادم، اس سے کم تر درجہ یہ ہے کہ ایک لباس اور آخری درجہ ہے کہ تھوڑا سا خرچ دیدیا جائے یہی رائے حسن بصری اور مالک کی بھی ہے، حضرت حسن رضؓ نے اپنی بیوی کو بطور متاع بیس زقاق (اس زمانے کے پیمانے کا نام) شہد دیا تھا، قاضی شریح نے اپنی مطلقہ کو بطور متاع پانچسو درہم دیئے تھے، امام ابوحنیفہ کے استاذ حماد کی رائے تھی کہ عورت کے خاندانی مہر کی نصف رقم دیدی جائے (۱) تاہم احناف کے یہاں قولِ مشہور یہی ہے کہ متاع کی کم سے کم مقدار ایک جوڑا کپڑا ہے (۲) "متعہ" کی زیادہ سے زیادہ سے زیادہ کوئی مقدار مقرر نہیں، وہ عورت جس سے مرد لذت اندوز ہو چکا ہو، مہر کے ساتھ ساتھ اس کو بھی "متعہ" دینا مستحب ہے (۳) اور یہ بھی قرآن مجید کے اس منشاء کی تکمیل کا ذریعہ ہے کہ جب عورت سے جدائی ہو تو اس وقت بھی حسنِ سلوک کا دامن نہ چھوٹے، فامساکٌ بمعروفٍ او تسریح باحسانٍ (بقرہ : ۲۲۹)

ادائیگی مہر کی اہمیت

مہر کو اسلام میں بڑی اہمیت حاصل ہے، قرآن نے اس کو مرد کے فرائض میں شمار کیا ہے فاٰتوھن اُجورھن فریضۃً، حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر پورا مہر پیشگی ادا نہ کر سکے تو مہر کا کچھ نہ کچھ حصہ ہم بستری سے پہلے ادا کر دیا جائے، حضرت علیؓ کا حضرت فاطمہ رضؓ سے نکاح ہوا تو آپ ﷺ نے خود سیدنا حضرت علی کو وصیت فرمائی:

---

(۱) البحر المحیط ۲/۲۳۳، احکام القرآن للجصاص ۱/۳۴۴۔

(۲) تفسیر ماجدی ۱/۹۶ مطبوعہ تاج کمپنی کراچی۔

(۳) ہدایہ ۲/۳۲۶۔

یا علی لا تدخل علیٰ اھلك اے علی! اپنی بیوی سے ملنے سے پہلے ان کو
حتی تقدم لھم شیئاً (۱) کچھ دیدو۔

یہ تصور کہ مہر علاحدگی کے موقع ہی پر ادا ہو یا شوہر کی موت کے بعد ہی اس کے ترکہ میں سے ادا کیا جائے، نہایت غیر اسلامی اور جاہلانہ تصور ہے، مہر بھی دوسرے واجبات اور دیون کی طرح ایک دین ہے جس سے جلد از جلد سبکبار ہو جانا چاہئے۔

افسوس کہ ہمارے معاشرہ میں بہت سے نوجوان مہر کی تعیین کو محض ایک رسمی عمل سمجھتے ہیں اور اس کی ادائیگی کی نیت تک نہیں رکھتے، یہ سخت گناہ ہے آپؐ نے فرمایا کہ جس نے مہر مقرر کیا اور اس کی ادائیگی کا ارادہ نہیں ہے تو وہ زانی ہے، بعض روایات میں ہے کہ قیامت کے دن وہ خدا کے حضور ایک زنا کار کی حیثیت سے پیش ہوگا (۲) قرآن مجید کہتا ہے کہ اگر مہر دے بھی چکا ہے اور نوبت علاحدگی کی آئے تو ہرگز عورت سے اس کو واپس لینے کے حیلہ بہانے نہ کرے۔ (نساء : ۲۰،۲۱) _____ کاش یہ تنبیہات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات ایسے خدا سے بے خوف لوگوں کے اندر آتش احساس کو سلگانے اور شعور کو جگانے میں ممد و معاون ثابت ہوں۔ وباللہ التوفیق وبہ یھدی السبیل۔

رسمِ جہیز

جہیز کی جو بدبختانہ رسم اس وقت ہمارے معاشرہ میں نکاح کا جزو لازم بن چکی ہے وہ خالصتہً نامنصفانہ بھی ہے اور غیر اسلامی بھی، شریعت نے نکاح کے باب میں اخراجات کی تمام تر ذمہ داری مَردوں پر رکھی ہے اور اسی کو ازدواجی

---

(۱) مجمع الزوائد ۴/۲۸۳۔
(۲) مجمع الزوائد ۴/۲۸۴ باب فیمن نوی ان لا یؤدی صداق امرأتہ

مسائل میں مردوں کی قوامیت کی اساس قرار دیا گیا ہے ۔

الرّجال قوامون علی النساء بما فضل اللہ بعضھم علیٰ بعضٍ وبما انفقوا من اموالھم۔ (نساء ۔ ۳۴)

مرد عورتوں کے نگراں ہیں اسلئے کہ اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر بڑائی دی ہے اور اس لئے کہ مردوں نے اپنا مال خرچ کیا ہے ۔

اسی لئے مہر، نفقہ، لباس و پوشاک ، دوا، علاج اور دوسری ضروریات ولیمہ، مہر نیز بچوں کی کفالت ساری ذمہ داری ان مردوں کے سر رکھی گئی ہیں۔ اسی لئے کتبِ فقہ میں یہ مسئلہ تو ملتا ہے کہ لڑکی کے اولیاء لڑکوں سے نکاح کے موقعہ پر جس زائد رقم کا مطالبہ کرتے ہیں وہ جائز ہے یا نہیں ؟ وہ رشوت کے حکم میں ہے یا نہیں ؟ لیکن لڑکوں کی طرف سے جہیز، گھوڑے جوڑے اور تلک کا مطالبہ جائز ہے یا ناجائز؟ غالباً اس کا ذکر نہیں ملتا کہ فقہاء کی نگاہ میں مَردوں کی طرف سے ایسی بے شرمی اور مقام مردانہ کے خلاف دریوزہ گری کا تصور تک نہیں تھا۔

یہ یوں بھی غلط ہے کہ اپنی اولاد میں مساوات ضروری ہے اور لڑکیوں کو رقم خطیر اور کثیر اشیاءِ جہوزہ کا دینا اور لڑکوں کو اس سے محروم رکھنا صریح ناانصافی اور عدل کے خلاف ہے اور دراصل یہ رسم برادرانِ وطن سے مسلمانوں میں آئی ہے ۔ ہندو مذہب میں چوں کہ عورتوں کے لئے میراث کا کوئی تصور نہیں ہے بلکہ رشتۂ نکاح کے ساتھ ہی عورت کا تعلق اپنے خاندان سے کٹ جاتا ہے ، اس لئے لوگ لڑکی رخصت کرتے ہوئے کچھ دے دلا کر بھیجتے تھے ۔ اسلام میں نکاح کے بعد بھی عورت کا رشتہ اپنے خاندان سے باقی رہتا ہے اور وہ مستحق میراث بھی رہتی ہے ۔

اس میں شبہ نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضرت فاطمہ کو

کچھ ضروری سامان دینے کا ذکر بعض روایات میں آیا ہے :

جھز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لفاطمۃ فی خمیل وقربۃ ووسادۃ حشوھا اذخر۔[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی صاحبزادی فاطمہ کو ایک گدا، گھڑا اور ایک تکیہ جس میں اذخر (گھاس) بھری گئی تھی، بطور جہیز عطا فرمایا۔

لیکن اس پر مروجہ رسمِ جہیز کا اطلاق کئی وجوہ سے غلط ہے :

اول تو غالباً آپؐ نے یہ خود اس زرہ کی قیمت سے بنوائے تھے جو آپؐ کے حکم سے حضرت علیؓ نے موقع نکاح کے لئے فروخت کی تھی ۔

دوسرے آپؐ کی حیثیت نہ صرف حضرت فاطمہؓ کے باپ کی تھی بلکہ خود حضرت علیؓ کے بھی سرپرست اور پرورش کنندہ کی تھی اور آپؐ نے ہی ان کی بھی پرورش فرمائی تھی ——— صورتِ حال یہ تھی کہ حضرت علی کا کوئی مکان تھا اور نہ مکان کے لئے مطلوبہ اسباب و سامان ۔ ان حالات میں زوجین کے سرپرست اور مربی ہونے کی حیثیت سے ایک نئے گھر بسانے کے لئے جو سامان مطلوب تھا اس کا آپؐ نے نظم فرما دیا، یہ حضرت فاطمہ کا جہیز نہیں تھا بلکہ طرفین کے مربی اور سرپرست ہونے کی حیثیت سے ایک نئی خانہ آبادی کا انتظام تھا ——— ایسا سمجھنا اس لئے بھی ضروری ہے کہ حضرت فاطمہ کے علاوہ اور بھی دوسری صاحبزادیاں تھیں جن کو آپؐ کی طرف سے کچھ دیا جانا ثابت نہیں ۔ پس اگر حضرت فاطمہ کے لئے آپؐ کا جہیز دینا تسلیم کیا جائے تو یہ خلافِ عدل محسوس ہوتا ہے جو آپؐ کی ذات والا صفات سے بعید ہے ۔

صنفی تعلق :

---

(۱) نسائی عن علی ۔

پیغمبر اسلامؐ نے جہاں زندگی کے تمام گوشوں میں انسانیت کے لیے روشنی چھوڑی اور اپنے اسوۂ حسنہ کے ذریعہ ان کی رہبری فرمائی، وہیں جلوت کی طرح خلوت کو بھی اپنے نور ہدایت سے تاریک اور محروم نہ رہنے دیا اور ازدواجی زندگی کے اس صنفی عمل کے لیے بھی مہذب وشائستہ اصول وقواعد مقرر فرمائے ——— آپؐ نے فرمایا کہ جماع سے پہلے یہ کلمات پڑھے جائیں:

بسم اللہ اللھم جنبنا الشیطان وجنب الشیطان ما رزقتنا۔	اللہ کے نام سے، اے اللہ شیطان سے ہماری حفاظت فرما اور ہماری اولاد کی بھی۔

فرمایا کہ اس کے بعد اس وطی سے حمل ٹھہر جائے تو مولود شیطان کے شر سے محفوظ رہے گا (۱) گویا اس حال میں بھی خدا کی ذات کا استحضار ہو، اولاد کی طلب ہو اور شیطان کی طرف سے نفور ہو، محض اشتہار نفس کی تکمیل کا جذبہ کارفرما نہ ہو۔

آداب

جماع اس طرح نہ ہو کہ قبلہ کے استقبال کی نوبت ہو، چنانچہ عمرو بن حزم اور عطاء نے اس کو مکروہ قرار دیا ہے لا یستقبل لقبلۃ حال الجماع۔ اس وقت زیادہ گفتگو بھی نہ کی جائے ویکرہ الاکثار من الکلام کہ یہی شرم وحیا اور غیرت کا تقاضہ بھی ہے۔ مکمل پردہ کی حالت ہو، نہ کوئی دیکھ سکے، نہ آواز کا احساس کرسکے، نہ بوس وکنار کے مرحلہ میں کسی کی نگاہ پڑنے پائے (۲) خلوت کے راز دوسروں کے سامنے ظاہر بھی نہ کئے جائیں۔ آپؐ نے فرمایا بدترین شخص وہ ہے جو اپنی بیوی کے پاس جائے اور ایک دوسرے سے ہم آغوش ہو، پھر شوہر اس کے راز کا

---

(۱)

(۲) المغنی ۷/۲۲۸ آداب الجماع۔

افشار کر دے (۱) امام نوویؒ نے اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کیفیتِ جماع، ایک دوسرے سے تلذذ کے طریقے اور عورت کی جانب سے ظاہر ہونے والے افعال یا اقوال کا دوسروں کے سامنے نقل کرنا حرام ہے (۲)

یہ بات بھی مستحب ہے کہ جماع سے پہلے دواعی جماع کے ذریعہ عورت کی اشتہا کو پوری طرح برانگیختہ کر لیا جائے، چنانچہ آپؐ حضرت عائشہ کا بوسہ لیتے اور ان کی زبان چوستے۔ جابر بن عبد اللہ سے مروی ہے کہ آپؐ نے ملاعبت سے پہلے جماع کو منع فرمایا۔ نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن المواقعة قبل الملاعبة (۳)

یہ بھی ضروری ہے کہ زوجین جماع میں ایک دوسرے کی رعایت کریں۔ آپؐ نے فرمایا جب شوہر بیوی کو اس عمل کیلئے طلب کرے اور وہ آنے سے انکار کر دے تو صبح تک فرشتے اس پر لعنت کرتے رہتے ہیں (۴) اسی طرح شوہروں کو حکم دیا کہ جب تک عورت میں بھی اس درجہ کی شہوت نہ جاگ جائے جیسی تمہاری ہے اس وقت تک جماع نہ کرو کہ ایسا نہ ہو کہ تم فارغ ہو چکو اور ابھی اس کی آگ فرو نہ ہو پائے۔ پھر اگر مرد کو فراغت ہو جائے تو بھی فوراً الگ نہ ہو جائے بلکہ عورت کو مزید موقع دے فلا یعجلها حتى تقضي حاجتها (۵) ــــ کثرتِ جماع اگر عورت کے لئے مضر ہو تو اس سے اسی قدر ہم بستری کی جائے جو اس کے لئے قابلِ برداشت ہو لو تضررت من كثرة جماعه لم تجز الزيادة على قدر طاقتها (۶)

---

(۱) مسلم ۱/۴۶۴ باب تحریم افشاء سر المرأة۔

(۲) نووی علی مسلم ۱/۴۶۴۔

(۳) زاد المعاد ۳/۱۷۳، ہدیہ م فی الجماع۔

(۴) بخاری، باب اذا باتت المرأة مهاجرة۔

(۵) المغنی ۷/۲۲۸۔

(۶) در مختار، باب القسم۔

زوجین کا ایک دوسرے کے اعضاءِ تناسل اور شہوت انگیز حصوں کا مَس بھی جائز ہے، بلکہ امام ابوحنیفہؒ سے نقل کیا گیا ہے کہ مجھے امید ہے کہ اس پر اجر دیا جائے گا۔ ارجو ان یعطیٰ الاجر (۱) ـــــــ مباشرت کے وقت بالکل بے لباس ہو جانا مناسب نہیں کہ غیرت وحیا کے خلاف ہے، آپؐ نے فرمایا کہ تم ازدواجی ربط کے درمیان بالکل جانوروں کی طرح برہنہ نہ ہو جاؤ (۲) البتہ یہ حکم اخلاقی ہے ورنہ زن وشوہر کے لئے ایک دوسرے کے پورے جسم کو دیکھنا جائز ہے بلکہ ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ لذت افزونی کے لئے اس موقع پر ایک دوسرے کی شرمگاہ دیکھی جاتے (۳) ابن عمر کا یہ قول روایتِ بالا کے خلاف نہیں، مباشرت کا اصل مقصود زوجین کو عفیف رکھنا ہے اگر کسی کے نفس کی تسکین اس کے بغیر نہیں ہو پاتی تو یقیناً اس کے لئے ایسا کرنا ہی بہتر ہو گا۔

خاص ہدایات

پھر انسانی فطرت، مزاج وطبیعت اور مذاق وخواہش کے اختلاف کو پیشِ نظر رکھ کر کسی خاص طریقہ کی تحدید نہیں کی گئی بلکہ اس کو ہر انسان کے اپنے ذوق وچاہت کے حوالہ کر دیا گیا، ارشاد ہوا فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّىٰ شِئْتُمْ (بقرہ: ۲۲۳) یعنی بیوی جو تمہارے لئے توالد وتناسل کی کھیتی ہے اس سے جس طرح جنسی ملاپ کرنا چاہو کرو، کھڑے ہو کر، بیٹھ کر، لیٹ کر یا کسی اور صورت، سامنے سے یا پشت کی جانب سے یا کسی اور طریق سے (۴) البتہ اسکے ساتھ چند ہدایتیں بھی کر دی ہیں:

---

(۱) خلاصۃ الفتاویٰ ۴/۳۶۷۔ کتاب الکراہیۃ۔ الفصل السادس فی النکاح والجماع۔

(۲) ابن ماجہ عن عتبہ بن عبد سلمی، باب التستر عند الجماع ۱/۱۳۱۔

(۳) ردالمحتار ۵/۲۳۴ فصل فی النظر واللمس۔

(۴) تفسیر ماجدی ۱/۸۹۔ مطبوعہ کراچی۔

اول یہ کہ اس کے لئے غیر فطری راہ اختیار نہ کی جائے، یعنی پائخانہ کے مقام کو اس کے لئے استعمال نہ کیا جائے، اس کی طرف ایک لطیف اشارہ خود قرآن مجید میں بھی موجود ہے، چنانچہ بیوی کو کھیتی قرار دیا گیا، ظاہر ہے اولاد کی پیداوار اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب کہ فطری مقام میں صحبت کی جائے۔ حدیثیں اس سلسلہ میں کثرت سے وارد ہیں، آپؐ نے فرمایا جو شخص کسی مرد یا عورت سے پیچھے کی راہ میں ملے، خدا اس کی طرف نظرِ رحمت نہ ڈالے گا (۱) امام نووی کا بیان ہے کہ تمام قابلِ ذکر علماء متفق ہیں کہ عورت سے دُبر میں وطی کرنا حرام ہے، وہ پاک ہو یا حیض کی حالت میں ہو (۲) ________ بعض سلفِ صالحین سے جو دبر میں جماع کا جواز نقل کیا گیا ہے وہ محض غلط فہمی پر مبنی ہے، سلف نے جس بات کو جائز رکھا ہے وہ یہ ہے کہ عورت کی شرمگاہ ہی میں وطی کی جائے لیکن اس کے لئے ایسی ہیئت اختیار کی جائے کہ مرد عورت کی پشت کی طرف سے صحبت کرے، نیطأ من الدبر لا فی الدبر (۳)

دوسرے یہ کہ حیض کی حالت میں بیوی سے مباشرت نہ کی جائے، خود قرآنِ مجید میں اس کی ممانعت موجود ہے (البقرہ: ۲۲۲) احادیث بھی کثرت سے اس سلسلہ میں وارد ہیں۔ (۴) ________ اور اس کی وجہ ظاہر ہے، حیض ایک طرح کی نجاست ہے، انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس سے بچائے نیز اس کے بڑے طبی نقصانات بھی ہیں جن کا طبی کتب میں ذکر کیا گیا ہے، جو حکم حیض کا ہے وہی نفاس یعنی ولادت کے بعد آنے والے خون کا بھی ہے "حیض"

---

(۱) ترمذی ۱/۱۴۸۔
(۲) شرح مسلم ۱/۴۶۳۔
(۳) زاد المعاد ۳/۱۷۶۔
(۴) ترمذی عن ابی ہریرۃ، باب ماجاء فی کراہیۃ اتیان الحائض ۱/۳۵، بخاری عن عائشۃ ۱/۴۴۔

کی حالت میں عورت سے کس حد تک استمتاع جائز ہے اور کیا کچھ ممنوع ہے؟ اس کے لئے کتبِ فقہ ملاحظہ کی جائیں۔

عزل

جماع کی ایک صورت "عزل" ہے یعنی اس طرح مباشرت کی جائے کہ عورت کی شرمگاہ میں مادۂ منویہ کا انزال نہ ہونے پائے، اکثر فقہاء اس کو مکروہ قرار دیتے ہیں۔ روایات کا لب ولہجہ مختلف ہے، بعض سے حرمت، بعض سے اباحت اور بعض سے کراہت کے ساتھ جواز ظاہر ہوتا ہے اور زیادہ صحیح یہی ہے کہ کراہت سے خالی نہیں، شاہ ولی اللہ دہلوی جیسے بلند پایہ عالم حدیث اور رمز شناس شریعت کا رجحان بھی اسی طرف ہے (۱)

کیفیت وہیئت

ہر چند کہ شارع نے جماع کیلئے کسی خاص کیفیت اور ہیئت کی تعیین نہیں کی ہے لیکن بعض اہلِ علم نے یہ ضرور بتانے کی کوشش کی ہے کہ کونسی ہیئت مستحسن اور کونسی ہیئت قبیح ہے؟ ابن قیم نے لکھا ہے کہ سب سے بہتر ہیئت یہ ہے کہ عورت نیچے ہو اور مرد اوپر۔ اور اس پر بڑا لطیف استدلال کیا ہے کہ حدیث میں "عورت"، کو مرد کا فراش قرار دیا گیا ہے، اس کا تقاضا ہے کہ عورت نیچے ہو اور قرآن نے مرد کو "قوام" بتایا ہے اور قوامیت اس کا تقاضا کرتی ہے کہ مرد اوپر رہے۔ نیز قرآن نے زوجین کو ایک دوسرے کا لباس قرار دیا ہے اس ہیئت میں عورت فراش اور مرد لحاف کی صورت میں ہوتا ہے اور یہ دونوں

---

(۱) حجۃ اللہ البالغہ ۱۲۳/۲، آداب المباشرۃ۔

ایک دوسرے کیلئے بمنزلۂ لباس کے ہیں۔ پھر اس میں طبی فوائد بھی زیادہ ہیں جب کہ سب سے قبیح صورت یہ ہے کہ مرد پشت کے بل لیٹا رہے اور عورت اوپر ہو کہ یہ مَرد و عورت ہی نہیں بلکہ نر و مادہ کی طبعی شکل کے بھی خلاف ہے (۱)۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا اگر عورت مجبور نہ ہو اور مرد مباشرت کا مطالبہ کرے تو اس کے لئے تعمیل حکم ضروری ہے۔ اس میں بھی اختلاف نہیں کہ تصحیح نیت کے ساتھ مَرد عورت سے ہم بستر ہو تو باعثِ ثواب ہے کہ آپ نے اس کو صدقہ قرار دیا مباضعتك اهلك صدقة ــــ لیکن اشتہار کے بغیر بیوی سے ملا جائے تو یہ باعثِ ثواب ہے یا نہیں؟ امام احمد فرماتے ہیں کہ اَب بھی باعثِ ثواب ہے کہ حصولِ اولاد کی نیت تو ہے اور یہ نیت بھی نہ ہو تو یہ اس کی جوان بیوی کی عفت و پاکدامنی کی حفاظت میں ممدّ و معاون تو ہے ہی (۲)

جماع میں عورت کا حق

لیکن مسئلہ یہ ہے کہ آیا مردِ پر عورت کے تقاضار وطی کی صورت میں وطی کرنا شرعاً واجب ہے یا نہیں؟ احناف اور شوافع ہم خیال ہیں کہ ایک ہی بار جماع عورت کا حق ہے اگر ایک دفعہ مباشرت ہو گئی تو پھر عورت کا حقِ مباشرت ہمیشہ کے لئے ساقط ہو گیا۔ امام احمدؒ کے نزدیک جماع عورت کا حق ہے اور اگر مرد کو کوئی عذر نہ ہو تو اس پر عورت کے تقاضۂ طبع کی تکمیل واجب ہے اور یہی زیادہ صحیح ہے۔ خلافت فاروقی کے زمانہ کا واقعہ مشہور ہے کہ حضرت کعب نے ایک ایسے ہی شوہر کو حکم فرمایا تھا کہ وہ ہر چوتھے دن ضرور اپنی

---

(۱) زاد المعاد ۲/۴/۱۷۔
(۲) المغنی ۷/۲۳۲۔

بیوی سے وطی کیا کرے ۔ یہی تقاضۂ قیاس بھی ہے کہ ایسا نہ ہو تو عورت کیلئے ضررِ شدید اور بے عفتی کا خطرہ ہے ۔ رہ گئی یہ بات کہ وطی صرف مرد کا حق ہے عورت کا حق نہیں تو یہ کسی طور صحیح نظر نہیں آتا کیوں کہ نکاح کے ذریعہ جو حقوق عائد ہوتے ہیں ان میں زن و شوہر دونوں شریک ہیں یہی وجہ ہے کہ آزاد بیوی سے عزل کرنا ہو تو اس سے اجازت لینا ضروری ہے (۱)

امام احمدؒ کے یہاں کم سے کم چار ماہ پر ایک دفعہ بیوی سے ہم بستری واجب ہے اور ابن منثور نے امام احمدؒ سے نقل کیا ہے کہ اگر حکم دیئے جانے کے باوجود چار ماہ تک نہ ملے تو زوجین میں تفریق کی جا سکتی ہے (۲) اگر کسی عذر کی بنا پر شوہر سفر پر ہے تو عورت کا حقِ وطی ساقط ہو جائے گا ، ہاں اگر مرد کے لئے گھر واپس ہونے میں کوئی بڑا مانع نہ ہو تو ۶ ؍ ماہ گذرنے پر شوہر کو حکم دیا جائے گا کہ وہ گھر جائے اور اگر وہ انکار کرے تو زوجین میں تفریق کر دی جائے (۳)

اَبدی محارم

شریعتِ اسلامی میں جہاں نکاح کو عبادت کا درجہ دیا گیا ہے ، اس کو انبیاء کا طریقہ بتایا گیا ہے اور اس کی ترغیب دی گئی ہے وہیں اس کے لئے مناسب حدیں اور شرطیں بھی مقرر کر دی گئی ہیں اور ان شرطوں میں ایک بنیادی شرط یہ ہے کہ عورت ان لوگوں میں سے نہ ہو جن سے نکاح کرنا حرام ہے ، حرمت کی بنیادی طور پر ۲ دو صورتیں ہیں ۔ اَبدی اور

---

(۱) المغنی ۷/۲۳۱ ۔

(۲) حوالۂ سابق ۔

(۳) المغنی ۷/۲۳۲ ۔

دوامی حرمت، وقتی اور[2] عارضی حرمت۔

شریعت میں ابدی حرمت کے تین اسباب ہیں، نسب[1]، صہر[2] اور رضاعت[3]۔

نسب سے مراد وہ نسبی رشتے ہیں جن کو قرآن مجید نے نکاح میں مانع قرار دیا ہے اصولی[1] رشتہ دار یعنی ماں اور باپ کا پورا سلسلۂ اجداد، فروعی[2] رشتہ دار یعنی بیٹے اور بیٹی کا پورا سلسلۂ اولاد۔ باپ کے بھائی بہن، ماں کے بھائی بہن اور خود اپنے بھائی بہن ——————— (نساء: ۲۳)

"صہر" سے مراد سسرالی رشتہ داری ہے، سسرالی رشتہ داروں میں شوہر اور بیوی کے اصول یعنی آبائی سلسلہ اور فروع یعنی اولادی سلسلہ حرام ہے، البتہ اس سلسلہ میں ایک تفصیل یہ ہے کہ کسی عورت سے نکاح کرنے کے ساتھ ہی اس کی ماں مرد پر حرام ہو جاتی ہے چاہے ہم بستری کی نوبت آئی ہو یا نہ آئی ہو، لیکن جس عورت سے نکاح کیا جائے اس کی بیٹی اسی وقت حرام ہوگی جب کہ اس عورت سے ہمبستری بھی کرلے، اگر ہم بستری سے پہلے ہی بیوی سے علٰحدگی ہوگئی تو اس کی بیٹی سے نکاح کرنا جائز ہوگا ——————— (نساء: ۲۳)

"رضاعت" یعنی دودھ کی وجہ سے حرمت کے سلسلہ میں اصول یہ ہے کہ دودھ پلانے والی عورت کے تمام اصول یعنی آبائی سلسلہ اور فروع یعنی اولادی سلسلہ نیز شوہر دودھ پینے والے پر حرام ہوں گے لیکن دودھ پینے والے کے دوسرے بھائی بہن اور رشتہ دار سے کوئی حرمت قائم نہ ہوگی، گویا دودھ پینے والے کی حرمت اس کی ذات اور اولاد ہی تک محدود ہوگی اور دودھ پلانے والی کی حرمت متعدی ہوگی اور پھیل جائے گی (۱)

یہ تمام ہی احکام ائمہ اربعہ کے درمیان متفق علیہ ہیں، دو نکات پر اختلاف

---

(۱) درمختار ۲/۴۰۶۔

ہے، اول یہ کہ احناف کے نزدیک کسی عورت کے ساتھ فطری راہ میں زنا یا بلا انزال دواعی زنا کا ارتکاب بھی حرمتِ مصاہرت کو ثابت کرتا ہے (۱) اور اس کا سلسلہ مادری فروعی وغیرہ اس زانی اور مرتکب کے لئے حرام قرار پاتا ہے۔ لیکن عام فقہاء کے نزدیک نکاح صحیح ہی اس کی حرمت کو ثابت کرتا ہے (۲)

دوسرا اختلاف اس بات میں ہے کہ دودھ کی کتنی مقدار سے حرمتِ رضاعت ثابت ہوگی، احناف اور مالکیہ کے نزدیک ایک گھونٹ بھی حرمت کے ثبوت کیلئے کافی ہے۔ شوافع اور حنابلہ کے نزدیک کم سے کم پانچ گھونٹ سے حرمت ثابت ہوتی ہے (۳) نیز راجح اور صحیح قول یہی ہے کہ رضاعت اور دودھ پلانے کی مدت دو سال ہے (۴) دو سال کے اندر بچہ دودھ پی لے تب ہی حرمت ثابت ہو گی اس کے بعد دودھ پیئے تو حرمت پیدا نہیں ہوگی۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک یہ مدت ڈھائی سال ہے اور اس مدت کے اندر دودھ پینا حرمتِ رضاعت کا باعث ہے (۵)۔

ان رشتوں کے حرام قرار دینے کی حقیقی وجہ تو خدا ہی کو معلوم ہے البتہ چند باتیں ایسی ہیں جن کو عقل عام بھی سمجھ سکتی ہے۔

اول یہ کہ کچھ قریبی رشتے ایسے ہیں کہ فطرت انسانی خود ان سے ازدواجی اور جنسی تعلقات سے ابار کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لا مذہب، خدا سے بے خوف اور محض اپنی عقل کو فیصل بنانے والے گروہ بھی ماں، بہن، بہو، بیٹی، ساس، پھوپھی اور دادی نانی وغیرہ سے ازدواجی تعلقات کو شرم وحیا کے مغائر سمجھتے ہیں، پوری انسانی

---

(۱) درمختار ۲/۲۷۶۔
(۲) ہدایہ ۲/۳۰۸۔
(۳) ہدایہ ۲/۳۵۰۔
(۴) درمختار ۲/۴۰۳۔
(۵) ہدایہ ، درمختار ۲/۴۰۳

تاریخ میں چند ہی ایسے بے حیا اور فطرت کے باغی پیدا ہوئے ہیں جنہوں نے حرمت وحجاب کی اس دیوار کو بھی گرانے میں کوئی عار محسوس نہیں کی ہے اور ایسے لوگوں کو کبھی یا کسی قوم میں اچھی نظر سے نہیں دیکھا گیا۔ دوسرے اگر اتنے قریبی رشتہ داروں میں بھی حرمت کی یہ دیوار قائم نہ ہو، بھائی، بہنوں، ماں، بیٹیوں، سسر اور بہو وغیرہ کے درمیان بھی ازدواجی رشتہ جائز ہو تو کسی شوہر کے لئے اپنی بیوی کی عصمت وعفت اور پاکدامنی پر اعتبار اور اعتماد کرنا مشکل ہو جائے گا۔ یہ حرمت ذہن کو اس طرح کے عمل کے بارے میں سوچنے بھی نہیں دیتی اور ایک فطری حجاب وحیا کو قائم رکھتی ہے جس سے باہمی اعتبار واعتماد بھی باقی رہتا ہے۔ اگر یہ حجاب نہ ہو تو دن رات ساتھ رہنے والے نوجوان بھائیوں اور بہنوں کے درمیان برائی سے مامون نہیں رہا جا سکتا۔

تیسرے جدید ماہرین طب نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ نہایت قریبی خاندانی رشتہ داروں کے درمیان ازدواجی تعلقات پیدا ہونے والی اولاد کے لئے انتہائی مضر اور شدید قسم کے امراض بالخصوص جنون اور عقلی توازن سے محرومی کا باعث ہو سکتے ہیں۔

عارضی محارم

کچھ اقربا وہ ہیں جن سے عارضی طور پر نکاح حرام ہے اور اس سلسلہ میں اصول یہ ہے کہ پہلے سے جو عورت نکاح میں ہے اس کی رشتہ دار دوسری عورت جو اس کے محرم کے درجہ کی ہو اور اگر ان دونوں میں سے کسی ایک کو مرد فرض کر لیا جائے تو ان دونوں کے درمیان باہم نکاح جائز نہ ہو، سے نکاح نہیں کیا جا سکتا مثلاً ایک بہن کی موجودگی میں دوسری بہن سے، یا پھوپھی اور بھتیجی یا خالہ اور بھانجی وغیرہ کو نکاح میں جمع کرنا جائز نہیں۔ ہاں اگر ان میں سے ایک سے علیحدگی ہو جائے تو دوسری

سے نکاح کیا جا سکتا ہے، قرآن مجید نے دو بہنوں کے جمع کرنے کو منع فرمایا ہے[1]۔ حدیث میں پھوپھی، بھتیجی اور خالہ بھانجی کے جمع کرنے کی ممانعت ثابت ہے[2]۔

ان رشتوں کو باہم نکاح میں جمع کرنے کی ممانعت قطعِ رحمی کے سدِّباب کے لئے ہے۔ سوکنوں کا رشتہ ایک ایسا رشتہ ہے جس میں فطری طور پر باہم نفرت، عداوت اور مخاصمت و منافست پیدا ہو جاتی ہے۔ شریعتِ اسلامی نہیں چاہتی کہ الفت و محبت اور غم خواری و غم گساری کے رشتوں کو قطعِ رحمی اور باہمی نفرت کے آگ میں سلگائے اور محبت و مودت کا خون کر دے۔

کتابیہ سے نکاح

شرک و کفر ایک ایسا فاصلہ ہے جو اسلامی نقطۂ نظر کے مطابق اہلِ ایمان سے رشتۂ نکاح کے لئے رکاوٹ بن جاتا ہے، البتہ اس سے صرف اہل کتاب یعنی یہودی اور عیسائی عورتوں کا استثنار ہے کہ مسلمان مرد ان سے نکاح کر سکتے ہیں۔ قرآن خود ناطق ہے:

وَالمحصنات من الذین اوتوا الکتٰب من قبلکم۔ — اور ان کی پارسائیں جن کو تم سے قبل کتاب مل چکی ہے، تمہارے لئے حلال ہیں۔ (مائدہ: ۵)

اس لئے اہل کتاب عورتوں سے اصولی طور پر نکاح کے جائز ہونے پر کہنا چاہیئے کہ اجماع ہے۔ خود حضرت عثمان غنیؓ نے "نائلہ" نامی عیسائی خاتون سے نکاح کیا ہے جو بعد کو مسلمان ہوگئیں اور حضرت طلحہؓ نے شام کی ایک یہودی خاتون سے[3] البتہ سوال یہ ہے کہ دار الکفر میں رہنے والی کتابیہ عورت سے نکاح

---

(۱) نساء: ۲۲۔

(۲) نیل الاوطار ۶/۵۸ بحوالۂ صحاح ستہ عن ابی ہریرۃ۔

(۳) احکام القرآن للجصاص ۲/۳۲۴۔

اور اسلامی ملک میں رہنے والی کتابیہ عورت کے درمیان فرق ہے یا نہیں؟

حضرت عبداللہ بن عباس تو دارالکفر کی کتابیہ سے نکاح کو بالکل ہی منع کرتے ہیں، لیکن عام فقہاء اس کی کراہت کی طرف مائل ہیں۔ اور یہی فقہاء احناف کی رائے ہے۔ واصحابنا یکرھون مناکحات الحرب من اھل الکتاب (۱)

وہ کتابیہ خواتین جو مسلم ممالک میں رہتی ہوں، عبداللہ بن عمرؓ ان سے بھی نکاح کو مکروہ قرار دیتے تھے (۲) حضرت عمرؓ کا واقعہ مشہور ہے کہ حضرت حذیفہؓ نے ایک یہودی خاتون سے نکاح کیا تو انہیں مکتوب لکھا اور طلاق دینے کا حکم فرمایا (۳) اس سے احساس ہوتا ہے کہ مسلم ممالک میں بھی اہل کتاب خواتین سے نکاح کراہت سے خالی نہیں، اس لئے علامہ شامی نے لکھا ہے کہ دارالکفر میں کتابیہ سے نکاح مکروہ تحریمی ہے اور دارالاسلام میں مکروہ تنزیہی (والاولی ان لا یفعل) یفید کراھۃ التنزیہ فی غیر الحربیۃ وما بعدہ یفید کراھۃ التحریم فی الحربیۃ (۴)

پس اہلِ کتاب عورتوں سے نکاح کی ناپسندیدگی کی وجہ ظاہر ہے۔ مَرد کے نہ صرف عمل بلکہ فکر و نظر پر بھی بیوی جس درجہ اثر انداز ہوتی ہے بچوں کی ذہنی نشو و نما میں ماں کا جو طاقتور کردار ہوتا ہے اور سماج اور سوسائٹی کے اصلاح و فساد میں خواتین کا جو حصہ ہے وہ محتاجِ اظہار نہیں۔ پھر ہمارے زمانہ میں اہلِ کتاب خواتین اور ان کی سوسائٹی میں جو اباحیت اور اخلاقی انارکی ہے وہ بھی محتاجِ اظہار نہیں، ان حالات میں اہل کتاب عورتوں سے نکاح کے بارے

---

(۱) احکام القرآن للجصاص ۳/۳۲۶۔
(۲) حوالۂ مذکور ۳/۳۲۴۔
(۳) رواہ ابن ابی شیبہ بسند لا بأس بہ۔
(۴) رد المحتار۔

میں صحیح نقطۂ نظر یہ ہے کہ :

۱۔ وہ عیسائی اور یہودی عورتیں جو خدا کے وجود اور نبوت کے نظام پر یقین رکھتی ہوں اور دہریہ اور مذہب کی منکر نہ ہوں ان سے نکاح کرنا جائز ہے۔

۲۔ لیکن یہ نکاح کراہت سے خالی نہیں، مسلم ممالک میں ہو تو مکروہ تنزیہی ہے اور غیر مسلم ملکوں میں ہو تو قریب بہ حرام۔

۳۔ وہ عورتیں جو نام کی عیسائی یا یہودی ہیں لیکن درحقیقت دہریہ اور لامذہب ہوں، ان سے نکاح جائز نہیں۔

۴۔ وہ عورتیں جو اسلام سے مرتد ہو کر عیسائی یا یہودی بن گئی ہوں ان سے بھی نکاح جائز نہیں۔

قادیانی سے نکاح

رہ گیا قادیانی عورتوں سے مسلمان مردوں کا نکاح تو وہ قطعاً حرام اور ناجائز ہے اور وہ اہلِ کتاب میں نہیں بلکہ زندیق کے حکم میں ہیں۔ راقم سطور نے اس سلسلہ میں ایک استفسار کے جواب میں جو کچھ لکھا ہے اس کا نقل کر دینا مناسب محسوس ہوتا ہے۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ شریعت نے رشتہ مناکحت اور ذبیحہ کی حلت و حرمت کے لحاظ سے اہلِ کفر کے دو درجے قرار دیئے ہیں۔ اہل کتاب اور کفار و مشرکین۔ اہلِ کتاب سے نکاح کو جائز قرار دیا گیا اور اہلِ کفر سے ناجائز، اسی طرح اہلِ کتاب کا ذبیحہ حلال قرار دیا گیا اور دوسرے اہلِ کفر کا ذبیحہ حرام۔ پھر اہلِ کتاب سے وہ لوگ مراد ہیں جو اسلام کے سوا کسی ایسے دین پر ایمان رکھتے ہوں جو سماوی ہو اور جن کے پاس ایسی کتاب منزّل ہو کہ بعد میں ہونے والی تحریف و تصحیف سے

قطعِ نظر قرآن فی نفسہٖ ان کے نزول کی تصدیق کرتا ہو۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

وکل من یعتقد دیناً سماویاً له کتاب منزل کصحف ابراھیم والشیث وزبور داؤد علیھم السلام فھو من اھل الکتاب فیجوز مناکحته واکل ذبائحه (۱)

اس طرح اہلِ کتاب اور اہلِ کفر جو اپنے کفر کے برملا معترف ہوں، کا معاملہ بالکل واضح ہے، لیکن مسئلہ ان لوگوں کا ہے جو اپنے آپ کو مسلمان بھی کہتے ہیں اور اپنے معتقدات کے لحاظ سے اصلاً وہ کافر ہیں۔ ان کو کس زمرہ میں رکھا جائے گا؟ مسلمانوں میں یا اہلِ کتاب میں یا وہ عام کفار کے حکم میں ہوں گے؟۔

یہ تو ظاہر ہے کہ ان کے عقائدِ کفریہ کی وجہ سے مسلمانوں میں ان کا شمار نہ ہوگا اور فقہی نظائر سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا شمار اہلِ کتاب میں بھی نہ ہوگا بلکہ وہ عام کفار کے حکم میں ہوں گے، نہ ان سے رشتۂ نکاح درست ہوگا اور نہ ان کا ذبیحہ حلال ہوگا، فقہاء نے ایسے لوگوں کو "زندیق" سے تعبیر کیا گیا ہے اور زندیق کی تعریف اس طرح کی گئی ہے:

ھو الذی یظھر الاسلام و یستصر بالکفر و ھو المنافق وکان یسمی فی عصر النبیؐ منافقاً ویسمی الیوم زندیقاً (۲)	جو اسلام تو ظاہر کرتا ہو مگر باطن کفر پر مصر ہو وہ منافق ہے۔ حضورؐ کے زمانہ میں ایسا شخص منافق کہلاتا تھا اور اسی کو اب زندیق کہا جاتا ہے

اسلامی حکومت کے لئے اہلِ کتاب اور کھلے ہوئے کافروں کا وجود قابلِ برداشت ہے لیکن ایسے منافقین قابلِ برداشت نہیں، اسی لئے فقہاء نے لکھا ہے کہ ان کو قتل کردیا جائے گا اور کھلے مرتد کی توبہ تو قبول کی جائے گی لیکن ایسے زندیق شخص کی توبہ بھی قبول نہیں کی جائے گی ویقتل الزندیق بعد الاطلاع علیه بلا

---

(۱) عالمگیری ۲/۸۔

(۲) مجمع الفقہ الحنبلی ۱/۱۴۴ بحوالہ المغنی۔

استتابة وهو من اسر الکفر واظهر الاسلام، وکان یسمی فی زمن النبی صلی اللہ علیہ وسلم واصحابہ منافقاً بلا قبول توبة من حیث قتلہ ولابد من توبتہ لکن ان تاب قتل حداً والا کفراً (۱)۔

چنانچہ فقہاء نے زندیق کو عام بت پرستوں اور کافروں کے حکم میں رکھا ہے، علامہ ابن نجیم نے فتح القدیر کے حوالہ سے لکھا ہے:

ویدخل فی عبدة الاوثان والصور التی استحسنوها والمعطلة والزنادقة والباطنیة والاباحیة و فی شرح الوجیز وکل مذہب یکفر بہ معتقدہ فہو یحرم نکاحہا لان اسم المشرک یتناولھم جمیعاً (۲)	بتوں اور تصاویر کے پرستاروں میں وہ لوگ بھی داخل ہیں جو انہیں بہتر سمجھتے ہیں، اور معطلہ، زنادقہ، باطنیہ اور اباحیہ بھی، شرح وجیز میں ہے کہ ہر وہ مذہب جس کے ماننے والے کی تکفیر کی جائے، اس کی عورتوں سے نکاح حرام ہے اس لئے کہ مشرک کا لفظ سب کو شامل ہے۔

اسی بنا پر بعض علماء نے ازراہِ احتیاط اہل سنت اور معتزلہ کے درمیان معتزلہ کے اہلِ قبلہ میں ہونے کے باوجود مناکحت کو ناجائز قرار دیا ہے: المناکحة بین اہل السنة واہل الاعتزال لا یجوز، کذا اجاب الشیخ الامام الرستغفنی (۳) فتاویٰ عالمگیری میں بھی بعض ایسے فرقے مثلاً مبیضہ وغیرہ کو کافر قرار دیا گیا ہے (۴) اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی شرح مؤطا کی عبارت جس میں ختمِ نبوت کے بالواسطہ انکار کرنے والوں کو زندیق قرار دیا گیا ہے، نے تو اس بات کو بالکل واضح اور بے غبار کردیا ہے کہ قادیانی بھی زندیق کے حکم میں ہیں اور ان کا حکم نکاح اور

---

(۱) الشرح الصغیر ۴/۴۳۸۔
(۲) البحر الرائق ۳/۱۱۰۔
(۳) خلاصة الفتاویٰ ۲/۶۔
(۴) عالمگیری ۲/۸۔

ذبیحہ کے معاملہ میں اہل کتاب کا نہیں بلکہ عام کافروں کا ہے اور یہ نہ صرف فقہار کی تصریحات کے مطابق ہے بلکہ شریعت کی اس روح کے بھی موافق ہے کہ ایسے تمام مسائل میں ایمان کا تحفظ سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے اس لئے جہاں اہلِ کتاب سے فتنہ کا اندیشہ ہو وہاں فقہار نے کتابیہ سے بھی نکاح کی اجازت نہیں دی ہے"۔

تعدّد ازدواج

اسلام سے پہلے تعدد ازدواج کی کوئی تحدید نہیں تھی، اسلام نے اس کو چار تک محدود کر دیا اور یہ پابندی بھی عائد کر دی کہ اگر عدل و انصاف کرنے پر خود کو قادر نہ پاتا ہو تو ایک ہی بیوی پر اکتفا کرے، ایک سے زیادہ نکاح نہ کرے۔

فان خفتم ان لاتعدلوا فواحدۃ (۱) اگر انصاف نہ کرسکو تو صرف ایک ہی نکاح کرو۔

اس لئے اگر کوئی شخص اپنے بارے میں اس پر مطمئن نہیں ہو کہ وہ اپنی تمام بیویوں کے ساتھ مساوات برت سکے گا تو اس کے لئے دوسری شادی کرنا جائز نہیں ہے۔ سید قطب شہید نے اس سلسلہ میں علمار سلف و خلف کا مسلک نقل کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اگر کوئی شخص اپنے آپ کو اس انصاف سے عاجز محسوس کرے اور اسے خوف ہو کہ وہ اس پر قادر نہ ہو سکے گا تو صرف ایک ہی نکاح درست ہے اور اس سے زیادہ نکاح ناجائز ہیں"۔ (۲)

اور امام احمد بن حنبل کے نزدیک تو اگر ایک عورت نکاح کے وقت یہ شرط لگا دے کہ وہ اس کی موجودگی میں دوسری شادی نہ کرے گا تو شوہر کو اس

---

(۱) نسار: ۳۔

(۲) فی ظلال القرآن ۱/۸۲۔

معاہدہ کی پابندی کرنی ہوگی اور اگر اس نے دوسرا نکاح کرلیا تو نکاح تو ہو جائے گا لیکن اس عورت کو علیحدگی کا اختیار حاصل ہو گا (۱)

حقیقت یہ ہے کہ بعض حالات میں عفت و عصمت کی حفاظت، بیواؤں اور یتیموں کی پرورش اور عورتوں کی شرح پیدائش میں اضافہ اور کثرت کے حل کیلئے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں رہتا کہ مردوں کو ایک سے زیادہ نکاح کی اجازت دی جائے، خود منصف مزاج علماء مغرب بھی اس کا اعتراف کرتے ہیں، مشرقی تمدن کے ماہر مستشرق عالم ڈاکٹر گستاؤلی بان لکھتے ہیں:

"مغرب میں بھی .... ایک ہی شادی کی رسم کا وجود صرف کتابوں میں ہے، اور میں خیال کرتا ہوں کہ کوئی شخص انکار نہ کرے گا کہ یہ رسم ہماری واقعی معاشرت میں نہیں پائی جاتی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ مشرقیوں کا جائز تعدد کس امر میں مغربیوں کے ناجائز تعدد ازدواج سے کم تر سمجھا جاتا ہے بلکہ میں کہوں گا کہ اول کو ہر طرح دوسرے پر ترجیح ہے۔" (۲)

زنا کی شناعت

ایک طرف جہاں اسلام نے نکاح اور نکاح کی بنا پر مرد و زن کے حلال و جائز اختلاط کو صدقہ و عبادت کا درجہ دیا ہے وہیں اس کی نگاہ میں زنا بدترین گناہ ہے۔ قرآن مجید نے نہ صرف زنا سے روکا ہے بلکہ زنا کے قریب بھی جانے کو بے حیائی اور بدراہی قرار دیا (اسراء ـ ۴) قرآن نے عورتوں کے لئے جن امور پر بیعت اور عہد و پیمان کو عورتوں کے لئے ضروری قرار دیا ہے ان میں سب

---

(۱) فی ظلال القرآن ۱/۸۲۔

(۲) تمدنِ عرب ص: ۳۶۶۔

سے اول یہی برائی ہے (ممتحنہ : ۲) ایک اور جگہ شرک اور قتلِ انسانی کے ساتھ اس برائی کی مذمت کی گئی ہے (الفرقان : ٦) حدیثوں میں حالتِ زنا کو ایمان کے مغایر قرار دیا گیا ہے لایزنی الزانی حین یزنی وھو مؤمن (۱) ایک روایت میں آپؐ نے فرمایا کہ زنا چہرے کی دل کشی کو ختم کر دیتا ہے اور رزق کو کاٹ دیتا ہے (۲) کبر سنی کے باوجود جو زنا کا مرتکب ہو، آپؐ نے فرمایا وہ کبھی جنت میں داخل نہیں ہوگا اور اللہ کی رحمت کبھی اس کی طرف متوجہ نہیں ہوگی (۳) ارشاد ہوا کہ جب کسی قوم میں زنا کی کثرت ہوتی ہے تو ان پر قحط سالی مسلّط کر دی جاتی ہے (۴) یہ بھی ارشاد فرمایا کہ زنا کے عموم سے کثرت سے موت واقع ہوگی ولا فشی الزنا فی قوم الاکثر فیہ الموت (۵) موت سے مراد غالباً مہلک اور جان لیوا امراض کا ظہور ہے۔ چنانچہ سب جانتے ہیں کہ آتشک، سوزاک، کینسر کی بعض قسمیں اور ایک نو پید لاعلاج خطرناک بیماری ایڈز عام طور پر اسی جنسی بے راہ روی اور بے اعتدالی کا نتیجہ ہوتی ہے۔

اسلام نے زنا کی شناعت کو دیکھتے ہوئے زنا پر نہایت سخت سزائیں مقرر کی ہیں جو غیر شادی شدہ لڑکے اور لڑکیوں کے لئے سَو کوڑے (فاجلدوا کل واحد منھما مائۃ جلدۃ (نور : ۲) شادی شدہ مرد و عورت کے لئے سنگسار کر دینا ہے (٦) ـــــــــــــــ واقعہ یہ ہے کہ زنا ایک ایسا جرم ہے جس سے پیدا ہونے والی بیماریوں کی سزا پورے سماج کو بھگتنی پڑتی ہے، جکی

---

(۱) مشکوٰۃ عن ابی ہریرہؓ ۱/ ۱۷۔

(۲) مجمع الزوائد ٦/ ۲۵۵ باب ذم الزنا۔

(۳) حوالۂ سابق۔

(۴) مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الحدود۔

(۵) مشکوٰۃ عن مالک ۲/ ۴۵۹۔

(٦) مشکوٰۃ عن جابر، کتاب الحدود ۱/ ۳۱۲۔

وجہ سے پوری سوسائٹی میں بے حیائی عام ہوتی ہے جو ایک عورت اور مرد کے لئے نہیں بلکہ دو خاندانوں کے لئے باعثِ ننگ و عار ہوتی ہے، جو پیدا ہونے والی بے نسب اولاد کے ساتھ بھی ناکردہ گناہ کی سزا کے درجہ میں ہے، یہ قانون فطرت سے بھی بغاوت اور انسانی شرافت کے ساتھ بھی کھلواڑ ہے اور ان سب سے بڑھ کر رب کائنات کی عدلِ حکمی اور نارضاجوئی نیز اس کے غیض و غضب کی دعوت ہے۔ اعاذنا اللہ منہ۔

فعلِ خلافِ فطرت

جنسی بے اعتدالی کی اس سے بھی بدترین شکل لواطت اور استلذاذ بالمثل ہے۔ یہ نہایت خلافِ فطرت اور اسلام کی نگاہ میں مبغوض اور قبیح فعل ہے۔ قرآن کے بیان کے مطابق حضرت لوط کی قوم پر محض اسی وجہ سے سخت بھیانک اور عبرتناک عذاب نازل ہوا، زمین پر پتھر کی سخت بارش ہوئی اور اس کی سطح پلٹ کر رکھدی گئی (ہود : ۷) ——— ایک روایت میں آپؐ نے ایسے شخص پر تین دفعہ لعنت بھیجی ہے (۱) حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ چار اشخاص کے بارے میں آپؐ نے فرمایا کہ ان کی صبح و شام اللہ کی غضب اور ناخوشنودی کی حالت میں ہوتی ہے۔ ان میں ایک اس فعل کا مرتکب بھی ہے (۲)

اس جرم کی شناعت کی وجہ سے فقہاء مضطرب ہیں کہ آخر ایسے مجرم کو کیا سزا دی جائے؟ بعضے کہتے ہیں کہ پہاڑ سے گرا کر ہلاک کر دیا جائے، بعض زانی کی سزا جاری کرنے کے قائل ہیں، بعض قتل کے اور بعض قاضی کی صوابدید پر رکھتے ہیں۔ حضرت علیؓ کی ایماء پر حضرت عثمانؓ نے غیر شادی شدہ لوطی پر زانی کی

---

(۱) مجمع الزوائد ۶/۲۷۲ باب ماجاء فی اللواط۔

(۲) حوالۂ سابق۔

سزا اسّی کوڑے جاری کرائی ہے (۱) خود حضورؐ نے فاعل اور مفعول دونوں کو قتل کر دینے کی ہدایت فرمائی ہے (۲) اور اکثر فقہاء کا رجحان اسی طرف ہے کہ ایسے مجرم کو قتل کر دیا جائے (۳) البتہ یہ "تعزیر" کے قبیل سے ہے اور تعزیر میں عدالت کو حالات و واقعات کے اعتبار سے کمی وزیادتی کا حق حاصل ہوتا ہے۔

جن اقوام میں یہ برائی عام ہے ان کو خود قدرت جان لیوا اور عبرتناک امراض کی صورت میں جیتے جی بھیانک سزا دے رہی ہے اور آخرت کی پکڑ اس سے سوا ہے۔ کہ ان بطش ربک لشدید۔

جانوروں سے تکمیل ہوس

ایسے ہی قبیح افعال میں جانوروں کے ذریعہ جنسی خواہش کی تکمیل و تسکین ہے اور واقعہ ہے کہ یہ ایسا عمل ہے کہ اس پر حیوانیت اور بہمیت کی جبینِ حیا بھی عرق آلود ہے ——— آنحضورؐ نے اس کی شدید مذمت فرمائی ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ جانور کے ساتھ بدفعلی کرنیوالے شخص اور خود جانور دونوں کو قتل کر دو (۴) فقہاء نے گو اس فرمان کو شدت و توبیخ پر محمول کیا اور از راہِ تعزیر عادی مجرم کیلئے قتل کی گنجائش رکھی ہے تاہم ایسا شخص قابلِ سرزنش ہے اس پر اتفاق ہے، جانور بھی ذبح کر دیا جائے گا اور زندہ و مردہ اس سے کوئی نفع نہیں اٹھایا جائے گا (۵) بعض روایات میں جانور کو ذبح کے بعد جلا دینے

---

(۱) مجمع الزوائد ۶/۲۷۲۔

(۲) نصب الرایہ ۲/۹۳، بحوالہ مستدرک حاکم عن ابن عمر۔

(۳) التشریع الجنائی الاسلامی ۱/۶۸۸۔

(۴) مجمع الزوائد ۶/۲۷۲ باب فی من اتی بہیمۃ۔

(۵) درمختار ۳/۲۲۔

کا بھی ذکر ہے (۱) لیکن ایسا کرنا واجب نہیں (۲) کیوں کہ اصل مقصود یہ ہے کہ برائی کے نشان کو باقی نہ رہنے دیا جائے کہ ایسا نہ کیا جائے تو انگشت نمائی ہوگی، برائی کا ذکر پھیلے گا اور اس سے خود ایک برائی کی طرف ذہن انسانی منتقل ہوگا۔

جنسی بے راہ روی کا سدّ باب

شریعت نے ناجائز چیز کو روکنے اور عفت وعصمت کی حفاظت کے لئے اور شرم وحیا کی بقا کے لئے مختلف تدبیریں کی ہیں۔ جن میں سب سے اول تو نکاح ہے لیکن اس کے علاوہ بعض اور احتیاطی تدبیریں بھی کی گئی ہیں، ان میں بدنگاہی کی ممانعت اور استیذان خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا: بدنگاہی آنکھوں کا زنا ہے (۳) ارشاد ہوا کہ شرم گاہ کے ذریعہ تو آخری درجہ کی تصدیق ہوتی ہے ورنہ آنکھیں، ہاتھ، پاؤں اور زبان یہ سب زنا کرتے ہیں، یعنی اس فعل زنا میں معاون ہیں (۴) اس لئے کہ برائی کا اولین خیال یہی نگاہ دل میں پیدا کرتی ہے، اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو حکم فرمایا کہ اپنی نگاہوں کو پست رکھیں قل للمؤمنین یغضوا من ابصارھم۔ یہی حکم مسلمان عورتوں کو بھی دیا گیا کہ نگاہیں پست رکھیں اور اپنی زیبائش و آرائش کا اظہار نہ کریں (نور: ۴) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نگاہ کو شیطان کے تیروں میں سے ایک زہر آلود تیر قرار دیا ہے۔

عورتیں اگر بضرورت گھر سے باہر نکلیں تب بھی ان کے لئے یہ ہدایت فرمائی کہ تبرج اور آرائش کا اظہار نہ کریں (احزاب: ۴) عام گذرگاہ سے بچکر کنارے

---

(۱) امام محمد: کتاب الآثار ص: ۹۲۔

(۲) المبسوط ۱۰۲/۹۔

(۳) مجمع الزوائد ۲۵۶/۶۔ باب زنا الجوارح عن علقمۃ من اصحاب رسول اللہ۔

(۴) حوالۂ مذکور عن سہل بن امامہ۔

چلا کریں۔ مسجد میں آئیں تو ان کی صف سب سے آخری ہو، گفتگو ایسی نہ کریں جس میں لوچ ہو (احزاب: ۴) آواز میں شیرینی اور جاذبیت نہ ہو جس سے اجنبی مردوں کا دل ان کی طرف کھینچے (۱) اجنبی مرد و عورت کا تخلیہ نہ ہو۔ آپؐ نے فرمایا کہ اس میں تیسرا شیطان ہوتا ہے لا یخلون رجل بامرأة الا کان ثالثهما الشیطان (۲) اصل میں یہ ساری قدغنیں اسی لئے ہیں کہ آخری درجہ کی برائی بیک خیال نہیں آتی، یہ زہر بتدریج پروان چڑھتا ہے۔ پہلے نگاہیں ملتی ہیں، پھر نگاہ کا تیر دل میں اترتا ہے اور دل میں آگ سلگتی ہے پھر اول زبان دامنِ حیا کو تار تار کرتی ہے اور اپنا مدعائے ہوس رکھتی ہے، پھر تنہائی اور ماحول کا اختلاط اس فتنہ کی آنچ کو اور تیز کرتا ہے زیبائش و آرائش کا اظہار، جاہلانہ تبرج اور زبان کی حلاوت اس آتش فتنہ کو اور سلگاتی اور بڑھاتی چلی جاتی ہے، یہاں تک کہ نوبت یہاں تک آپہونچتی ہے کہ انسان آخری درجہ کی برائی میں مبتلا ہو جاتا ہے، جب انسان بالخصوص عورت کے جسم سے ایک بار حیا کی چادر اترتی ہے تو پھر اس کا آشفتۂ ہوس اور وارفتۂ نفس بدن کبھی اس چادر کو اوڑھنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ کل جس کی نگاہ اٹھتے ہوئے شرماتی تھی اور جس کو زبان کھولنے میں بھی حجاب آتا تھا۔ آج اسے رقص گاہوں میں تھرکنے اور ناچنے اور محفلوں میں اپنے مدح سراؤں کے سازِ دل کو چھیڑنے اور تارِ نفس کو بجانے میں لطف آنے لگتا ہے، اسی لئے شریعتِ اسلامی اس فتنہ کے آغاز ہی پر روک لگاتی ہے اور اس فتنہ کی چنگاری کو سلگنے اور شعلہ و آتش بننے کی اجازت نہیں دیتی۔

حلق:

---

(۱) ردالمحتار ۱/۲۸۴۔
(۲) مشکوٰۃ ۲/۲۶۹۔

جنسی بے راہ روی ہی کی ایک صورت جلق اور استمنار بالید کی ہے، اسلام کی نگاہ میں انسان کا پورا وجود اور اس کی تمام تر صلاحیتیں اللہ کی امانت ہیں، قدرت نے ان کو ایک خاص مقصد کے تحت جنم دیا ہے جو شخص جسم کے کسی حصہ کا غلط استعمال کرتا ہے وہ دراصل خدا کی امانت میں خیانت اور خلق اللہ میں من چاہے تغییر کا مرتکب ہوتا ہے۔ انسان کے اندر جو جنسی قوت اور مادۂ منویہ رکھا گیا ہے وہ بھی بے مقصد اور بلا وجہ نہیں ہے بلکہ اس سے نسلِ انسانی کی افزائش اور بڑھوتری مقصود ہے اور اس قسم کا عمل چاہے جلق و استمنار بالید ہو یا اغلام بازی یا خود اپنی بیوی سے لواطت، اس مقصد کے عین مغائر اور اس سے متصادم ہے۔

اس لئے یہ عمل بھی ممنوع اور حرام ہے۔ آنحضورؐ نے فرمایا ایسے شخص کی طرف اللہ تعالیٰ قیامت کے دن توجہ نہیں فرمائیں گے (۱) ایک اور روایت میں آپؐ نے ایسے شخص پر اللہ اور اسکے فرشتوں کی لعنت بھیجی ہے (۲) اس کی حرمت پر سورۂ المؤمنون کی آیت ۵ تا ۷ سے بھی استدلال کیا جاتا ہے جس میں جنسی خواہشات کی تکمیل کے لئے دو ہی راستوں کی تحدید کر دی گئی ہے، ایک بیوی، دوسرے لونڈی، اور ظاہر ہے کہ یہ ایک تیسری صورت ہے، فقہار احناف نے اسے قابل تعزیر جرم قرار دیا ہے۔

قضار شہوت کی نیت سے ایسا کرنا قطعاً جائز نہیں، ہاں اگر شہوت کا غلبہ ہو، زنا سے بچنے اور شہوت میں سکون اور ٹھہراؤ پیدا کرنے کے لئے ایسا عمل کیا جائے تو لکھتے ہیں کہ امید ہے کہ اس پر وبال اور عذاب نہ ہوگا (۳) چنانچہ ایسے حالات

---

(۱) کنز العمال ۱۹۲/۸۔

(۲) کنز العمال ۱۹۴/۸۔

(۳) خلاصۃ الفتاویٰ ۲۶۰/۱ کتاب الصوم۔ جنس فی المجامعۃ۔

میں ابن عباس، عبداللہ بن عمر، مجاہد، حسن بصری وغیرہ سے اس کا جواز نقل کیا گیا ہے (۱) اسی ضرورت کے ذیل میں علاج اور میڈیکل جانچ کی غرض سے مادۂ منویہ کا نکالنا بھی ہے، تاہم ان سب کا تعلق اتفاق سے ہے۔ عادتاً تو کسی بھی طرح اجازت نہ دی جائے گی، کہ یہ نہ صرف اخلاق کو متأثر کرتا ہے اور فطرت سے بغاوت کے مترادف ہے بلکہ صحتِ انسانی کے لئے بھی سخت مضر ہے۔

عورتوں میں ہم جنسی

جس طرح مردوں کے درمیان فعلِ خلافِ فطرت حرام ہے اسی طرح عورتوں کے درمیان بھی فعلِ خلافِ فطرت جس کو "سحق" کہا جاتا ہے، ناجائز ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک عورت دوسری عورت کے ساتھ ایک کپڑے میں نہ رہے (۲) حضرت واصلہ سے مروی ہے کہ عورتوں کے درمیان باھم لذت اندوزی زنا ہے (۳) ایک روایت میں آپؐ نے اسے علاماتِ قیامت میں سے قرار دیا ہے کہ مرد مرد سے، عورت عورت سے اپنی ضرورت پوری کرے (۴)

قدرت نے مرد و عورت کو ایک دوسرے کی ضرورت اور تکمیلِ ضرورت کا سامان بنا کر پیدا کیا ہے اور اس کا مقصد بھی مجرد شہوت اور ہوس کی تکمیل نہیں، نسلِ انسانی کی افزائش اور اس کے بقا میں تسلسل ہے، ہم جنسی فطرت کے ان مقاصد میں مخل ہے اور قطعی غیر فطری عمل ہے۔

---

(۱) دیکھئے اعلاء السنن ۱۱/۲۷۷ باب مادرد فی استمناء الید بکفہ۔

(۲) المحلی ۱۱/۳۹۱۔

(۳) مجمع الزوائد ۶/۲۵۶ بحوالۂ طبرانی و ابو یعلیٰ باب زنا الجوارح۔

(۴) مجمع الزوائد بسند ضعیف۔ ۸/۳۲۲

ثبوتِ نسب :

اسلام میں نسب کے تحفظ اور شناخت کو خاص اہمیت دی گئی ہے کہ یہی انسان اور حیوان کے درمیان ایک واضح نقطۂ امتیاز ہے، اسی مقصد کے لئے پہلے شوہر سے علٰحدگی کے بعد دوسرے نکاح سے پہلے عدت گذارنے کو ضروری قرار دیا گیا ہے زنا کی حرمت میں سخت شدت برتی گئی، نسب کے تحفظ کے فقدان کی دونوں صورتیں ہوسکتی ہیں، کوئی شخص اپنے بچہ کے نسب کا انکار کردے یا کوئی بچہ اپنے کو ماں باپ کی طرف منسوب کرنے کے بجائے کسی اور کی طرف منسوب کرلے۔ آپ نے ان دونوں ہی باتوں کی مذمت فرمائی۔ ارشاد فرمایا کہ جس نے اپنے بچہ کے نسب کی نفی کی تاکہ دنیا میں اسے ذلیل کرے، اللہ تعالیٰ آخرت میں اس کو ذلیل فرمائیں گے (۱) ایک اور روایت میں ہے کہ ایسا باپ اور باپ کی نسبت کا انکار کرنے والا بیٹا دونوں ان لوگوں میں ہیں کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ نہ ان سے گفتگو فرمائیں گے اور نہ ان کو گناہوں سے پاک کریں گے اور نہ ان کی طرف نگاہِ رحمت اٹھائیں گے (۲)۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اصول مقرر فرمادیا کہ جس عورت کو ولادت ہو اس کا شوہر بچہ کا باپ ہوگا، زانی کا بچہ سے نسب ثابت نہ ہوگا "الولد للفراش و للعاھر الحجر" (۳) ——— مزاجِ شریعت کو سامنے رکھتے ہوئے فقہاء کا قاعدہ یہ ہے کہ ممکن حد تک بچہ کا نسب صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی جائے گی اور کسی مسلمان کی طرف زنا یا نتیجۂ زنا ہونے کی نسبت سے بچا جائے گا، اسی لئے

---

(۱) مجمع الزوائد ۵/۱۵ عن ابن عمر باب فی من یبرأ عن ولدہ ووالدہ۔
(۲) حوالۂ سابق۔
(۳) دیکھئے مجمع الزوائد ۵/۱۲ باب الولد للفراش۔

فقہاء نے زیادہ سے زیادہ مدتِ حمل مقرر کرنے میں غایت درجہ احتیاط بلکہ بعض فقہاء نے تو مبالغہ سے کام لیا ہے، امام ابوحنیفہ کے نزدیک مدتِ حمل دو سال[1] ہے اس طرح شوہر کے طلاق دینے یا وفات پانے کے بعد دو سال کے اندر اندر بچہ پیدا ہو جائے تب بھی نسب ثابت ہو جاتا ہے۔

ٹسٹ ٹیوب سے تولید

موجودہ سائنسی ترقیات اور انکشافات نے تولید و تناسل کے لئے بعض نئے مسائل کو ممکن بنا دیا ہے، انہیں میں سے ایک ٹسٹ ٹیوب کے ذریعہ تولید کا عمل ہے۔ بنیادی طور پر ٹسٹ ٹیوب کے ذریعہ تولید کی دو شکلیں ہیں:

اول یہ کہ اجنبی مرد و عورت کے مادۂ منویہ اور بیضۃ المنی کو باہم خلط کر کے تولید عمل میں آئے۔ چاہے یہ دو اجنبی مادے کسی ٹیوب میں خلط کئے جائیں یا خود اس عورت کے رحم میں یا کسی اور عورت کے رحم میں، یا خود اس مرد کی قانونی اور شرعی بیوی کے رحم میں ——— یہ صورت بہرحال ناجائز ہوگی کہ اس کی وجہ سے نسب میں اختلاط ہوتا ہے اور زنا کی ممانعت کی اصل وجہ یہی اختلاطِ نسب ہے۔ اس سلسلہ میں صریح نصوص موجود ہیں۔ آپؐ نے فرمایا:

لا یحل لامرئ یؤمن باللہ والیوم الآخر ان یسقی ماءہ زرع غیرہ۔[2]

خدا و آخرت پر ایمان رکھنے والے کسی شخص کے لئے روا نہیں کہ اپنے پانی سے دوسرے کی کھیتی سیراب کرے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ خود شوہر بیوی کے مادۂ حیات کو خلط کر کے تولید عمل میں آئے، اس کی بھی کئی شکلیں ہو سکتی ہیں:

---

(۱) ہدایہ ۲/۴۲۳، باب ثبوت النسب۔
(۲) سنن ترمذی

۱۔ شوہر کا مادہ انجکشن وغیرہ کے ذریعہ عورت کے رحم تک پہنچا دیا جائے۔

۲۔ شوہر و بیوی کے مادے حاصل کیئے جائیں اور کسی ٹیوب میں مخصوص مدت تک ان کی پرورش کی جائے، پھر اسی عورت کے رحم میں اس کو منتقل کر دیا جائے۔

۳۔ شوہر اور اس کی ایک بیوی کا مادہ حاصل کیا جائے اور اس آمیزے کو اسی شوہر کی دوسری بیوی کے رحم میں منتقل کر دیا جائے، اس لئے کہ اس کی پہلی بیوی زچگی کی متحمل نہ ہو یا طبی اسباب کی بنا پر تولید کی اہل نہ ہو۔

راقم سطور کا خیال ہے کہ گو ان صورتوں میں شوہر کے لئے جلق، عورت کے لئے دایہ کے سامنے بے ستری اور ایک گونہ استقرار حمل کے لئے غیر فطری طریق کے استعمال کی نوبت آتی ہے لیکن اگر طبی اعتبار سے عورت استقرار حمل کی صلاحیت نہیں رکھتی ہو اور حصولِ اولاد کا شدید داعیہ ہو تو اس کی اجازت دی جا سکتی ہے کہ یہ ایک طریقۂ علاج ہے اور شریعت میں علاج کے باب میں ان امور میں نرم روی کی گنجائش موجود ہے۔ ہاں بہتر اِن طریقوں سے اجتناب ہی برتنا ہے۔

یہ تو ظاہر ہے کہ اس مولود کا باپ وہی ہوگا جس کا مادہ تھا۔ ثبوتِ نسب کے لئے شوہر کے نطفہ سے بیوی کا حاملہ ہو جانا کافی ہے، جسمانی طور پر مباشرت ضروری نہیں (۱) ہاں اگر مرد کی ایک بیوی کا بیضۃ المنی حاصل کیا گیا اور دوسرے کے رحم میں پرورش و پرداخت ہوئی اور اس نے ولادت کی تکلیف برداشت کی، تو ظاہر ہے کہ یہ دوسری عورت اس کی ماں ہوگی اس لئے کہ قرآن نے بچہ جننے والی ہی کو ماں قرار دیا ہے لیکن چوں کہ اس پہلی عورت کا بیضۃ المنی بھی اس کی تکوین کے لئے اصل اور اساس بنا ہے اس لئے اس کو بھی ماں قرار دیا جانا چاہئے فقہاء کے یہاں بعض صورتوں میں ایسی نظیریں موجود ہیں کہ ایک بچہ کا نسب دو

---

(۱) دیکھئے عالمگیری ۲/۳/ ۲۴۲، مطبوعہ دیوبند۔

اشخاص سے ثابت کیا جائے (۱)۔

لِعان:

شریعت نے مسلمانوں کی عزت و آبرو کی حفاظت و صیانت کو واجب قرار دیا ہے۔ اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو خانۂ کعبہ کے ہم درجہ بتایا ہے۔ اسی لئے تجسس کو منع کیا گیا اور اسی وجہ سے بے محل شک و شبہ کو بھی ناپسند کیا گیا آپ نے اس بات سے منع فرمایا کہ خواتین کی لغزشوں کا پیچھا کیا جائے (۲) سفر سے واپسی پر حکم فرمایا گیا کہ رات میں گھر آنے کے بجائے شہر سے باہر ٹھہر جائے اور گھر اپنے آمد کی اطلاع پہلے ہی کر دے (۳) اس لئے بیوی کے کردار پر اعتماد و اعتبار کرنا چاہیئے اور بے بنیاد شکوک سے خود کو بچانا چاہیئے۔

لیکن ایسا بھی نہ ہو کہ شوہر غیرت و حیا سے بالکل محروم ہو جائے اور اپنی بیوی کے معاملہ میں ہر طرح کی بے غیرتی کو برداشت کرلے۔ اس لئے شریعت میں وہ تمام احتیاطی تدبیریں کی گئی ہیں جو اوپر ذکر ہو چکی ہیں، لیکن اگر ان سب کے باوجود عورت سے آخری درجہ کی بُرائی یعنی زنا کا صدور ہو جائے تو اب مَرد کیا کرے؟

شریعت کے عام اصول کے مطابق اسے چار گواہ فراہم کرنے چاہئیں۔ اور اگر یہ فراہم نہ کریں تو خود کو بہتان کی سزا یعنی اسّی کوڑے کھانے کیلئے تیار رہنا چاہیئے، لیکن صورتِ حال یہ ہے کہ ایسے معاملات میں چار عینی گواہوں کی دستیابی مشکل ہے اور معاملہ صرف دوسرے کی زندگی پر الزام دھرنے کا نہیں ہے بلکہ خود اپنی زندگی میں اعتماد و اعتبار کے باقی رہنے اور نہ رہنے کا ہے کیونکہ

---

(۱) دیکھئے البحر الرائق ۳/۱۱۹ —— تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو راقم کی تحریر "ٹسٹ ٹیوب سے تولید اور اس کے احکام"، جدید فقہی مسائل حصہ دوم۔

(۲) تخریج احیاء العلوم للعراقی ۲/۴۵ بحوالہ طبرانی عن جابر۔

(۳) حوالۂ مذکور بحوالۂ مسلم۔

شادی شدہ عورت کی بے عفتی براہِ راست شوہر کی تذلیل، اس کی اولاد کے نسب کو مشکوک کرنا اور اس کے سکون کو درہم برہم کرنا ہے۔

اس لئے شریعت نے اس صورت میں ایک خصوصی استثنائی صورت پیدا کی ہے اور وہ یہ کہ شوہر اور بیوی سے الزام کے صحیح ہونے اور نہ ہونے کے سلسلہ میں چار چار دفعہ قسم کھلائی جائے پانچویں بار مرد سے کہلایا جائے کہ اگر میں اپنی بات میں جھوٹا ہوں تو مجھ پر خدا کی لعنت ہو، اسی طرح عورت سے چار بار قسم کھلانے کے بعد پانچویں بار کہلایا جائے کہ اگر میرا شوہر اپنے دعویٰ میں سچا ہے تو مجھ پر خدا کا غضب ہو۔ (نور : ٦)

شوہر اگر بچہ کی ولادت کے فوراً بعد اس بات سے انکار کر دے کہ وہ اس کا بچہ ہے یا اس وقت انکار کر دے جب مبارکباد وغیرہ دی جاتی ہے تو قاضی جہاں لعان کے ذریعہ میاں بیوی میں علٰحدگی کر دے گا وہیں یہ بھی ہوگا کہ بچہ کا نسب اس مرد سے ثابت نہیں ہوگا اور وراثت وغیرہ اسے نہیں ملے گی لیکن اگر مبارکباد وغیرہ کا وقت گذر گیا اور اس کے بعد اس نے اس بچہ کے ولد الزنا ہونے کا دعویٰ کیا تو لعان کے ذریعہ ان دونوں میں علٰحدگی کرادی جائے گی مگر بچہ کا نسب اسی شخص سے ثابت ہوگا (۱) تاہم خیال رہے کہ محض شک اور احتمال و امکان کی بنا پر بیوی پر اتنا بڑا الزام دھرنا سخت گناہ ہے اور مبغوض عمل ہے۔ لِعان اسی وقت ہے جب کہ ایک شخص اپنی بیوی کو عینِ زنا میں دیکھے اور اس بدکاری میں ملوث پائے۔

ایلاء و ظہار :

رشتۂ ازدواجی میں جو چیزیں حرام اور باعثِ گناہ ہیں ان میں ایلاء

---

(۱) ہدایہ ۲/۴۲۰۔

اور ظہار بھی ہے ۔ ایلاء سے مراد بیوی سے تعلقِ ازدواجی نہ رکھنے کی قسم کھالینا ہے ایسی صورت میں اگر چار ماہ تک بیوی سے صحبت نہیں کی تو بیوی پر از خود طلاق واقع ہو جاتی ہے (بقرہ : ۲۲۷) ——— ظہار یہ ہے کہ اپنی بیوی یا اس کے کسی حصہ کو محرم رشتہ دار یا اس کے کسی ایسے حصہ سے تشبیہ دے جس کو دیکھنا حرام ہے ، ظہار چوں کہ ایک گناہ اور بیوی کو اذیت پہنچانا ہے اس لئے گناہ اور معصیت ہے اور اس کی سزا یہ ہے کہ مقررہ کفارہ جب تک ادا نہ کرے بیوی سے مباشرت نہیں کرسکتا ۔ ظہار کا کفارہ یہ ہے کہ ایک غلام یا باندی کو آزاد کرے ، اگر اسکی استطاعت نہ ہو تو دو مہینے روزہ رکھے ، یہ بھی نہ ہو سکتا ہو تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے ۔ (مجادلہ : ۳) ——— یہ سزاؤں کا متعین کیا جانا اور کفارات کا واجب ہونا اس بات کی علامت ہے کہ ایلاء و ظہار گناہ اور اللہ کے نزدیک ناپسندیدہ باتیں ہیں (۱)

خاندانی منصوبہ بندی

موجودہ زمانے کے سماجی مسائل میں ایک اہم مسئلہ ضبط ولادت اور خاندانی منصوبہ بندی کا ہے ، بعض مغربی مفکرین نے معاشی وسائل اور مسائل کے درمیان توازن باقی رکھنے کے لئے ضبط تولید کے نظریہ کو ایک ضرورت کا درجہ قرار دیکر پیش کیا ہے ۔ اسلام بنیادی طور پر معاشی وجوہ کے تحت خاندانی منصوبہ بندی کے حق میں نہیں ہے ، اس کا ایقان ہے کہ جو خدا کائنات میں ضرورتمند انسانوں اور حیوانوں کو پیدا کرتا ہے وہی خدا مناسب حال وسائلِ معاش اور غذائی پیداوار میں بھی اضافہ کرتا رہتا ہے کہ وہ رزاق بھی ہے اور علیم و قدیر بھی ۔

(۱) ایلاء و ظہار کے احکام کیلئے ملاحظہ ہو راقم الحروف کی تالیف "طلاق و تفریق" ص : ۴۸ تا ۵۳ ۔

ہاں بعض اوقات خصوصی طبی ضروریات کے تحت یہ بات درست ہے کہ متعلق افراد ضرورۃً ضبطِ ولادت کی بعض صورتیں اختیار کرلیں۔ ضبط ولادت کی مختلف صورتیں ہیں اور ان کے احکام بھی الگ الگ ہیں اس لئے مختلف صورتوں کے بارے میں الگ الگ احکام لکھے جاتے ہیں:

مستقل منع حمل

منع حمل کی ایسی صورت جو مستقل طور پر قوتِ تولید کو ختم کر دے جس کے لئے ہمارے زمانے میں مردوں کی نسبندی اور عورتوں کا آپریشن کیا جاتا ہے، اصلاً حرام ہے۔ قدیم زمانہ میں اس کے لئے "اختصاء" کی صورت اختیار کی جاتی تھی بعض صحابہؓ نے خود کو خصی کرنا چاہا تاکہ اپنا زیادہ سے زیادہ وقت عبادت کے لئے یکسو کرسکیں تو آپؐ نے منع فرمایا۔ حضرت سعد بن وقاصؓ سے مروی ہے کہ اگر حضورؐ نے اس کی اجازت دی ہوتی تو ہم لوگ خصی ہو جاتے رد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی عثمان بن مظعون التبتل ولو اذن لاختصینا (۱) اسی بنا پر فقہاء نے بھی "اختصاء" کو حرام قرار دیا ہے۔ قاضی ابوالحسن ماوردی لکھتے ہیں:

ویمنع من خصاء الآدمیین والبہائم ویؤدب علیہ (الاحکام السلطانیۃ)

حافظ ابن حجرؒ نے نہ صرف اختصاء، بلکہ ایسی ادویہ کے استعمال کو بھی حرام قرار دیا ہے جو قوتِ تولید کو ختم کر دے اور اس پر اتفاق نقل کیا ہے:

والحجۃ فیہ انہم اتفقوا علی منع الجب والخصاء فیلحق بذلک ما فی معناہ من التداوی بالقطع اصلاً (۲)۔

---

(۱) بخاری و مسلم عن سعد بن وقاصؓ۔

(۲) فتح الباری ۹/۹۷۔

نفخ رُوح کے بعد اسقاط

اسقاطِ حمل کے مسئلہ پر غور کرنے کے لیے ہمیں اس کے دو مرحلوں پر غور کرنا چاہیئے، ایک صورت یہ ہے کہ حمل میں جان پیدا ہو چکی ہے۔ حدیث کے مطابق استقرارِ حمل کے چار ماہ یعنی ۱۲۰ ردن بعد روح پیدا ہوتی ہے، غالباً "علم الجنین" کے جدید ماہرین بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔ روح پیدا ہونے کے بعد اسقاطِ حمل بالاجماع حرام ہے، احمد علیش مالکی فرماتے ہیں: والتسبب فی اسقاطه بعد نفخ الروح فیه محرم اجماعاً وهو من قتل النفس (۱)

اور فتاویٰ شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ میں ہے:

اسقاط الحمل حرام باجماع المسلمین و هو من الوأد الذی قال تعالیٰ فیه وَإِذَا الْمَوْؤُدَةُ سُئِلَتْ بِأَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ (۲) البتہ اگر بچہ بطنِ مادر میں زندہ ہو اور اس کے اسقاط کے بغیر ماں کی زندگی بچانا ممکن نہ ہو تو اس وقت اسقاط کی اجازت ہونی چاہیئے اس لیے کہ ان دو ضرر میں سے ماں کی موت بڑا ضرر ہے اور بچہ کی موت کم تر ضرر۔ نیز ماں کا زندہ وجود مشاہد و معائن ہے اور بچہ کا مظنون جیسا کہ فقہاء نے استحساناً ان مسلمانوں کو قتل کرنے کی اجازت دی ہے جسے کفار اپنے لشکر کے آگے ڈھال بنائے رہیں کہ مملکتِ اسلامیہ کا اہل اسلام کے ہاتھ سے نکل جانا چند مسلمانوں کی موت کے مقابلہ بڑا ضرر ہے۔

یہاں ان عبارتوں سے شبہ ہو سکتا ہے جن میں ایک شخص کی جان لے کر دوسرے کی جان بچانے کو فقہاء نے منع کیا ہے مثلاً ابن نجیم کی یہ عبارت کہ لا ت

---

(۱) فتح العلی المالکی ۱/۳۹۹۔

(۲) فتاویٰ ابن تیمیہ ۴/۲۱۷۔

احیاء نفس بقتل نفس اخری لم یرد فی الشرع (۱) یا شرح السیر الکبیر کی یہ عبارت کہ ان المسلم لا یحل لہ ان یتقی روحہ بروح من مثلہ فی الحرمۃ (۲) مگر اس امر کو ملحوظ رکھنا چاہیے کہ یہ حکم اس وقت ہے جب دونوں زندگیاں اور دونوں وجود ایک درجہ کے ہوں اور یہاں ماں کا وجود مشاہد ہے جبکہ بچہ کی زندگی موہوم ہے۔

نفخ رُوح سے قبل اسقاط

نفخ روح سے پہلے اسقاطِ حمل کے متعلق بعض فقہاء کی عبارتوں سے شبہ ہوتا ہے کہ وہ اس کو مطلقاً جائز اور درست سمجھتے ہیں، اس طرح کی تحریریں احناف شوافع اور حنابلہ تینوں ہی کے یہاں موجود ہیں البتہ مالکیہ اور شوافع میں امام غزالی نے نفخِ روح سے پہلے بھی اسقاطِ حمل کو مطلقاً ناجائز قرار دیا ہے تاہم حقیقت یہ ہے کہ احناف شوافع اور حنابلہ کے ہاں بھی یہ جواز اس صورت میں ہے جب کوئی عذر درپیش ہو، بلا عذر اسقاط ممنوع اور گناہ کا باعث ہے۔ علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: لا یخفی انہا تأثم اثم القتل لو استبان خلقہ ومات بفعلہا (۳) (یہ بات ظاہر ہے کہ اگر اس کی تخلیق ظاہر ہو جائے اور عورت کے کسی فعل کی وجہ سے اس کی موت ہو تو اس کو قتل کا گناہ ہوگا)

اعضاء کے ظہور سے پہلے اور استقرار حمل کے بعد بھی اسقاط جائز نہیں

انہ یکرہ فان الماء بعد ما وقع فی الرحم مآلہ الحیاۃ فیکون لہ حکم الحیاۃ کما فی بیضۃ صید المحرم (۴) (اعضاء کے ظہور سے پہلے بھی اسقاط مکروہ ہے کیوں کہ مادۂ منویہ کے

---

(۱) البحر الرائق ۸/۲۰۵)

(۲) شرح السیر الکبیر

(۳) رد المحتار ۵/۵۱۹۔

(۴) حوالہ سابق ۵/۵۱۲۔

رحم میں جانے کے بعد اَب اس کا مآل حیات اور زندگی ہے لہذا وہ زندہ وجود کے حکم میں ہوگا جیسا کہ حرم کے شکار کے انڈے کا حکم ہے)۔

پس یہ بات قریب قریب بے غبار ہے کہ نفخ روح سے قبل بھی اسقاطِ حمل جائز نہیں، البتہ کسی ایسے عذر کی بنا پر جو عندالشرع معتبر ہے، اسقاطِ حمل جائز ہوگا اور ظہیریہ اور عالمگیری وغیرہ میں جہاں مطلقاً اسقاطِ حمل کا جواز مذکور ہے، وہاں حالتِ عذر ہی میں اسقاطِ حمل مراد ہے۔ یہ اعذار دو طرح کے ہو سکتے ہیں، ایک وہ جن کا تعلق خود جنین سے ہو۔ مثلاً خِلقی نقص، جسمانی اعتبار سے عدم اعتدال یا خطرناک موروثی امراض کا وجود۔ ان اعذار کی بنا پر اسقاط کی اجازت دی جا سکتی ہے اس لئے کہ جب "استبانتِ خلق" سے پہلے بعض شرائط کے ساتھ اس مقصد کے لئے بھی اسقاط کی اجازت دی ہے کہ زیر پرورش بچہ کی رضاعت متأثر نہ ہو اور زیر بحث صورت میں خود پیدا ہونے والے بچہ کو پیدائش کے بعد جس ضرر قوی کا اندیشہ ہے وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے رضاعت والے ضرر سے بڑھ کر ہے اس لئے ان صورتوں میں بدرجۂ اولیٰ اسقاط جائز ہونا چاہیئے۔

دوسری قسم کے اعذار وہ ہیں جن کا تعلق "ماں" سے ہو، مثلاً ماں کی جان کو خطرہ ہو، دماغی توازن متأثر ہونے کا اندیشہ ہو۔ جسمانی یا دماغی طور پر معذور ہونے کی وجہ سے بچہ کی پرورش کرنے کی اہل نہ ہو اور دوسرے رشتہ دار بھی نہ ہوں جن سے توقع ہو کہ وہ اس بچہ کی پرورش کریں گے، زنا بالجبر سے حاملہ ہو گئی ہو، ان تمام صورتوں میں نفخِ روح سے پہلے اسقاط جائز ہوگا۔ کیوں کہ فقہاء نے اس سے کم تر قسم کے اعذار پر بھی اسقاط کی اجازت دی ہے، البتہ اگر ماں باپ یوں ہی اولاد نہ چاہیں اور اس غرض کے لئے اسقاط کرائیں یا ماں کی عام صحت پر اثر پڑنے کا اندیشہ ہو لیکن کسی غیر معمولی مرض کا امکان نہ ہو تو ایسی صورتوں

میں نفخِ روح سے قبل بھی اسقاطِ حمل درست نظر نہیں آتا۔

مانع حمل ادویہ

عارضی منعِ حمل کی یہ صورت کہ ایسی ادویہ استعمال کی جائیں کہ مرد کا مادۂ منویہ عورت کے جسم کے داخلی حصہ میں پہنچ جائے لیکن تولید کے لائق باقی نہ رہے، یہ بھی بلا عذر جائز نہیں۔ شمس الائمہ سرخسی حنفی فرماتے ہیں: ثم الماء فی الرحم مالم یفسد فہو معد للحیاۃ فیجعل کالحی فی ایجاب ذلک الضمان باتلافہ کما یجعل بیض الصید فی حق المحرم کالصید فی ایجاب الجزاء علیہ بکسرہ (۱)۔
(مادۂ منویہ رحم میں جب تک فاسد نہ ہو اس وقت تک زندگی قبول کرنے کا اہل ہوتا ہے لہٰذا اس کو ہلاک کرنے پر تاوان واجب کئے جانے کے مسئلہ میں وہ زندہ وجود کی طرح ہے جیسا کہ محرم شکار کا انڈا توڑ دے تو وہ جزا واجب ہونے کے حق میں خود شکار کے درجہ میں ہے)

شیخ احمد علیش مالکی لکھتے ہیں:

لا یجوز استعمال دواء لمنع الحمل واذا امسک الرحم المنی فلا یجوز للزوجین ولا لاحدھما ولا للسید التسبب فی اسقاطہ قبل الخلق علی المشھور (۲)۔
(منعِ حمل کے لئے ادویہ کا استعمال جائز نہیں اور جب رحم منی کو قبول کرلے تو زوجین یا ان میں سے ایک یا آقا کے لئے اعضاء کی تخلیق سے پہلے بھی قول مشہور کے مطابق اسقاط کی تدبیر کرنا جائز نہیں)

مانع حمل کے خارجی ذرائع:

---

(۱) مبسوط ۲۶/۸۷۔
(۲) فتح العلی المالکی ۱/۳۹۹۔

عارضی منعِ حمل کیلئے نرودھ کا استعمال کرنا یا عورت کے رحم پر کوئی غلاف چڑھا دینا بالکل اسی طرح ہے جیساکہ اوائلِ اسلام میں "عزل" کا ذکر ملتا ہے عزل کی اباحت اور کراہت میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے اور اکثر شروحِ حدیث میں اس کی تفصیل موجود ہے، تاہم اکثر صحابہ اور سلف صالحین اس کو مکروہ ہی سمجھتے تھے (۱) احناف کی طرف منسوب ہے کہ وہ اس کو بلا کراہت مباح سمجھتے ہیں لیکن ابن ہمام کا بیان ہے کہ مشائخِ احناف میں بھی بعض اس کی کراہت کے قائل ہیں۔ فی بعض اجوبة المشائخ الکراهیة وفی بعضها عدمها۔ مشہور حنفی محدث ملا علی قاری نے عزل کے متعلق حدیث کے اس فقرہ "ذلك الواد الخفی" کی توجیہ کرتے ہوئے لکھا ہے لایدل علیٰ حرمة العزل بل یدل علی الکراهة "(۲) ———— حقیقت یہ ہے کہ احادیث کے لب ولہجہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

نرودھ کا عزل کے حکم میں ہونا تو واضح ہے، لوپ بھی اسی حکم میں ہے اسی لئے فقہاء نے مرد کے عزل کرنے کے درست ہونے کو جس طرح عورت کی رضامندی پر مشروط رکھا ہے اسی طرح عورت کے فمِ رحم کے کسی طرح بند کرنے کو بھی مرد کی رضامندی پر مشروط کیا ہے۔ یجوز للمرأة ان تسد فم الرحم منها من وصول ماء الرجل الیه لاجل منع الحمل واشترط صاحب البحر لذلك اذن الزوج (۳) اور غور کیا جائے تو مقامِ مخصوص پر مانعِ حمل دواؤں کا لگانا بھی اسی حکم میں ہے، اس لئے کہ عزل اور لوپ کے استعمال سے ... مادۂ منویہ عورت کے رحم میں داخل ہی نہیں ہو پاتا اور اس قسم کی ادویہ

---

(۱) المحلی ۱۱/۹۲ - ۳۹۱۔

(۲) مرقاة المفاتیح ۳/۴۴۱۔

(۳) رد المحتار ۲/۴۱۲۔

کے استعمال سے بھی مرد کے مادۂ منویہ کے تولیدی جراثیم مرجاتے ہیں اور عورت کے رحم تک پہنچ نہیں سکتے ———— پس چوں کہ عزل مکروہ ہے اس لئے بلا عذر منع حمل کے ان ذرائع کا استعمال بھی مکروہ ہے، اس سلسلہ میں بعض اعذار خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، مثلاً:

ماں کے لئے ہلاکت کا خطرہ ہو، ان کی دماغی صحت یا جسمانی کمزوری یا کسی شدید مرض کا اندیشہ ہو، ماں بچہ کی پرورش کے لائق نہ ہو اور کوئی متبادل نظم نہ ہو، بچہ کے شدید امراض میں ابتلاء کا امکان ہو، دو بچوں کے درمیان مناسب فاصلہ رکھنا مقصود ہو، یہ اور اس طرح کے اعذار ہیں کہ ان کی وجہ سے ایسے عارضی موانع کا استعمال درست ہے، اس لئے کہ فقہاء نے اس سے کمتر امر مثلاً بچوں سے متوقع نافرمانی اور بدسلوکی کے خوف سے بھی عزل کی اجازت دی ہے، فتاویٰ عالمگیری میں ہے " رجل عزل عن امرأته بغیر اذنها یخاف من الولد السوء فی هذا الزمان فظاهر جواب الکتاب ان لا یسعه وذکر هٰهنا یسعه لسوء الزمان (۱)

چھوٹا خاندان رکھنے کے لئے اس کا استعمال درست نہیں کہ "تزوجوا الودود الولود" (حدیث) کے خلاف ہے، سماجی دل چسپی کے لئے سلسلۂ تولید پر تحدید بھی صحیح نہیں اور یہ اسلام کے منشا اور صنفِ نازک کے فرائض مادری کے خلاف ہے، حسن و جمال کے تحفظ کے لئے لوگوں نے اس کو جائز رکھا ہے مگر جذبۂ حسن آرائی کو عورت کے فطری فرائض پر تفوق دینا بھی صحیح نہیں نظر آتا، اس لئے یہ اعذار عند الشرع ناقابلِ اعتبار ہیں، ہاں اگر خصوصی حالات کی وجہ سے ضروریاتِ زندگی کی تکمیل کے لئے عورت کسبِ معاش پر مجبور ہو تو اس کو اجازت دی جا سکتی ہے، اسی طرح اقتصادی نقطۂ نظر سے اس وقت جو تحریک تحدید نسل کی چل رہی ہے وہ

---

(۱) عالمگیری ۴/۱۱۲-

بے شک جاہلیتِ قدیمہ کی صدائے بازگشت ہے اور "لاتقتلوا اولادکم خشیۃ املاق" کے تحت ناجائز ہے کیوں کہ آیتِ کریمہ میں صرف "قتل اولاد" ہی کی ممانعت نہیں ہے بلکہ "خشیۃ املاق" کے تصور کو بھی مذموم قرار دیا گیا ہے۔

فطری طریقہ

عارضی منعِ حمل کی یہ صورت کہ اس کے لیے کسی فعل کا ارتکاب نہیں کیا جائے بلکہ ان مخصوص ایام میں مجامعت سے باز رہا جائے جن میں طبی تحقیق کے مطابق استقرار کا زیادہ امکان ہو، فی نفسہٖ جائز ہے لیکن اگر ایسی نیت ہو جس کو شریعت کا مزاج قبول نہ کرتا ہو تو مکروہ ہوگا۔

ضبطِ تولید میں تعاون

"منعِ حمل" کی جو صورتیں جائز نہیں، مسلمان ڈاکٹروں کے لئے ان میں تعاون کرنا درست نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ معصیت میں تعاون کی ممانعت فقہاء کے نزدیک مسلّمہ ہے۔ خلاصۃ الفتاویٰ میں ہے "ولو اجر نفسہ من ذمی لیعصر لہ فیتخذ خمرا یکرہ" (۱) اور اس معاملہ میں مسلمان اور کافر کے درمیان تفریق صحیح نظر نہیں آتی، اس لئے کہ معصیت میں تعاون خود کافروں کے ساتھ درست نہیں گو ان کے دین میں اس کی اجازت ہو۔ فقہاء نے لکھا ہے: رجل لہ اب ذمی او امرأۃ ذمیۃ لیس لہ ان یقودہ الی البیعۃ ولہ ان یقودہ من البیعۃ الی منزلہ لان الذہاب الی البیعۃ معصیۃ والی المنزل لا (۲)

---

(۱) خلاصۃ الفتاویٰ ۴/۳۴۶۔

(۲) حوالۂ مذکور ۴/۳۴۷۔

طلاق

شریعت کی نگاہ میں نکاح ایک پاکیزہ، ٹھوس اور پائیدار رشتہ ہے، اسلام چاہتا ہے کہ جن دو مرد و عورت نے نکاح کی صورت میں ایک ساتھ زندگی بسر کرنے اور ایک دوسرے کے ساتھی بن کر رہنے کا عہد کیا ہے وہ ہمیشہ اس پر قائم رہیں اور معمولی معمولی باتوں اور زندگی کی چھوٹی چھوٹی وقتی الجھنوں کی وجہ سے اس مضبوط رشتہ کو ڈھانہ دیں۔

طلاق چوں کہ اسی رشتہ کے توڑنے کا نام ہے۔ اس لئے فطری بات ہے کہ اسلام اس کو پسند نہیں کرتا۔ حدیث میں ہے کہ شیطان کو سب سے زیادہ خوشی ہوتی ہے کہ میاں بیوی کے درمیان جدائی پیدا کر دی جائے (۱) حضرت ثوبان سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا جو عورت بلا وجہ شوہر سے طلاق کا مطالبہ کرے اس پر جنت کی خوشبو حرام ہے (۲) آپ نے نکاح کا حکم دیا اور طلاق سے منع فرمایا ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اس طرح مزہ چکھنے اور ایک عورت یا مرد کی لذت اٹھا کر پھر اس سے جدائی اختیار کرنے والے مردوں اور عورتوں کو پسند نہیں کرتا (۳) ایک اور روایت میں آپ نے فرمایا کہ اللہ کے نزدیک حلال چیزوں میں طلاق سے زیادہ کوئی شئی مبغوض نہیں (۴) اسی لئے فقہاء نے بھی شدید ضرورت کے بغیر طلاق دینے کو ناجائز قرار دیا ہے، علامہ ابن قدامہ مقدسی فرماتے ہیں کہ بلا ضرورت طلاق دینا مکروہ ہے۔ ایک اور بزرگ سے طلاق کا حرام ہونا،

---

(۱) صحیح مسلم۔

(۲) ترمذی۔ ابوداؤد، ابن ماجہ، باب ماجاء فی المختلعات

(۳) ان اللہ لا یحب الذواقین والذواقات، مجمع الزوائد ۴/۳۳۵ باب فیمن یکفر الطلاق۔

(۴) ابوداؤد عن ابن عمر باب کراہیۃ الطلاق ۲/۲۹۶۔

نقل کرتے ہیں کیوں کہ یہ خود اس مرد کے لئے اور اس کی بیوی دونوں کے لئے نقصان کا باعث ہے۔ اور حضورؐ نے فرمایا ہے کہ نہ اپنا نقصان کرو اور نہ دوسرے کو نقصان پہنچاؤ لاضرر ولاضرار (۱) مشہور حنفی عالم علامہ سرخسی فرماتے ہیں:

لایباح ایقاع الطلاق الاعند الضرورة لقوله علیه السلام لعن الله کل ذواق مطلاق وقال ایما امرأة اختلعت من زوجها من نشوز فعلیها لعنة الله والملٰئکة والناس اجمعین وقد روی مثله فی الرجل یخلع امرأته ولان فیه کفران النعمة۔ (۲)	محض ضرورت ہی کے موقع پر طلاق دینا جائز ہے کہ حضورؐ کا ارشاد ہے اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے ذائقہ چشی کرنے والے اور بہت زیادہ طلاق دینے والے پر اور جس عورت نے اپنے شوہر سے ناواجبی خلع کا مطالبہ کیا اس پر خدا اور تمام فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت ہے اور اس طرح کے الفاظ اس مرد کے بارے میں بھی مروی ہیں جو اپنی بیوی سے خلع کرے کہ یہ نعمتِ خداوندی کی ناشکری ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس امر کی طرف بھی اشارہ فرمایا کہ وہ ضرورت کون سی ہے جس کی وجہ سے طلاق دی جاسکتی ہے؟ ارشاد ہوا: لاتطلق النساء الا من ریبة (۳) عورتوں کو طلاق نہ دی جائے مگر اس وقت جب کہ اس کا کردار مشکوک ہو۔ یوں صرف کردار کے مشکوک ہونے پر ہی موقوف نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کبھی کبھی طلاق اور میاں بیوی کی جدائی ایک ضرورت اور مجبوری بن جاتی ہے۔ کسی وجہ سے زندگی کی راہ پر ایک ساتھ چلنا ممکن نہیں ہوتا اور حالات ایسے ہوجاتے ہیں کہ ایک دوسرے سے علیحدہ رہ کر ہی زندگی بسر کرنے میں دونوں کے لئے عافیت رہتی ہے، ان حالات

---

(۱) المغنی ۷/۲۳۶۔

(۲) المبسوط ۶/۲۔

(۳) مجمع الزوائد ۴/۳۳۵، باب فیمن یکثر الطلاق وسبب الطلاق۔

میں جیسا کہ مذکور ہوا شریعت ایک ناپسندیدہ ضرورت سمجھ کر اس کی اجازت دیتی ہے۔

ابتدائی تدبیریں

تاہم قرآن یہ بھی ہدایت دیتا ہے کہ طلاق پہلے ہی مرحلہ میں نہیں دینی چاہیے، بلکہ ایسی تمام صورتوں کو عمل میں لانا چاہیے جن کے ذریعہ اصلاح حال ہو سکے اور آپسی اختلاف دور ہو جائے، اگر اس طرح بناؤ ہو جائے تو طلاق نہ دے، ارشاد ہے:

"جن عورتوں سے تم کو نافرمانی کا اندیشہ ہو ان کو سمجھاؤ اور بستروں پر ان کو علیحدہ کر دو، پھر اگر وہ تمہاری فرمانبردار ہو جائیں تو ان پر سختی کیلئے بہانہ نہ ڈھونڈو" ——— (نساء: ٦)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ سب سے پہلے وعظ و نصیحت اور سمجھاؤ سے کام لیا جائے اگر یہ کافی نہ ہو تو اپنی ناراضگی کے سنجیدہ اظہار کے لئے اپنی خوابگاہ اور بستر علیحدہ کر لو یعنی وقتی طور پر اس سے مباشرت کرنا چھوڑ دو۔ پھر اگر یہ گریز بھی عورت کی اصلاح نہ کر سکے تو مناسب حدوں میں اس کی فطری کمزوری اور نزاکت کو سامنے رکھتے ہوئے تھوڑی سی مار پیٹ بھی کر سکتے ہو۔ اب اگر اس کی اصلاح ہو جائے تو ایک بہتر رفیقِ زندگی کی طرح اس کے ساتھ رہو ——— ان تمام صورتوں کو اختیار کرنے کے باوجود اصلاحِ حال نہ ہو سکے اور عورت بیجا نافرمانی و زیادتی پر آمادہ ہو تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ آپس میں اس بگاڑ کو دور کرنے سے قاصر ہیں۔ لہٰذا ان حالات میں قرآن کا حکم ہے:

"اگر ان دونوں میں اختلاف کا شدید اندیشہ ہو تو مرد اور عورت دونوں کی طرف سے ایک ایک پنچ (حکم) کو بھیجو۔ اگر یہ دونوں واقعی اصلاح چاہیں گے تو اللہ تعالیٰ ضرور ان دونوں کے درمیان موافقت پیدا کر دے گا، بے شک اللہ علیم و خبیر ہے" ——— (نساء: ۳۵)

یعنی دوسرے سمجھدار، دیندار اور ہمدرد افراد کے ذریعہ باہم مصالحت کی کوشش کی جائے گی اور اگر اس طرح آپسی خلش دور ہو جائے تو دونوں میاں بیوی کی طرح زندگی بسر کریں گے ـــــــ لیکن اگر اس ثالثی اور پنچوں کی کوششوں کے باوجود دونوں میں موافقت پیدا نہ ہو سکے، ایک دوسرے سے متنفر ہوں اور عورت کی طرف سے نامناسب حد تک مسلسل عدول حکمی اور نافرمانی ہو رہی ہو تو اب شریعت طلاق کی اجازت دیتی ہے۔

طلاق کے سدِّ باب میں خواتین کا کردار

عورتیں بھی طلاق کے واقعات کم کرنے میں بڑا اور موثر کردار ادا کر سکتی ہیں ان کو چاہیئے کہ مختلف طریقوں سے شوہر کو اپنی طرف راغب اور مائل رکھیں اور کوئی ایسی بات پیش نہ آنے نہ دیں جو باہمی نفرت اور آپسی اختلاف کا باعث بن سکتی ہے اس کے لئے سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ پوری طرح شوہر کی مزاج شناس ہوں، وہ زندگی کے ہر گوشہ میں اس بات کا اندازہ لگاتی رہیں کہ وہ کس بات اور کس عمل سے خوش ہوتا ہے اور کن باتوں سے ناخوش؟ پھر اگر کبھی ناراض ہو جائے تو اس کی کیا مرغوب چیز ہے جس کا سہارا لے کر اس کو خوش کیا جا سکتا ہے؟ کس بات اور کس ضرورت کے اظہار کے لئے مناسب وقت کیا ہے؟ جن خواتین نے اس رمز کو جان لیا اور اپنی ازدواجی زندگی میں اس کا خیال رکھا۔ ان کی زندگی ہمیشہ خوشگوار رہے گی اور انشاء اللہ طلاق کی نوبت نہ آئے گی۔

یہ تو ایک اصولی بات ہے اس کے علاوہ چند عمومی باتوں کا خاص خیال رکھنا چاہیئے:۔

اول یہ کہ مرد جب تھک کر اپنے کام سے واپس آئے، اس وقت پوری خندہ پیشانی سے اس کا استقبال کرے اور فوراً اپنی کوئی ایسی ضرورت نہ پیش کر دے

جو مرد کے لئے پریشانی کا باعث ہو۔ حدیث میں نیک بیوی کی خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ شوہر اس کی طرف دیکھے تو وہ شوہر کو خوش کر دے ——— عورت اس حدیث کا مصداق اسی وقت ہو سکتی ہے جب اس پر عمل کرے۔

دوسرے یہ کہ مرد کے لئے اپنے آپ کو سجا سنوار کر رکھے اور پوری طرح زیبائش و آرائش کرے۔ شریعت دوسروں کے لئے زیبائش و آرائش کی اجازت نہیں دیتی جبکہ شوہر کیلئے اس کو پسند کرتی ہے۔ اس کی وجہ سے شوہر عفیف و پاکدامن رہتا ہے، بدنگاہی سے بچتا ہے اور دوسری عورتوں کی طرف اس کی توجہ نہیں ہوتی۔

تیسرے اس بات کا خاص خیال رکھے کہ ایسے مردوں سے انتہائی بے توجہی برتے جن سے تعلق شوہر کو ناپسند گذرے، غیر محرم سے تو یوں بھی شریعت پردہ کا حکم دیتی ہے، لیکن خصوصاً ان لوگوں سے جائز حدوں میں بھی ربط نہیں رکھنا چاہیئے جو شوہر کو ناپسند ہوں، اس معاملہ میں مرد کی طبیعت فطری طور پر بہت حساس واقع ہوتی ہے۔

چوتھے، شوہر سے اپنی ضروریات کے مطالبہ میں ایسا رویہ نہ اختیار کرے جس سے خود غرضی کا اظہار ہوتا ہو یا ایسا محسوس ہوتا ہو کہ گویا وہ شوہر کی حریف ہے، مثلاً شوہر کے پاس کپڑے ہوں یا نہ ہوں، اپنے لئے کپڑوں کا مطالبہ یا اگر شوہر کپڑا لائے تو اس کا مقابلہ۔ بلکہ زیادہ سے زیادہ قناعت اور کفایت شعاری کی راہ اختیار کرے اور اپنے مقابلہ میں شوہر اور دوسرے اہل خانہ کی ضرورت کو مقدم رکھے، اس طرح جب وہ شوہر کے دل میں اپنا گھر بنا لے گی تو خود بخود مرد وہ کام کرے گا جو وہ چاہتی ہے، ان کے علاوہ کھانے اور پکوان میں ایسا تنوع کہ مرد کا رجحان ہوٹلوں کی طرف نہ رہے۔ نیز اس بات کا خاص خیال رکھنا ضروری ہے کہ دوسروں کے پاس شوہر کی شکایت نہ کرے بلکہ اگر کبھی رنجش اور کبیدگی پیدا ہو گئی تو اپنے ہی حد تک اس کو محدود رکھے۔

طلاق کس طرح دی جائے؟

پھر اَب بھی ایک دفعہ تین طلاقیں نہ دیدے بلکہ سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ پاکی کی حالت میں (جس میں بیوی سے مباشرت نہ کی ہو) لفظ "طلاق" کے ذریعہ صرف ایک طلاق دی جائے۔ اس طلاق کے بعد اس کو یہ حق رہے گا کہ عدت گذرنے سے پہلے پہلے تک اگر اپنے فیصلہ پر پشیمانی یا عورت کی طرف سے ندامت کا اظہار اور بہتر زندگی کا وعدہ ہو تو بیوی کو لوٹا لے اور اگر وہ علیٰحدگی کے فیصلہ پر اٹل رہے تو یوں ہی چھوڑ دے، عدت گذرنے کے بعد خود بخود یہ رشتہ ختم ہو جائے گا۔

اگر اَب بھی پشیمانی ہوئی اور زوجین کو خیال آیا کہ اس رشتہ کو باقی رہنا چاہئے تو از سرِ نَو نکاح کر سکتا ہے۔ اگر پھر طلاق کی نوبت آئی تو پھر بھی بیوی کو لوٹانے کی گنجائش باقی رہے گی لیکن اگر اس کے باوجود اصلاحِ حال نہ ہو پائے تو آخری چارۂ کار کے طور پر تیسری بار طلاق دے سکتا ہے لیکن یہ اجازت بالکل آخری درجہ میں ہے۔ ایک ہی دفعہ تین طلاقیں دیدینا سخت گناہ اور معصیت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک بار ایک ہی شخص کو بیک وقت تین طلاق دینے کی اطلاع دی گئی تو آپؐ جوش غضب میں کھڑے ہو گئے اور فرمایا کہ میں ابھی تمہارے درمیان موجود ہوں اور کتاب اللہ کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ آپؐ اس قدر خفا تھے کہ ایک صحابہ کھڑے ہوئے اور عرض کیا کہ کیا میں اس کو قتل ہی نہ کر ڈالوں؟ (۱) حضرت عمرؓ نے تو ایسے شخص کو کوڑے بھی لگائے ہیں (۲)

لیکن اگر ایک ہی مجلس میں یا عورت کے ایک ہی طہر میں تین مختلف اوقات میں تینوں طلاقیں دے ہی دی جائیں تو تینوں طلاقیں واقع ہو جائیں گی حضرت حفص بن مغیرہ

---

(۱) نسائی عن محمود بن لبید، باب الثلث المجموعۃ وما فیہ من التغلیظ ۲/۹۹۔
(۲) بیہقی

نے اپنی بیوی فاطمہ بنت قیس کو عہد رسالت ہی میں ایک ہی کلمہ میں تین طلاقیں دیدیں تو حضورؐ نے ان کی بیوی کو ان سے علیحدہ کر دیا (۱) حضرت حسنؓ نے اپنی بیوی عائشہ کو ایک ساتھ تین طلاقیں دے دیں۔ بعد کو بیوی کے ملال کا علم ہوا تو رونے لگے اور فرمایا کہ اگر میں نے اپنے نانا سے یہ بات نہ سنی ہوتی کہ جس شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیدیں وہ عورت اس کے لئے حلال نہیں ہوتی یہاں تک کہ دوسرے شخص سے شادی کرلے تو میں اس سے رجوع کرلیتا (۲)۔

جب طلاق دینا ممنوع ہے!

ایسا طہر یعنی پاکی کی حالت جس میں صحبت کرچکا ہو، طلاق دینا جائز نہیں، طلاق ایسے طہر میں دی جائے جس میں ہم بستری کی نوبت نہ آئی ہو، طلقوھن لعدتھن، (الطلاق۔) "عورت کی عدت کا لحاظ کرتے ہوئے طلاق دو"۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اس آیت کی شرح کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ طلاق ایسے طہر میں دی جائے جس میں صحبت نہ کی گئی ہو الطلاق فی طہر غیر جماع (۳)

نیز حالتِ حیض میں طلاق دینے پر بھی حضورؐ نے سخت تنبیہ فرمائی ہے، اسلئے کہ اس زمانہ میں عورتوں کے مزاج میں فطری طور پر تیزی اور چڑچڑاہٹ پیدا ہوجاتی ہے اور جسمانی ربط جو دونوں کی باہمی دلچسپی اور ایک دوسرے سے وابستگی کا بڑا ذریعہ ہے بھی وقتی طور پر معطل رہتا ہے، اس لئے یہ سوچنے کی گنجائش موجود ہے کہ شاید ایسے ہی وقتی نزاع کی وجہ سے طلاق دے دی گئی ہو۔ عین ممکن ہے کہ یہ اوقات بیت جائیں اور پھر ان کے تعلقات معمول پر آجائیں۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ عبداللہ بن عمر نے اپنی بیوی کو حیض کے زمانے میں طلاق دیدی۔ سیدنا حضرت عمرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

(۱) دارقطنی (۲) بیہقی۔

(۳) مجمع الزوائد ۴/۳۳۶ باب طلاق السنۃ بحوالہ طبرانی۔

کی خدمت میں عرض کیا، آپ سن کر برہم ہوئے اور فرمایا کہ اسے حکم دیدو کہ رجوع کرے اور جب وہ حیض سے پاک ہو جائے تب طلاق دے۔ ایک دوسری حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابن عمر کو اس فعل پر توبیخ فرمائی اور طلاق کے طریقہ کی اس طرح تعلیم دی:

"ابن عمر! تم نے غلط طریقہ اختیار کیا۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ طہر کا انتظار کرو پھر ایک ایک طہر پر ایک ایک طلاق دو۔ پھر جب وہ تیسری مرتبہ پاک ہو تو اس وقت یا طلاق دیدو یا اس کو روک لو" (۱)۔

پس اثرات اور نتائج کے لحاظ سے طلاق تین طرح کی ہوتی ہے، طلاقِ رجعی، طلاقِ بائن، طلاقِ مغلظہ۔

طلاقِ رجعی

طلاقِ رجعی وہ طلاق ہے جس میں رشتۂ نکاح عدت گذر جانے کے بعد ختم ہوتا ہے۔ عدت کے درمیان شوہر اپنی بیوی کو نئے نکاح کے بغیر لوٹا سکتا ہے اس کے لئے بیوی کی رضامندی بھی ضروری نہیں ہے، شوہر کی طرف سے یکطرفہ اقدام کافی ہے (۲) یہ اس صورت میں ہے جب کوئی شخص اپنی بیوی کو لفظ طلاق یا کسی دوسرے صریح لفظ کے ذریعہ ایک یا دو طلاق دیدے۔ ایک طلاقِ رجعی کے بعد عدت کے درمیان مزید ایک یا دو طلاق دیدے تو بھی واقع ہو جائے گی۔

رجعت کا طریقہ

طلاقِ رجعی کا مقصد ہی یہی ہے کہ اس طلاق کے بعد پھر سے

---

(۱) بخاری و مسلم عن ابن عمر باب تحریم طلاق الحائض ۱/۵۰۴۔

(۲) بدائع الصنائع ۳/۹۴-۹۳۔

غور وفکر کا موقع رہے۔ اس لیئے شوہر کو چاہیئے کہ عدت گذرنے تک بار بار اس پر غور کرے، کوشش کرے کہ بیوی کی جو کچھ کمزوریاں ہیں وہ دور ہو جائیں اور اس کی چھوٹی اور معمولی کمزوریوں سے درگذر کر جائے۔ بیوی بھی کوئی ایسی بات نہ پیش آنے دے جو کشیدگی اور اختلاف کو بڑھاوا دے اور ایک دوسرے کے درمیان نفرت کی خلیج وسیع کر دے، بلکہ بناؤ سنگار اور زیب و زینت کرے، اپنی اداؤں سے شوہر کو لبھانے اور اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کرے اور اپنی پہلی غلطیوں کا اعادہ نہ کرنے کا عزم کرلے۔

اب اگر شوہر عدت کے درمیان رجعت کرنا چاہے تو اس کی سب سے بہتر صورت یہ ہے کہ دو گواہوں کے سامنے کہدے کہ میں نے اپنی بیوی کو طلاق دی تھی مگر اب نادم ہوں اور اسے لوٹاتا ہوں۔ یہی رجعت کا بہترین طریقہ ہے۔

ویسے اگر گواہ بنائے بغیر تنہائی میں یہ جملہ کہدے یا عورت کے ساتھ کوئی ایسی حرکت کر گذرا جو بیوی ہی کے ساتھ کی جاسکتی ہے مثلاً بوسہ لے لیا، مباشرت کرلی یا اس کے جسم کے شہوت انگیز حصوں کو شہوت کے ساتھ چھوئے یا اس کی شرمگاہ کو شہوت کے ساتھ دیکھے تو بھی رجعت کیلیئے کافی ہے اور اس عمل کے بعد وہ اس کی بیوی برقرار رہے گی[1]

طلاق بائن

طلاقِ بائن یہ ہے کہ اس کی وجہ سے عورت اور مرد کے درمیان فوراً جدائی پیدا ہو جائے اور طلاق کے ساتھ ہی یکسر رشتۂ نکاح ختم ہو جائے۔ اس طلاق کے بعد عدت کے درمیان تو بیوی کو لوٹایا نہیں جاسکتا البتہ جب کبھی چاہیں آپسی رضامندی اور آمادگی سے نیا نکاح کر سکتے ہیں۔

---

(۱) ہدایہ ۲/ ۵ے۔ ۴ے۳ باب الرجعۃ۔

یہ طلاق اس وقت واقع ہوتی ہے جب الفاظِ کنایہ سے طلاق دی جائے۔ یا یوں کہا جائے میں نے تم کو طلاقِ بائن دیدی، طلاقِ رجعی بھی عدت گذرنے کے بعد طلاقِ بائن بن جاتی ہے اور عدت گذرتے ہی فوراً میاں بیوی میں مکمل علیحدگی ہوجاتی ہے۔ چوں کہ طلاق بائن واقع ہونے کے بعد نکاح بالکل ختم ہوجاتا ہے اور عورت اس کی بیوی باقی نہیں رہتی اس لئے اگر ایک دفعہ کے بعد دوبارہ طلاقِ بائن دے یا عدت میں پھر طلاقِ بائن دینا چاہے تو یہ دوسری طلاق واقع نہیں ہوگی مثلاً کہا جائے "میں نے تجھے طلاقِ بائن دی، میں نے تجھے طلاقِ بائن دی" تو ان دونوں میں سے صرف پہلی طلاق واقع ہوگی اور اگر ایک ہی لفظ میں ایک سے زیادہ طلاق دیدے جیسے "میں نے تجھ کو دو طلاقِ بائن دیدی" تو دونوں طلاق واقع ہوجائیں گی، ہاں اگر طلاقِ بائن کے بعد صریح لفظوں میں عدت ہی کے درمیان پھر طلاق دیدے (جسے طلاق رجعی کہتے ہیں) تو یہ طلاق بھی واقع ہوجائے گی (۱)

یکجائی سے پہلے طلاق

وہ عورت جس سے مرد نے ابھی مباشرت نہ کی ہو اگر اس کو صریح لفظ طلاق سے بھی ایک طلاق دیدے تو یہ طلاقِ بائن ہوگی۔ اس کے بعد نکاح کے بغیر بیوی کو لوٹانے کی گنجائش نہیں رہے گی اور اس لئے اگر الگ الگ جملوں میں اس کو دو یا تین طلاق دی جائے تو ایک ہی طلاق واقع ہوگی۔ دوسری اور تیسری طلاق واقع نہ ہوگی، مثلاً کہے "میں نے تجھے طلاق دی، میں نے تجھے طلاق دی" تو ایک ہی طلاق واقع ہوگی۔ ہاں اگر ایک ہی جملہ میں دو طلاق دیدی تو دونوں پڑجائیں گی۔ جیسے کہے میں نے تجھ کو دو طلاق دی۔

---

(۱) خلاصۃ الفتاویٰ ۲/۸۷، الصریح یلحق البائن۔

تیسری طلاق نہ پڑنے کا فائدہ یہ ہوگا کہ دونوں اگر پھر نکاح کرنا چاہیں تو حلالہ کی ضرورت نہ ہوگی اور دوسری طلاق نہ پڑنے کی وجہ سے آئندہ اگر پھر آپسی رضامندی سے نکاح ہوا تو شوہر کے لیئے مزید دو طلاقوں کی گنجائش رہے گی اور دو طلاق کے بعد بیوی پر طلاقِ مغلظہ پڑ جائے گی۔

خلوتِ صحیحہ

وہ عورت جس سے مرد نے مباشرت تو نہ کی ہو مگر اس طرح یکجا اور تنہا ہو چکے ہوں کہ جنسی عمل کیلیے کوئی شرعی یا طبعی رکاوٹ باقی نہ رہ گئی ہو تو یہ بھی مباشرت ہی کے درجہ میں ہے اور اس کا حکم انہی عورتوں کا ہے جن سے ہم بستری ممکن نہ رہے ایسی یکجائی کو فقہ کی اصطلاح میں "خلوتِ صحیحہ" کہتے ہیں۔

طلاقِ مغلظہ

طلاقِ مغلظہ سے ایسی طلاق مراد ہے جس کے نتیجہ میں مرد اس عورت سے دوبارہ نکاح نہیں کر سکتا جب تک کہ اس عورت کا نکاح کسی دوسرے مرد سے نہ ہو جائے یا وہ دوسرا شوہر مباشرت کے بعد طلاق دیدے یا مر جائے اور عورت اس کی طلاق یا موت کی عدت بھی گذار لے، اَب وہ اپنے پہلے شوہر کے لئے حلال ہو سکتی ہے اور نکاح کر کے پھر سے میاں بیوی کی طرح رہ سکتی ہے ——————— (البقرہ : ۲۰۳)

طلاقِ رجعی میں عدت گذرنے کے بعد اور طلاقِ بائن اور طلاقِ مغلظہ میں طلاق دینے کے ساتھ ہی میاں بیوی کی حیثیت ایک دوسرے کے لئے بالکل اجنبی شخص کی ہو جاتی ہے۔ ان عورتوں کو اپنے اِن سابق شوہروں سے پردہ کرنا چاہیے اور عدت گذرتے ہی شوہر کے گھر سے چلا جانا چاہیے۔

حلالہ

اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ طلاق مغلظہ کے بعد وہ عورت اپنے شوہر کے لئے اس وقت حلال ہوگی جب :

۱۔ ابھی اس وقت جو طلاق واقع ہوئی ہے اس کی عدت گذر جائے ۔

۲۔ پھر کسی اور مرد سے صحیح طور پر نکاح کرے ۔

۳۔ نکاح کے بعد وہ مرد اس سے جنسی ملاپ کرے ۔

۴۔ پھر وہ اپنے طور پر طلاق دیدے یا اس کی موت ہو جائے ۔

۵۔ اور عورت اس شوہر کی موت یا طلاق کی عدت گذار لے ۔

اسی کو "حلالہ" بھی کہتے ہیں ——— (البقرہ : ۲۳۰)

آج کل ایک غلط رسم یہ چل پڑی ہے کہ لوگ اسی نیت سے نکاح کرتے یا کراتے ہیں کہ مباشرت کے بغیر یا مباشرت کے بعد طلاق دیدیں گے اور عورت پھر اپنے سابق شوہر کیلئے حلال ہو جائے گی ——— تو اگر مباشرت کے بغیر ہی طلاق دیدی تب تو وہ اپنے سابق شوہر کیلئے حلال ہی نہیں ہوگی اس لئے کہ دوسرے شوہر کا ہم بستر ہونا ضروری ہے اور حدیث میں اس کی صراحت موجود ہے (۱) اور اگر مباشرت کے بعد طلاق دی تو وہ اپنے پہلے شوہر کے لئے حلال تو ہو جائے گی مگر جس شخص نے حلالہ کی نیت سے نکاح کیا تھا اور جس نے کرایا تھا دونوں ہی سخت گنہگار ہوں گے، حضورؐ نے فرمایا کہ ایسے لوگوں پر اللہ کی لعنت ہو (۲) ہاں اگر کسی نے ایسی نیت کیے بغیر نکاح کیا اور یوں ہی کسی وجہ سے طلاق دیدی تو کچھ مضائقہ نہیں ہے ۔

---

(۱) حدیث میں حضرت رفاعہ اور ان کی بیوی کا واقعہ صراحت کے ساتھ موجود ہے ۔
بخاری عن عائشہ باب من اجاز طلاق الثلاث ص : ۷۹۱

(۲) ابن ماجہ ۔

خلع :

جس طرح مرد کے لئے طلاق کا حق دیا گیا ہے اسی طرح عورت کے لئے خلع کی گنجائش فراہم کی گئی ہے، خلع یہ ہے کہ عورت مرد کو کچھ مال دیکر یا مرد کے ذمہ اس کا جو کچھ باقی ہے اس کو معاف کر کے بدلہ میں طلاق حاصل کرلے اور اس طلاق کے لئے خلع کا لفظ استعمال کرے، اس کی وجہ سے طلاقِ بائن واقع ہو جاتی ہے (۱)

خلع شریعت میں ایک ناپسندیدہ چیز ہے، اس لئے کہ میاں بیوی کی علیٰحدگی کی وجہ سے خاندان کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے، بال بچوں کی پرورش اس طرح نہیں ہو پاتی جس طرح ہونی چاہیئے۔ اکثر اوقات ان کو باپ کی شفقت یا ماں کی ممتا میں سے کسی ایک سے محروم ہونا پڑتا ہے اس لئے جہاں تک ممکن ہو اس سے بچنا چاہیئے اور اس بات پر نظر رکھنی چاہیئے کہ عین ممکن ہے اس ظاہری شر میں اللہ تعالیٰ نے کوئی خیر اور بھلائی رکھی ہو۔

حدیث میں ہے کہ جو عورت بلا وجہ خلع کا مطالبہ کرے اس پر خدا، فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہوتی ہے (۲) ایک اور حدیث میں ہے کہ جس عورت نے کسی خاص اور ضروری سبب کے بغیر شوہر سے طلاق کا مطالبہ کیا، اس پر جنت کی خوشبو حرام ہوگی (۳) آپ نے بلا ضرورت خلع کا مطالبہ کرنے والی عورت کو منافق قرار دیا ہے (۴) اس لئے معمولی شکایتوں، چھوٹی چھوٹی باتوں یا محض تجدید لذت اور نیا مزہ چکھنے کی خاطر شوہر سے طلاق کا مطالبہ سخت گناہ کی بات ہے۔ اسی طرح ایسی چیزوں پر خلع کا مطالبہ جو شرعاً جائز نہیں، نہایت نامناسب اور ناپسندیدہ ہے۔ مثلاً ہمارے

---

(۱) فتح القدیر ۳/۱۹۹۔

(۲) ابوداؤد،

(۳) ابوداؤد، باب الخلع

(۴) نسائی باب ماجاء فی الخلع ۲/۱۰۷۔

یہاں عام طور پر شوہر کی دوسری شادی کر لینے کی وجہ سے عورتیں طلاق کا مطالبہ کرنے لگتی ہیں حالاں کہ یہ دوسری شادی اس کی طرف سے ظلم اور ناانصافی کا باعث نہ بنے تو جائز اور درست ہے اور اس پر طلاق کا مطالبہ غلط ہے۔

ہاں اگر کسی وجہ سے اس بات کا قوی اندیشہ ہو کہ وہ دونوں ایک ساتھ زندگی بسر نہ کر سکیں گے، آپس میں سخت نفرت اور تناؤ کی فضا پیدا ہو گئی ہے اور تعلقات اس مرحلہ میں آگئے ہیں کہ ایک دوسرے کے حقوق میں کوتاہی کا اندیشہ پیدا ہو گیا ہو تو اَب شریعت اس کی اجازت دیتی ہے اور جب نوبت یہاں تک پہنچ جائے تو مرد کا بھی فریضہ ہے کہ وہ بیوی کے مطالبہ پر اسے طلاق دے دے اور اپنے لئے کسی نئی ساتھی کا انتخاب کرلے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں متعدد ایسے واقعات پیش آئے ہیں کہ شوہر کے زدوکوب کرنے یا اس کے بدصورت ہونے کی بنا پر بیوی نے خلع کی خواہش کی اور حضورؐ نے مہر میں دیا ہوا سامان بیوی سے واپس دلا کر شوہر کو حکم دیا کہ وہ طلاق دے دیں (۱) اور ہمارے ہندوستانی سماج میں تو عموماً عورتیں اسی وقت اس قسم کے مطالبات کرتی ہیں جب پانی سر سے اونچا ہو جاتا ہے اور آپسی تناؤ اور کشیدگی حد درجہ بڑھ جاتی ہے۔

خلع میں دو باتوں کا پایا جانا ضروری ہے۔ ایک تو شوہر کا طلاق پر آمادہ ہو جانا، دوسرے عورت کی طرف سے اس کا کچھ معاوضہ۔ اگر شوہر طلاق پر آمادہ نہ ہو تو عورت یکطرفہ اس طرح خلع نہیں کر سکتی جیسے مرد کو طلاق کا اختیار حاصل ہے۔ البتہ اس کے لئے یہ گنجائش رہتی ہے کہ مرد کی واقعی زیادتی اور علیحدگی کیلئے معقول وجہ ثابت کر کے قاضیٔ شرع کے یہاں سے اپنا نکاح تڑوا لے۔

---

(۱) ابوداؤد باب الخلع /۳۰۲۔

خلع میں عورت کی طرف سے دیئے جانے والے معاوضہ کی حیثیت یوں تو آپسی معاہدہ کی ہے اور وہ دونوں باہم اس کی جو کچھ قیمت طے کریں وہی معاوضہ ہوگا لیکن شریعت نے اس کے لئے کچھ مناسب حدیں مقرر کر دی ہیں جن کی تفصیل یہ ہے کہ اگر زیادتی خود مرد کی جانب سے رہی ہو تو اس کو طلاق کا کچھ معاوضہ نہیں لینا چاہیئے، اور یوں ہی طلاق دینا چاہیئے، اس لئے کہ شریعت نے شوہر کے لئے دو ہی راہ رکھی ہے۔ ایک خوش اسلوبی کے ساتھ رکھنا (امساک بالمعروف) یا بھلے طور پر شائستگی کے ساتھ چھوڑ دینا (تسریح بالاحسان) اب چوں کہ وہ پہلے طریقہ پر عمل نہیں کر پا رہا ہے تو اسے اس دوسرے راستہ کا انتخاب کر لینا چاہیئے اور اگر خود عورت ہی کی طرف سے زیادتی ہو تو زیادہ سے زیادہ اتنا معاوضہ لینا چاہیئے جو بطور مہر مرد نے اس کو دیا ہے اس سے زیادہ بہر حال نہ لے اور اگر ابھی مہر ادا ہی نہ کیا ہو تو اس کی معافی کی شرط پر طلاق دے دے۔(۱)

عدّت

شوہر سے علیحدگی یا اس کی موت کے بعد شریعت نے ایک مخصوص مدت متعین کی ہے جس میں عورت کسی دوسرے مرد سے نکاح نہیں کر سکتی، اسی مدت کا نام عدت ہے عدت کا مقصود شوہر سے جدائی پر غم و افسوس کا اظہار، اس کی موت پر سوگ اور اس بات کا اطمینان کر لینا ہے کہ اب اس عورت کے رحم میں پہلے شوہر کا مادہ بالکل نہیں ہے، اس لئے اب اگر وہ دوسری شادی کرے تو اس کا کوئی اندیشہ نہیں ہے کہ نسب میں اختلاط پیدا ہو اور اشتباہ ہو جائے کہ نہ جانے بچہ کس مرد کا ہے؟

عدت ۲ طرح کی ہوتی ہے، طلاق کی عدت اور وفات کی عدت۔

طلاق کی عدّت :

---

(۱) درمختار ۲/۵۵۸۔

یہ عدّت مختلف عورتوں کے لئے مختلف ہے :-

اگر حاملہ ہو تو عدت بچہ کی پیدائش تک ہے، بچّہ پیدا ہوتے ہی اس کی عدت مکمل ہوگئی (الطلاق : ۴) حاملہ نہ ہو مگر ماہواری کا سلسلہ جاری ہو تو جس پاکی میں طلاق دی گئی ہے اس کے بعد تین حیض تک عدت گذارے گی اور اگر مسنون اور بہتر طریقہ کے خلاف ناپاکی کی حالت میں طلاق دی ہے تو اس ناپاکی کے علاوہ مزید تین حیض عدّت گذارنی ہوگی (البقرۃ : ۲۲۸) حاملہ نہ ہو اور بچپن کی وجہ سے ابھی خون آنے کی ابتدا ہی نہ ہوئی ہو یا درازئ عمر کی وجہ سے ماہواری کا سلسلہ بند ہوگیا ہو تو اس کی عدت تین مہینے ہے (الطلاق : ۴) اگر طلاق پہلی تاریخ کو دی ہو تو قمری مہینہ کے حساب سے تین ماہ عدت گذاری جائے گی اور اگر مہینہ کے درمیان میں ایسی نوبت آئے تو نوّے دن عدت کے شمار کئے جائیں گے (۱) اس عورت کو جس کے ساتھ مرد کی یکجائی کی نوبت ہی نہ آئی ہو، طلاق کی عدت گذارنے کی ضرورت ہی نہیں ہے (۲)

طلاقِ رجعی کی عدّت میں عورت کو خوب بناؤ سنگار اور زیب و زینت کرنا چاہیئے تاکہ اس کی طرف مرد کی طبیعت کا میلان ہو، نیز چوں کہ طلاق رجعی کے بعد عدت ختم ہونے تک وہ پہلے ہی شوہر کی زوجیت میں رہتی ہے اس لئے صراحۃً یا اشارۃً کسی دوسرے مرد کے لئے درست نہیں کہ اسے نکاح کا پیغام دے (۳)

طلاق بائن اور مغلظہ کے بعد عورت فوراً زوجیت سے نکل جاتی ہے اور بیوی باقی نہیں رہتی، لہذا اس جدائی پر اظہارِ افسوس کے لئے اسے زیب زینت

---

(۱) الکواکب المشرفہ ص۲۷، فتاویٰ عالمگیری ۲/۱۳۵۔

(۲) الفتاویٰ الہندیہ ۲/۱۳۴۔

(۳) الفتاویٰ الہندیہ ۲/۱۲۷، الباب الرابع عشر۔

سے مکمل احتراز کرنا چاہیے، خوشبو نہ لگائے، شوخ کپڑے نہ پہنے، زیورات بھی استعمال نہ کرے، کریم، پاوڈر، سینٹ اور عطریات وغیرہ سے پرہیز کرے اور اسی مکان میں عدت گذارے جس میں طلاق کا واقعہ پیش آیا ہے، کہیں دوسری جگہ نہ جائے اور نہ اس کو نکاح کا پیغام دیا جائے (۱)

وفات کی عدّت

اسلام سے پہلے ایامِ جاہلیت میں عدت گذارنے کے بڑے بھیانک' انسانیت سوز اور دردناک طریقے رائج تھے، ایسی عورتوں کو پورے سال ایک تنگ و تاریک اور بدبودار کمرہ میں بند کر دیا جاتا تھا اور ان پر جانوروں کی غلاظتیں ڈالی جاتی تھیں نیز ان بدنصیب اور مصیبت زدہ بیوہ عورتوں کو منحوس اور نامبارک تصور کیا جاتا تھا، ان پر زندگی بھر کے لئے بیوگی کی حالت میں دنیا کی تمام نعمتیں حرام ہو جاتی تھیں، ہندو مذہب میں تو بیوی اپنے آپ کو شوہر کے ساتھ جلا ڈالنا مذہبی اور منصبی فریضہ ہی سمجھتی تھی، اسلام نے آکر اس غیر مہذب اور غیر انسانی وحشیانہ طریقہ کی اصلاح کی، ایک طرف انسانیت کی اس مظلوم صنف عورت پر ہونے والے مظالم کا سدباب کیا، دوسری طرف شوہر کے احسانات کی رعایت اور اس کے بلند درجہ کا احترام ملحوظ رکھا۔ عورت کو ہونے والے فطری غم واندوہ کے اظہار کی جائز صورت نکالی اور نسب کو اختلاط سے محفوظ رکھا،

شوہر کے انتقال کے بعد سوگ کے بطور جو عدت واجب ہوتی ہے وہ بالغہ اور نابالغہ دونوں پر ہے، چاہے ابھی یکجائی کی نوبت آئی ہو یا نہیں (۲)

اس عدت میں بھی بالغہ عورتوں کے لئے زیبائش وآرائش، زیور، خوشبو،

---

(۱) الفتاوی الہندیہ ۲/ ۱۲۷، ۱۲۸، الباب الرابع عشر۔

(۲) خلاصۃ الفتاوی ۲/ ۱۱۷۔

کنگھی کے ذریعہ مانگ نکالنا، بلاضرورت و بیماری سر میں تیل ڈالنا یا سرمہ لگانا، پان کھانا وغیرہ ممنوع ہے ——— (قدوری ص ۱۸۸ کتاب العدۃ)

اس عدت کی مدت ان عورتوں کے لئے جو حاملہ نہ ہوں چار مہینے دس دن ہیں (البقرۃ: ۲۳۴) اور حاملہ کی عدت یہ ہے کہ ولادت ہو جائے یعنی جب تک اتنا وقت نہ گذر جائے وہ نہ دوسرا نکاح کر سکتی ہے اور نہ گھر چھوڑ کر ادھر ادھر جا سکتی ہے (المیزان الکبریٰ ۲/۱۵۳)

چار مہینے دس دن تک سوگ کی اجازت صرف شوہر کی موت پر ہے اور کسی رشتہ دار کی موت پر تین دن سے زیادہ سوگ جائز نہیں، سر کے درد کی وجہ سے تیل اور آنکھ کی تکلیف کی وجہ سے سرمہ لگانے کی اجازت ہے البتہ اگر رات میں سرمہ لگانا کافی ہو جائے تو دن میں نہ لگائے اور سفید سرمہ سے کام چل جائے تو سیاہ سرمہ کا استعمال نہ کرے۔

موت کی عدت کے درمیان اشارۃً نکاح کا پیغام دے سکتے ہیں، اشارۃً پیغام کی صورت یہ ہے کہ کہے میں نکاح کرنا چاہتا ہوں یا یہ کہ میں ایسی عورت سے نکاح کرنا چاہتا ہوں جس میں یہ باتیں ہوں اور وہ باتیں بیان کرے جو اس عورت میں ہوں، شوہر کی موت کے وقت عورت جس مکان میں رہا کرتی تھی اسی میں عدت گذارنی چاہیے ہاں کسی مجبوری کی وجہ سے دوسرے مکان میں منتقل ہو سکتی ہے۔ مجبوری کی صورت یہ ہے کہ مثلاً شوہر کے ورثاء گھر سے نکال دیں یا کرایہ کا مکان ہو، مالکِ مکان کرایہ طلب کرے اور اتنی گنجائش نہ ہو کہ کرایہ ادا کر سکے ——— (الفتاویٰ الہندیہ ۲/۱۳۸)

موت کی عدت میں اگر باہر جانے کی ضرورت ہو اور کوئی لانے والا نہ ہو تو باہر جا سکتی ہے مگر ضرورت سے زیادہ باہر نہ ٹھہرے اور رات اپنے گھر آکر گذارے اس طرح کہ رات کا اکثر حصہ اپنے گھر پر بسر ہو۔ (الفتاویٰ الہندیہ ۲/۱۳۸)

عورت اپنے میکے یا کہیں اور چلی گئی ہو تو بلا تاخیر فوراً واپس آجانا چاہیے اور شوہر کے دیئے ہوئے مکان میں عدت گذارنی چاہیے، عدت اسی مکان میں گذارنی

ہوگی جو اسے شوہر کی طرف سے ملا تھا، طلاق یا خلع یا کسی اور وجہ سے تفریق ہوئی ہو تو بالغہ عورت کے لئے گھر سے نکلنا جائز نہیں، نابالغہ طلاق رجعی کی عدت میں شوہر کی اجازت سے اور طلاق بائن میں بلا اجازت جا سکتی ہے۔

طلاقِ بائن اور مغلظہ کی عدت میں ضروری ہے کہ مکمل پردہ ہو اور ایک دوسرے کے سامنے بالکل نہ آئے۔ عورت کا اس کے سامنے بدن چھپانا کافی نہیں، اس لئے کہ گذشتہ تعلقات کی بناء پر دونوں میں حجاب کم رہ گیا ہے اور فتنہ کا اندیشہ بڑھ گیا ہے ہاں طلاقِ رجعی میں پردہ کی ضرورت نہیں ہے —— طلاق دی ہوئی عورت کو چاہے وہ ابھی عدت ہی میں ہو شوہر سفر میں ساتھ نہیں لے جا سکتا۔

زانیہ کے احکام

عدت کا مقصد چوں کہ سابق رشتہ کا احترام اور اس تعلق کی رعایت ہے اور زنا ایک بدترین اور ناروا تعلق کی صورت ہے، اس لئے زنا کی کوئی عدت نہیں ہے یہاں تک کہ اگر وہ حاملہ ہو تو اس حالت میں بھی نکاح کر سکتی ہے۔ اب اگر اس نے اسی زانی سے نکاح کیا ہے تو وہ کسی انتظار اور مہلت کے بغیر مباشرت بھی کر سکتا ہے اور اگر اس کے ساتھ کسی اور شخص نے نکاح کیا تو نکاح درست ہوگا مگر مباشرت اس وقت تک جائز نہ ہوگی جب تک ولادت نہ ہو جائے۔[ع] (ہدایہ ۲/۳۱۲)

ع "طلاق" کے احکام راقم الحروف کی کتاب "طلاق و تفریق" کے ایک حصہ کی تلخیص ہے۔

دسواں باب

کسبِ معاش

انسان کو اس دنیا میں اللہ کی بندگی کیلئے پیدا کیا گیا ہے اور یہی اس کا اصل مقصود ہے لیکن ربِّ کائنات نے اس کو ادراک و احساس اور شعور و جذبات کی زبردست قوتوں سے بھی سرفراز فرمایا ہے اور نوع بہ نوع ضرورتیں اور تقاضے بھی اس کے جسم کے ساتھ لگا دیئے ہیں، آنکھوں کو خوش کن مناظر کی تلاش ہے شامّہ عطر بیز اور روح افزا بُو کا طالب ہے، زبان چاہتی ہے کہ اپنے نطق و گویائی کے جوہر ظاہر کرے اور اس کے لئے بہتر سے بہتر وسائل اختیار کرے، پیٹ اور بھوک کے تقاضے ان سب سے سوا ہیں کہ کیا پانی اور کیا خشکی بلکہ فضا ہر جگہ اس نے اپنی آسودگی کا سامان دریافت کیا ہوا ہے۔ ایک اہم داعیہ فطرت صنفی و نفسانی جذبات کا بھی ہے جس پر نسلِ انسانی کی افزائش اور اس کی بقا موقوف ہے اس کے علاوہ قلب و نظر اور عقل و خرد کے دسیوں تقاضے ہیں جو اس کی زندگی کے ساتھ لگے ہوئے ہیں، ان سے منہ موڑنا اور ان کے گلے گھونٹنا بظاہر اسکے لئے ممکن نہیں۔

دنیا کے بعض مذاہب نے انسان کو اسی انہونی پر مجبور کیا لیکن چونکہ یہ ایک

غیر فطری بات تھی، اس لئے مذہب کے بعض غالی اور پر جوش معتقدین نے کچھ دن تو ضرور اس بیڑی کو پہننے کی کوشش کی، لیکن جلد ہی اس بوجھ کو کاٹ پھینکا، اس کے لئے انہوں نے یہ تدبیر نکالی کہ زندگی کو دین و دنیا کے دو خانوں میں تقسیم کر دیا، عباداتی رسوم میں دین کو حکم بنایا اور زندگی کے عمومی معاملات میں مذہب کو مداخلت سے روک دیا، اس کے مقابلہ میں وہ نظام ہائے حیات ہیں جن کی تاسیس و ترکیب انسانی عقل و دانش کے ہاتھوں ہوئی۔ ان لوگوں نے انسانی عقل و جذبات کو حکم اور فیصل مانا اور کسی قید و بند کے بغیر بظاہر انسان کو آزاد اور حقیقتاً اسکی خواہشات کا غلام بنا کر رکھدیا۔

اسلام نے اپنے خاص مزاج کے مطابق دونوں کے درمیان اعتدال و توازن قائم کیا اور اس کے لئے دین و مذہب اور عبادت و بندگی کے مفہوم میں وسعت اور ہمہ گیری پیدا کر کے انسانیت کو متوازن، فطرت سے ہم آہنگ اور انقلابی تصورِ حیات عطا کیا ——— اس نے کہا کہ انسانی جسم اللہ کی امانت ہے اور اس کی فطرت خالقِ کائنات کا عطیہ ہے، اس لئے مناسب حدود میں اس کی رعایت اور حفاظت خالصتہً مذہبی عمل ہے۔ ایک مسلمان مسجد میں ہو یا گھر میں، بازاروں میں ہو یا کارخانوں میں، دفتروں میں ہو یا انصاف گاہوں میں، وہ رکوع اور سجدہ میں مشغول ہو یا سڑک پر تپتی ہوئی دھوپ میں، رکشا چلا رہا ہو، آہِ سحر گاہی سے اپنی صبحوں کو گرم رکھتا ہو یا صبح دم اللہ کا نام لے کر اس کی زمین میں ہل جوتتا ہو، تسبیح و وظائف میں مشغول ہو یا اپنے بوڑھے والدین اور کمزور بچوں کی آنتوں کو ٹھنڈی رکھنے کے لئے گرم پسینے بہا رہا ہو، اس کے ہاتھ بارگاہِ خداوندی میں عرض و نیاز کے لئے اٹھے ہوئے ہوں یا حلال روزی کے حصول کے لئے سخت کاموں کی وجہ سے کھردرے ہو گئے ہوں، بہرکیف و

۲ حلال و حرام

بہرطور اگر خدا کی مقدر کی ہوئی حلال و طیب رزق کی تلاش مقصود ہو اور خدا کے واجب کیے ہوئے حقوق کی ادائیگی پیشِ نظر ہو اور ہر موقع اور ہر گام پر خدا کے عدول حکمی سے بچتا ہو، اسی کی رزاقیت پر بھروسہ ہو تو وہ عین حالتِ عبادت میں ہے اور ایک کارِ دین میں مشغول ہے کہ جس خدا کی خوشنودی کی تلاش میں اس نے مسجد میں جبینِ بندگی زمین پر رکھدی تھی، اسی کی اطاعت اور فرماں برداری کے لئے وہ تجارت گاہوں اور زراعت گاہوں میں اپنے پسینے بھی نثار کر رہا ہے ـــــــــ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے غالباً دستِ بوسی کا ایک ہی واقعہ منقول ہے اور وہ یہ کہ آپؐ نے ایک شخص کے ہاتھ کو بوسہ دیا جس کی ہتھیلیاں محنت و مشقت کی وجہ سے سخت ہوگئی تھیں۔

اسلام میں کسبِ معاش کی اہمیّت

اسی لئے اسلام میں کسب معاش کو خاص اہمیّت دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خود یہ ارشاد فرمایا کہ دن کی یہ روشنی اسی لئے ہے کہ تلاشِ معاش میں سہولت ہو وجعلنا النهار معاشاً (نباء: ۱۱) زمین کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ وہ بھی تمہارے لئے حصولِ معاش کا ذریعہ ہے وجعلنا لکم فیها معایش (اعراف: ۱۰) طلب معاش کو جائز اور درست قرار دیا گیا۔ (بقرہ: ۱۹۸) کسب معاش کے لئے سفر کی بھی حوصلہ افزائی کی گئی (مزمل: ۲۰) بلکہ کسب معاش اور اس کے لئے تگ و دو کا حکم فرمایا گیا فانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل اللہ (جمعہ: ۱۰)

احادیث بھی کسب معاش کی فضیلت کے سلسلہ میں بھری پڑی ہیں، یہاں تک کہ آپؐ نے سچے اور امانت دار تاجر کو فرمایا کہ اس کا حشر انبیاء، صدیقین

اور شہداء کے ساتھ ہوگا (۱) آپ نے فرمایا کہ بہتر آدمی کیلئے مالِ حلال بہتر شئ ہے (۲)

یہی مزاج بعد میں سلفِ صالحین کا رہا ہے، حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ فرمایا کرتے کہ میں بیکار آدمی کو ناپسند کرتا ہوں، چاہے امورِ دنیا میں ہو یا امورِ آخرت میں (۳) زید بن مسلمہ کاشت کاری کیا کرتے تھے، حضرت عمرؓ نے ان کی تعریف کی اور فرمایا کہ اس طرح تمہارے دین کی حفاظت ہوگی اور لوگوں کے سامنے تمہاری شرافت باقی رہے گی (۴) ابراہیم نخعی سے پوچھا گیا کہ سچا تاجر زیادہ بہتر ہے یا وہ شخص جس نے خود کو عبادت کے لئے فارغ کرلیا ہو؟ فرمایا: سچا تاجر! کیوں کہ وہ ناپ تول اور لین دین میں گویا شیطان سے جہاد کرتا ہے (۵) امام احمدؒ سے ایسے شخص کے بارے میں دریافت کیا گیا جو گھر یا مسجد میں بیٹھا رہے اور کہے کہ میں کچھ نہیں کروں گا تا آنکہ میری رزق خود میرے پاس آجائے، امام احمدؒ نے فرمایا کہ ایسا شخص جاہل ہے۔ (۶)

گداگری کا سدِّ باب

اسی لئے اسلام نے قناعت اور توکّل کے جاہلانہ اور رہبانی تصوّر کو رد کردیا، ایک شخص حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ جانور باندھ لوں پھر توکل کروں یا جانور کو کھلا چھوڑ دوں پھر توکل کروں؟ ارشاد فرمایا کہ جانور کو باندھ

---

(۱) ترمذی عن ابی سعید الخدری، کتاب البیوع، باب ماجاء فی التجار الخ۔

(۲) مجمع الزوائد ۴/۶۴، باب اتخاذ المال۔

(۳) مجمع الزوائد ۴/۶۳، باب الکسب و التجارۃ۔

(۴) احیاء العلوم مع الاتحاف ۵/۲۵۷۔

(۵) حوالۂ سابق ص: ۲۵۹۔

(۶) حوالۂ سابق ص: ۲۶۰۔

لو پھر توکل کرو (۱) یعنی اسبابِ ظاہری کو اختیار کیا جائے اور اس کے نتیجہ کو اللہ پر چھوڑ دیا جائے جیسا کچھ بھی نتیجہ ظاہر ہو اس پر راضی رہا جائے، نہ یہ کہ اسباب ہی نہ اختیار کیئے جائیں حضرت عمرؓ نے خوب فرمایا ہے کہ بعض لوگ کسبِ معاش نہیں کرتے ہیں اور دُعا کرتے ہیں کہ اے اللہ روزی دے حالانکہ تم جانتے ہو کہ آسمان سونا چاندی نہیں برساتا (۲)۔

اسلام گداگری اور بھیک منگی کا سخت مخالف ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ یہ بات کہ تم میں سے ایک شخص اپنی پشت پر لکڑی کا گٹھا اٹھائے اِس بات سے بہتر ہے کہ دوسرے کے سامنے دستِ سوال دراز کرے اور چاہے تو اسے دے یا نہ دے (۳) اس لئے کہ دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ سے بہتر ہے (۴) ایک اور روایت میں ہے کہ سوال ایک زخم ہے جس سے انسان اپنے چہرے کو زخمی کرتا ہے، سوائے اس کے کہ امیر اور بیت المال سے مانگا جائے یا بحالتِ مجبوری سوال کیا جائے (۵) ایک صحابی خدمتِ اقدس میں آئے جو مانگ کر اپنی ضرورت پوری کیا کرتے تھے، ان کے پاس صرف پیالہ اور ٹاٹ تھا، آپؐ نے دونوں سامان منگایا، ڈاک لگائی اور دو درہم میں اس کو فروخت کیا۔ ایک درہم اس کی ضروریات کے لئے دیا اور ایک درہم میں کلہاڑی بنادی تاکہ لکڑی کاٹ سکے اور بیچ کر اپنی ضرورت پوری کر سکے (۶)

---

(۱) مشکوٰۃ شریف۔

(۲) احیاء العلوم مع الاتحاف ج ۶ ص ۲۵۷۔

(۳) بخاری عن ابی ہریرہؓ، باب کسب الرجل وعملہ بیدہ۔

(۴) ترمذی، کتاب الزکوٰۃ، باب ماجاء فی النہی عن المسئلۃ۔

(۵) ترمذی، باب مذکور۔

(۶) ترمذی نے مختصراً اس روایت کو نقل کیا ہے، کتاب البیوع باب ماجاء فی بیع من یزید۔

اسی لئے فقہاء اسلام نے بیت المال میں ایسے مجبور اور مفلوک لوگوں کا حق رکھا ہے تاکہ مسلمانوں کے سماج کو اس لعنت سے محفوظ رکھا جاسکے اور خود حضورؐ نے بھی ایسے سائلین اور فقراء کے لئے مستقل حق رکھا (۱) کہ ایسے ضرورتمندوں کو بار بار ہاتھ نہ پھیلانا پڑے ـــــــــــ نیز نفقہ اور کفالت کا ایک ایسا جامع قانون بنایا کہ سماج کا کوئی بوڑھا اور بچہ، عورت اور اپاہج نیز بے روزگار بالکل بے سہارا نہ ہو جائے۔

کسب معاش میں اعتدال

جہاں آپؐ نے کسب حلال کی تلقین فرمائی ہے اس کو سراہا ہے اور حوصلہ افزائی فرمائی ہے وہیں یہ بھی ہدایت دی ہے کہ اس میں اعتدال اور میانہ روی اختیار کی جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ دولت کی حرص اور طمع بعض اوقات انسان کے ذہن و دماغ پر جنون و آسیب کی طرح سوار ہو جاتی ہے اور وہ اس میں ایسا اندھا ہو جاتا ہے کہ حلال و حرام کی ساری حدود کو پھلانگ جاتا ہے، تہذیب و اخلاق کی دیواروں کو ڈھا دیتا ہے اور خدا فراموشی اور خود فراموشی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

آپؐ نے فرمایا کہ دولت مال کی کثرت کا نام نہیں بلکہ قلب کے استغناء کا نام ہے، جو کچھ مقدر میں ہے وہ مِل کر رہے گا اس لئے طلب معاش میں اعتدال سے کام لو "فاجملوا فی الطلب" (۲) غزوۂ تبوک کے موقع سے آپؐ نے خطبہ دیتے ہوئے خصوصیت سے اس کی تلقین فرمائی اور فرمایا کہ جیسے موت انسان تک پہنچ کر رہتی ہے اسی طرح رزق انسان تک پہنچ کر رہتی ہے (۳) اسی لئے قرآن مجید نے

(۱) دیکھئے ترمذی کتاب الزکوٰۃ، باب ماجاء فی حق السائل۔
(۲) مجمع الزوائد ۴/۷۱، باب الاکتساب فی طلب الرزق۔
(۳) حوالۂ مذکور۔

ایسے لوگوں کی تعریف کی ہے جن کے لئے تجارت اور کاروبارِ دنیا نماز و زکوٰۃ اور ذکرِ الٰہی کیلئے رکاوٹ نہیں بنتی تھی رجال لا تلھیھم تجارۃ ولا بیع عن ذکر اللہ واقام الصلوٰۃ وایتاء الزکوٰۃ (نور: ۲۴) اور اسی لئے حدیثوں میں بازار کو خراب جگہ قرار دیا گیا ہے ابغض البقاع الی اللہ الاسواق (۱)۔

کسبِ معاش میں اعتدال یہ ہے کہ فرائض و واجبات سے غفلت نہ ہو حرام اور ممنوع طریقوں کا ارتکاب نہ ہو، حسد اور رقابت کی آگ سے اپنے سینوں کو نہ جلائے اور دین و آخرت کی فکر کے بجائے صرف طلبِ دنیا کو اپنی تمام فکر اور عمل کا مقصود و مطلوب نہ بنالے۔ اللھم لا تجعل الدنیا اکبر ھمنا۔

بہتر ذریعہ معاش

مشہور عالم علامہ ماوردیؒ نے لکھا ہے کہ بنیادی طور پر کسبِ معاش کے تین ذرائع ہیں، زراعت[۱]، تجارت[۲] اور صنعت[۳]، ان میں سے کونسا ذریعہ معاش زیادہ بہتر ہے، علماء نے اپنے خیال کے مطابق اس کو بھی متعین کرنے کی سعی کی ہے امام شافعیؒ کا خیال ہے کہ تجارت سب سے افضل ہے۔ خود ماوردی کی رائے ہے کہ زراعت کی فضیلت زیادہ ہے (۲) امام بخاریؒ نے ایک ہی جگہ ایسی حدیثیں جمع کردی ہیں جو تجارت و زراعت اور صنعت کی اسلام میں اہمیت اور پیغمبرِ اسلام کی نگاہ میں شرف و فضیلت بتاتی ہیں (۳)۔

خیال ہوتا ہے کہ فقہاء نے مختلف ذرائع معاش کے افضل اور بہتر طریقہ

---

(۱) تخریج عراقی علی حدیث احیاء ۲/۸۶۔

(۲) عینی علی البخاری ۶/۱۸۶۔

(۳) بخاری کتاب البیوع، باب کسب الرجل وعملہ بیدہ۔

کی تعیین کے لئے ناحق مشقت اٹھائی ہے، اصل میں شریعت کی نگاہ میں اہمیت ذریعۂ معاش کے انتخاب کی نہیں بلکہ طلب معاش میں حلال وحرام کے حدود پر قائم رہنے کی ہے۔ ابن حجرؒ نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے کہ قد یختلف باختلاف الاحوال والاشخاص یعنی حالات اور اشخاص کے فرق کے ساتھ احکام میں بھی فرق ہوسکتا ہے (۱)

بعض ممالک ایسے ہیں کہ جہاں کی زمین پیداوار کیلئے کم موزوں ہے اور وہاں غذائی اشیاء کی کمی ہے تو ظاہر ہے کہ ایسی جگہ زراعت کی اہمیت زیادہ ہوگی کہ یہ انسان کی سب سے بنیادی ضرورت کو پورا کرتی ہے، بعض علاقے بازار اور کارخانوں سے دور ہوتے ہیں اگر تجارت کے ذریعہ اشیاء ضروریہ وہاں نہ پہنچ پائیں تو عوام سخت مشکلات میں پڑجائیں، فی زمانہ صنعت کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے اور انسان کی شخصی اور اجتماعی زندگی اور ملکوں کی قومی اور دفاعی ضروریات کا اس پر اس درجہ انحصار ہے کہ ماضی میں اس کا تصور بھی دشوار تھا حالات اور ضروریات کے اس فرق کے لحاظ سے ظاہر ہے کہ مختلف حالات اور مقامات میں ذریعۂ معاش کی اہمیت اور اسی نسبت سے اس کی فضیلت میں بھی فرق واقع ہوگا۔

تجارت کی اہمیت

دوسرے ذرائع معاش کی طرح تجارت کو بھی اسلام میں بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے، گذر چکا ہے کہ آپؐ نے امانتدار تاجر کو انبیاء، شہداء اور صدیقین کا ہم درجہ قرار دیا، تجارت کی فضیلت کے لئے یہی کافی ہے کہ خود

---

(۱) فتح الباری ۴/۳۰۴۔

آنحضورؐ نے تجارت فرمائی ہے، اکثر اکابر صحابہ کا ذریعہ معاش بھی یہی تجارت تھی۔ حضرت ابوبکرؓ جب تک خلیفہ نہیں ہوئے، تجارت ہی کو اپنا ذریعۂ معاش رکھا۔(۱) سورۂ جمعہ کے مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ تجارت اور اس میں ملک و بیرونِ ملک کاروبار صحابہؓ کا عام معمول تھا، ایک بار آپؐ سے دریافت کیا گیا کہ سب سے بہتر ذریعۂ معاش کیا ہے؟ ارشاد ہوا صحیح طریقہ پر تجارت اور اپنے ہاتھ کی محنت "عمل الرجل بیدہ وکل بیع مبرور (۲)"۔ اسلام سے پہلے تو لوگ تاجر کو "سمسار" یعنی دلال کہا کرتے تھے جو ایک قبیح تخاطب تھا، آپؐ نے اس کے بجائے "تجار" کے لئے بہتر نام "تاجر" کا عطا فرمایا (۳)

جہاں ایک طرف آپؐ نے تجارت کی اس درجہ فضیلت بیان فرمائی اور تاجروں کی حوصلہ افزائی کی وہیں دوسری طرف چوں کہ اس پیشہ میں جھوٹ دھوکہ دہی وغیرہ کے مواقع زیادہ ہوتے ہیں اس لئے تنبیہ بھی فرمائی اور فرمایا کہ جو تجار بے خوف جھوٹے اور بد معاملہ ہوں وہ قیامت میں فاجروں کی صورت میں اٹھائے جائیں گے (۴)

سامانِ فروخت کی خامیاں چھپائی نہ جائیں

ہر چند کہ شریعت اسلامی میں تجارت اور خرید و فروخت کے احکام بڑی تفصیل سے ذکر کئے گئے ہیں اور ان کی تفصیلات پر اصول و کلیات سے لے کر

---

(۱) بخاری کتاب البیوع باب کسب الرجل وعملہ بیدہ۔

(۲) مجمع الزوائد عن رافع بن خدیج ۶/۴۔

(۳) نسائی کتاب الایمان باب فی الحلف والکذب الخ۔

(۴) ترمذی کتاب البیوع باب ماجاء فی التجار الخ۔

عام اور چھوٹی چھوٹی جزئیات تک سب کا احاطہ کئے ہوئے ہے لیکن کچھ ہدایات ایسی ہیں جو بنیادی اور اساسی حیثیت کی حامل ہیں، پہلے ان کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔

اس میں پہلی قابلِ ذکر چیز یہ ہے کہ شریعت میں سامان کے عیوب اور خامیوں کو چھپانا بہت ہی ناپسندیدہ بات ہے۔ ایک بار آپؐ کا دانے کے ایک ڈھیر پر گذر ہوا، آپؐ نے اندر ہاتھ ڈالا، اس میں تراوٹ محسوس کی، فرمایا: یہ کیا ہے؟ تاجر نے عرض کیا کہ بارش میں بھیگ گیا ہے، ارشاد ہوا کہ پھر اس بھیگے ہوئے دانے کو اوپر کیوں نہیں رکھا کہ لوگ دیکھ سکیں، پھر فرمایا: جو دھوکا دے، ہم میں سے نہیں۔ من غش فلیس منا (۱) حضرت جریرؓ جب مسلمان ہوئے اور جانے لگے تو کپڑا پکڑ کر کھینچا اور فرمایا کہ ہر مسلمان کے لئے بھلا سوچنا! "النصح لکل مسلمٍ"

چنانچہ حضرت جریرؓ کا معمول تھا کہ جب بھی کوئی سامان فروخت کرتے تو عیب زدہ حصہ سامنے رکھ دیتے اور اختیار دیتے کہ چاہے تو لے اور چاہے تو چھوڑ دے۔ حضرت واثلہ بن اسقع کے متعلق مروی ہے کہ ایک شخص نے تین سو دینار میں اونٹنی فروخت کی پھر ابھی وہ شخص نکلا ہی تھا کہ آپؓ نے چیخ کر آواز دی اور دریافت فرمایا کہ اونٹنی کس چیز کے لئے لئے ہو؟ انہوں نے کہا کہ سواری کیلئے، حضرت واثلہؓ نے فرمایا کہ اس کے کھر میں سوراخ ہے اور وہ تیز نہیں چل سکتی، اس شخص نے اونٹنی واپس کر دی اور بیچنے والے نے سو درہم کمی کر دی، تاجر واثلہ سے کہنے لگا کہ آپ نے میرے معاملہ کو خراب کر دیا۔ حضرت واثلہ نے فرمایا کہ حضورؐ کا ارشاد ہے کہ کسی سامان کو بیچنا جائز نہیں جب تک کہ اس کی خامی کا اظہار نہ کر دیا جائے اور جو کوئی اس خامی سے واقف ہو اس پر بھی اس خامی

---

(۱) ترمذی کتاب البیوع باب فی کراہیۃ الغش فی البیوع۔

کا اظہار واجب ہے (۱) یہاں تک کہ اگر کوئی شخص عیب چھپالے اور خریدار کو اندھیرے میں رکھے، بعد کو چل کر خریدار اس سے واقف ہو تو خریدار کو اس معاملہ کے باقی رکھنے یا ختم کر دینے کا اختیار حاصل ہوتا ہے، جس کو فقہ کی اصطلاح میں "خیارِ عیب" کہا جاتا ہے۔

جھوٹ اور دھوکہ

اسی سے قریب تر دوسرا حکم یہ ہے کہ خرید و فروخت کے کسی معاملہ میں دھوکہ دہی سے کام نہ لیا جائے اور اپنا سامان فروخت کرنے کیلئے جھوٹ نہ بولے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو جھوٹ بول کر اپنا سامان فروخت کرے اللہ تعالیٰ اس کی طرف قیامت کے دن نگاہِ رحمت نہیں فرمائیں گے (۲)

خرید و فروخت کی مختلف صورتیں ہیں جن کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی وجہ سے منع فرمایا مثلاً آپ نے "تلقی جلب" سے منع فرمایا (۳) "تلقی جلب" یہ ہے کہ قافلۂ تجارت کے شہر میں داخل ہونے سے پہلے ہی اس سے سامان کم دام میں خرید کر لیا جائے اور اسے بازار کی قیمت کے بارے میں غلط باور کرایا جائے۔ ظاہر ہے یہ اصحابِ مال کے ساتھ دھوکہ ہے۔ اسی قسم کے ایک معاملہ کو آپ نے "نجش" یا "تناجش" سے تعبیر کیا (۴) یعنی خریدنے کا ارادہ تو نہ ہو، لیکن دوسرے گاہکوں کو دھوکہ دینے کی غرض سے ایک شخص خواہ مخواہ قیمت

---

(۱) احیاء العلوم ۲/۷۶، وقال العراقی اخرجہ الحاکم وقال صحیح الاسناد۔

(۲) ترمذی عن ابی ذر، کتاب البیوع باب ما جاء فی من حلف علیٰ سلعۃ کاذباً۔

(۳) مسلم عن ابی ہریرہ، کتاب البیوع، باب تحریم تلقی الجلب۔

(۴) حوالۂ سابق، باب تحریم النجش۔

بڑھا کر بولے کہ یہ خریداروں کے ساتھ دھوکہ دہی ہے (۱) جانور کے دودھ نہ دوہے جائیں کہ خریدار دھوکہ کھا جائے اس کو بھی آپؐ نے منع فرمایا کیوں کہ یہ بھی صریح دھوکہ دہی ہے (۲)

دھوکہ کی وجہ سے خرید و فروخت کی ممانعت کی بہت سی صورتیں ہیں جو حدیث و فقہ کی کتابوں میں موجود ہیں، اکثر اوقات اس سے شریعت نے صرف حکمِ اخروی یعنی آخرت کے ثواب و عذاب کو متعلق کیا ہے لیکن بعض اوقات اس سے احکام دنیا بھی متعلق ہیں مثلاً کسی شخص نے ایک سامان خرید کیا اور دوسرے کو یہ کہہ کر فروخت کیا کہ میں اپنی قیمتِ خرید ہی پر تم سے بیچ رہا ہوں لیکن قیمتِ خرید کے بتانے میں دروغ گوئی سے کام لیا اور زیادہ بتادی یا کہا کہ قیمت خرید پر اتنا نفع لیتا ہوں حالاں کہ اصلاً اس نے زیادہ پیسے لئے تھے تو ان دونوں صورتوں میں جن کو فقہار کی اصطلاح میں "تولیہ" اور "مرابحہ" کہا جاتا ہے، خریدار کو اس معاملہ کے ختم کر دینے یا اس سے زیادہ رقم کے واپس لینے کا حق حاصل ہوگا (۳)

گراں فروشی

اسلام کے قانون تجارت میں اس بات کی بھی رعایت کی گئی ہے کہ ان دروازوں کو بند کیا جائے جن سے گراں فروشی پیدا ہوتی ہے اور مصنوعی مہنگائی وجود میں آتی ہے۔ ان میں بنیادی چیز "احتکار" کی نہایت شدومد سے ممانعت ہے۔ "احتکار" سے مراد اشیار ضروریہ کی ذخیرہ اندوزی اور بازار میں اس کی

---

(۱) ہدایہ ج ۲، کتاب البیوع، فصل فیما یکرہ۔

(۲) مسلم عن ابی ہریرہ، کتاب البیوع باب تحریم التصریۃ۔

(۳) ھدایہ ۳/۵۵۔

مصنوعی قلت پیدا کرنا ہے تاکہ قیمتیں بڑھیں (۱) آپؐ نے فرمایا احتکار کرنے والا خطا کار محض ہے (۲) ایک اور روایت میں ہے کہ جس نے چالیس دنوں احتکار کیا اس سے اللہ اور اس کا رسول بری ہے (۳) ایک روایت میں آپؐ نے ذخیرہ اندوز کا مزاج یہ بتایا کہ اس کو ارزانی سے افسوس اور گرانی سے خوشی ہوتی ہے۔

بعض فقہاء کے نزدیک احتکار اور ذخیرہ اندوزی صرف غذائی اشیاء میں ممنوع ہے، امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک تمام ہی اشیاء میں ذخیرہ اندوزی کی ممانعت ہے (۴) یہی رائے مالکیہ کی بھی ہے (۵) اور واقعہ ہے کہ یہی رائے زیادہ صحیح ہے —— فقہاء نے اس بات کی بھی اجازت دی ہے کہ اگر کوئی شخص ذخیرہ اندوزی کرے اور اس سے عام لوگوں کو مشقت ہو تو حکومت جبراً ان کا مالی ذخیرہ فروخت کرا سکتی ہے (۶)۔

اسی طرح حدیث میں ایک خاص صورت "بیع حاضر للباد" کی ممانعت وارد ہوئی ہے (۷) "بیع حاضر للباد" سے مراد یہ ہے کہ اہلِ دیہات اپنا مال لیکر شہر میں آئیں اور شہر کے تجار ان کا مال لے کر خود شہر میں بیچدیں کہ یہ دیہاتی کم دام میں سامان فروخت کریں گے اور نتیجہ میں قیمت اُتر جائے گی، آپؐ نے اس کو بھی منع فرمایا کہ اس میں عام لوگوں کے لئے مضرت ہے۔

---

(۱) ترمذی کتاب البیوع باب ماجاء فی الاحتکار۔

(۲) ترمذی کتاب البیوع باب ماجاء فی الاحتکار۔

(۳) مجمع الزوائد ۴/۱۰۱، باب الاحتکار۔

(۴) رد المحتار کتاب الحظر والاباحۃ ۵/۲۵۲۔

(۵) کتاب الافصاح ۱/۳۶۶۔

(۶) ہندیہ ۳/۲۱۴۔

(۷) ترمذی کتاب البیوع باب ماجاء لا یبیع حاضر لباد۔

اسبابِ نزاع کا سدِّ باب

اسی طرح خرید و فروخت یا ایسی تمام صورتیں جو مستقبل میں جھگڑے اور نزاع کا سبب بن سکتے ہوں، شریعت نے اس کو رد کر دیا ہے، اسی وجہ سے ایسی چیز جو آدمی کے قابو میں نہ ہو، قبضہ میں نہ ہو یا معاملہ کے وقت موجود نہ ہو، کو بیچنے سے منع فرمادیا (۱) کیوں کہ یہ چیز مستقبل میں فریقین کے درمیان اختلاف اور نزاع کا باعث بن سکتی تھی، اسی طرح ضروری ہے کہ سامان اور قیمت اچھی طرح متعین ہو جائے (۲) اگر سامان ادھار ہو تب تو ضروری ہے کہ اس سامان کی جنس، اس کے اوصاف، مقام ادائیگی اور مدت وغیرہ تمام متعلقات پوری طرح متعین اور مشخص کر دیئے جائیں (۳) اسی طرح سامان فروخت سے غیر متعین اور مبہم استثنار کی اجازت نہیں دی گئی (۴) اگر مختلف قسم کے سکوں کا یکساں رواج ہے تو قیمت میں سکوں کی نوعیت کا متعین کرنا ضروری سمجھا گیا (۵) معاملہ خرید و فروخت اس وقت تک قطعی اور مکمل نہیں سمجھا جاتا جب تک کہ خریدار اس کو دیکھ نہ لے، اسی کو فقہ کی اصطلاح میں "خیارِ رویت" کہتے ہیں۔ معاملہ کے نفع و نقصان کو اچھی طرح پرکھ لینے کے لئے تین دنوں کی خصوصی مہلت دی گئی جو فریقین میں سے ہر ایک دوسرے سے حاصل کر سکتا ہے، اس کو فقہ کی اصطلاح میں "خیارِ شرط" کہتے ہیں ــــــــ یہ اور اس طرح کے بہت

---

(۱) ترمذی کتاب البیوع، باب ماجاء فی کراھیۃ بیع مالا لیس عندہٗ۔

(۲) دیکھئے مسلم ج ۲، کتاب البیوع، باب تحریم بیع صبرۃ التمر المجھولۃ القدر بتمر۔

(۳) مسلم ج ۲ ص: ۳۱، باب السلم ۔ ہدایہ ج ۲، کتاب البیوع، باب السلم۔

(۴) البحر، کتاب البیوع ۔ ھدایہ ۳/۱۱ ۔

(۵) الہندیہ ۳/۱۲۲۔

سے احکام ہیں جو ممکنہ اختلاف اور نزاع کو روکنے کے لئے پیش بندی اور ابتدائی احتیاط کا درجہ رکھتے ہیں۔

اسی طرح ایسی باتیں جو باہم منافست اور رقابت پیدا کرتی ہوں اُن کو بھی آپؐ نے منع فرمایا۔ اس سلسلہ میں حدیث میں دو باتوں کی خصوصیت کے ساتھ ممانعت آئی ہے، "سوم علیٰ سوم اخیہ" اور "بیع علیٰ بیع اخیہ" ——— "سوم علیٰ سوم اخیہ" یہ ہے کہ ایک شخص کسی قیمت پر خریدی کا معاملہ طے کررہا ہو کہ دوسرا شخص آپہنچے اور اس سے زیادہ قیمتِ خرید کی پیشکش کرے، "بیع علیٰ بیع اخیہ" یہ ہے کہ ایک شخص کوئی چیز بیچ رہا ہو کہ دوسرا شخص اس سے کم قیمت میں وہی سامان دینے کی پیش کش کرے۔ آنحضورؐ نے ان دونوں باتوں سے منع فرمایا کہ اس سے باہم منافست، جذبۂ رقابت اور تکدر پیدا ہونے کا قوی اندیشہ ہے (۱) ——— البتہ یہ ممانعت اسی وقت ہے جبکہ سامان کے خریدنے یا بیچنے کی طرف اس دوسرے شخص کا میلان ہوچکا ہو، (۲) نیز اس حکم میں مسلمان اور غیر مسلم دونوں مساوی ہیں (۳)

ہاں! اس سے ڈاک والی صورت مستثنیٰ ہے جس میں ایک شخص زیادہ سے زیادہ قیمت کے حصول کے لئے بولی لگاتا ہے، اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح خرید و فروخت ثابت ہے (۴)۔

باہمی رضامندی اور انصاف کی رعایت

---

(۱) بخاری کتاب البیوع، باب لایبیع علیٰ بیع اخیہ الخ

(۲) عمدۃ القاری ۳۶۱/۱۔

(۳) حوالۂ مذکور ص: ۲۵۸۔

(۴) دیکھئے ترمذی کتاب البیوع، باب ماجاء فی من یزید۔

تجارت کے معاملہ میں بلکہ تمام ہی معاملات اور معاہدات میں شریعت کا عمومی مزاج یہ ہے کہ فریقین کی مکمل رضامندی کے بغیر معاملہ طے نہ ہو اور اس کو ایسی آزادی حاصل ہو جو دوسروں کے لئے نقصان اور ضرر کا باعث نہ ہو، اسی لئے ایسی تمام صورتیں جس میں صاحبِ معاملہ کی رضامندی کے بغیر کوئی معاملہ اس پر تھوپا جائے، شریعت کی نگاہ میں ناپسندیدہ اور ممنوع ہے۔

اسلام سے پہلے خرید و فروخت کی متعدد صورتیں رائج تھیں، جن میں مکمل رضامندی کے بغیر آدمی پر کوئی سودا لازم ہو جاتا تھا جس کو "ملامسہ" اور "منابذہ" کہا کرتے تھے، اسلام نے ایسی تمام صورتوں کو منع کر دیا اور قیمت کے معاملہ میں بھی اسلام کا عمومی مزاج یہی ہے کہ حکومت دخل نہیں دے اور طبعی رفتار اور افتاد کے مطابق قیمتوں میں کمی وبیشی ہو۔ ایک بار بعض لوگوں نے خصوصیت سے خواہش کی کہ قیمتیں متعین کر دی جائیں، آپ نے ان کی رائے سے اتفاق نہیں کیا اور فرمایا کہ قیمتوں میں گرانی اور ارزانی کرنے والا اللہ ہے (۱)۔

لیکن بعض دفعہ لوگ اخلاقی ہدایات کا اثر قبول کرنے کو تیار نہیں ہوتے ہیں اور ان کے لئے قانون کی تلوار استعمال کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے، ایسے ہی لوگوں کی نفسیات کو سامنے رکھ کر فقہاء نے گراں فروشی کے بہت بڑھ جانے کی صورت میں تعیینِ قیمت کا حکومت کو حق دیا ہے کہ حکومت اصحابِ رائے کے مشورہ سے تاجروں کو متعینہ قیمت پر فروخت کرنے پر مجبور کر سکتی ہے (۲)۔

---

(۱) ترمذی عن انسؓ، باب ماجاء فی التعیین۔ ابن ماجہ کتاب التجارات باب من کرہ ان یتعین۔

(۲) الاشباہ والنظائر للسیوطی ص: ۱۸۷۔

غبنِ فاحش

گو شریعت نے نفع کیلئے کوئی خاص مقدار متعین نہیں کی ہے لیکن اتنا نفع لینا جو" غبنِ فاحش ،، کے درجہ میں آجائے، مکروہ ہے غبن فاحش سے مراد یہ ہے کہ مختلف واقف کار لوگ ایک سامان کی جو قیمت لگاتے ہوں، قیمت ان سب سے بڑھ جائے، اتنا کثیر نفع لینا مزاجِ شریعت کے خلاف ہے، شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے خوب لکھا ہے کہ تاجرانہ نفع کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ محتاج کی ضرورت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس سے خوب گراں بیچا جائے، دوسرے یہ کہ معمولی نفع لیا جائے اور جلد جلد اس کو استعمال میں لایا جائے، نفع کی یہ دوسری شکل تمدنی تقاضوں کے مطابق بھی ہے اور برکت کا باعث بھی (۱)

تجارت عبادت میں خلل انداز نہ ہو

تجارت کی ان صورتوں میں کہ شریعت نے ان سے منع کیا ہے، یہ بھی ہے کہ وہ خالص عبادت میں خلل کا باعث بنتی ہو، قرآن مجید نے جمعہ کے بارے میں خصوصیت سے تاکید کی کہ جب اذانِ جمعہ ہو جائے تو نماز کے لئے دوڑ پڑو اذا نودی للصلوٰۃ من یوم الجمعۃ فاسعوا الیٰ ذکر اللہ وذروا البیع (جمعہ:۶۲) جمعہ کیلئے چوں کہ زیادہ وقت مطلوب ہوتا ہے اور نماز کے علاوہ خطبہ بھی ہوتا ہے اس لئے خاص اہتمام سے توجہ دلائی گئی، ورنہ ہر نماز اور عبادت کے لئے یہی حکم ہے۔

اسی طرح مساجد خالصتہً اللہ کے ذکر، دین کی دعوت و تذکیر اور عبادت

(۱) حجۃ اللہ البالغہ ۲/۱۰۷ البیوع المنہی عنہا۔

کی جگہ ہے، یہاں خرید و فروخت میں اندیشہ ہے کہ دوسروں کی نماز اور عبادت میں خلل نہ پیدا ہو جائے اس لئے مسجدوں میں خرید و فروخت کو روکا گیا، آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ کسی کو مسجد میں فروخت کرتے یا خرید کرتے ہوئے دیکھو تو کہدو کہ خدا تمہاری تجارت کو نفع سے محروم کردے لاا ربح اللہ تجارتک (۱)۔

ایفاءِ عہد اور دوسرے فریق کی رعایت

تمام معاملات کی طرح اسلام کا تصور یہ ہے کہ خرید و فروخت اور تجارت کے معاملہ میں بھی ایثار، نرمی، دوسروں کو ترجیح، دیانت و ایمانداری، صِدق و راستی، وعدہ کی پابندی اور ایفاءِ عہد کی ڈگر پر انسان قائم رہے۔

سوید بن قیس سے مروی ہے کہ میں اور ایک صاحب کپڑا فروخت کر رہے تھے، آپؐ تشریف لائے، پاجامہ خرید کیا، میرے پاس ایک شخص تھا جو قیمت تولنے اور وزن کرنے پر مامور تھا۔ آپؐ نے قیمت ادا کرتے ہوئے فرمایا کہ جھکا کر تولو، زِن وارجح (۲) یعنی وزن میں کچھ زیادہ تو ہو کمی نہ ہو۔ ناپ تول کے پیمانے والوں سے فرمایا کہ تم لوگ دو ایسی چیز کے ذمہ دار بنائے گئے ہو جس میں اس سے پہلے کی امتیں ہلاک ہو چکی ہیں (۳) کسی کے یہاں قیمت باقی ہو اور اسے مہلت دی جائے یا معاف کر دیا جائے تو ارشادِ خداوندی ہے کہ قیامت کے دن اسے عرش باری کا سایہ حاصل ہوگا (۴) ایک اور روایت میں ہے کہ ایک شخص کے پاس

---

(۱) ترمذی، کتاب البیوع، باب النہی عن البیع فی المساجد۔

(۲) ابوداؤد، کتاب البیوع، باب الرجحان فی الوزن۔

(۳) ترمذی، کتاب البیوع، باب ماجاء فی المکیال والمیزان۔

(۴) ترمذی، کتاب البیوع، باب ماجاء فی انذار المعسر والرفق بہ۔

۲۱۳
حلال و حرام

کوئی نیکی نہیں تھی سوائے اس کے کہ وہ دولت مند تھا اور اپنے غلاموں کو حکم دیا کرتا تھا کہ تنگدست لوگوں سے دَرگذر کا معاملہ کرو، اللہ تعالیٰ نے اس کو یہ کہہ کر معاف کردیا کہ ہم معاف کرنے کے زیادہ لائق ہیں اس لئے اسے معاف کردو (۱)

وفاء عہد کی اہمیت کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کا تین دنوں تک انتظار فرمایا ہے (۲) ایسا شخص جو قیمت ادا کرنے پر قادر ہو لیکن ٹال مٹول اور وعدہ خلافی کرتا ہو، آپؐ نے اس کی مذمت فرمائی ہے اور اس کے عمل کو ظلم قرار دیا ہے (۳)

ایسی تجارت جو معصیّت میں معاون ہو؟

اسی طرح جو خرید و فروخت معصیت میں تعاون کا ذریعہ ہو، ان کے ذریعہ گناہ کے کاموں کو فروغ ہوتا ہو، یا شریعت جن چیزوں کو حرام و ممنوع اور ناقابلِ استعمال قرار دیکر ناقابلِ احترام ٹھہراتی ہو، ان کے ذریعہ ان کی تعظیم و توقیر ہوتی ہو، ایسی تمام صورتوں کو بھی شریعت نے منع کیا ہے کہ اسلام سے وفاداری اور ایمان پر استواری کا یہی تقاضا ہے۔

چنانچہ سُور کی خرید و فروخت کو منع کیا گیا ہے، خون اور مردار کی بیع کو نادرست قرار دیا گیا ہے، شراب نوشی کی اجازت نہیں دی گئی، تصاویر اور ذی روح کے مجسمے جو ہر زمانہ میں شرک کا اولین سبب بنا کئے ہیں، کی

---

(۱) مسلم، کتاب المساقات۔

(۲) ابوداؤد ۲/۶۸۲، کتاب الادب، باب فی العدۃ۔

(۳) بخاری عن ابی ہریرۃؓ، کتاب الحوالات، باب فی الحوالہ۔

خرید و فروخت کو جائز نہیں رکھا گیا، اس لئے کہ مجسموں کی خرید و فروخت شرک میں اعانت ہے، شراب فروشی سے شراب نوشی کو تقویت حاصل ہوگی، سود، خون اور مردار کی خرید و فروخت اس کی عظمت و حرمت کا اعتراف ہے جو دین و شریعت کے خلاف ہے، فتنہ کے زمانہ میں اہلِ فتنہ سے اسلحہ کی فروخت اور اغلام بازی کے عادی شخص سے غلام کی خرید و فروخت کو بھی اس قاعدہ کے تحت فقہاء نے منع کیا ہے، غور کیا جائے تو وہ معاملات جن کو فقہاء نے "بیعِ باطل" کے زمرہ میں رکھا ہے وہ اکثر اسی اصول کی بنا پر ممنوع قرار دیئے گئے ہیں۔

بعض بنیادی اصول

تجارت کا ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ جس چیز کو فروخت کیا جارہا ہو وہ موجود ہو، معدوم شئی بیچنا درست نہیں، مثلاً کوئی شخص یوں کہے: میری گائے کو جو بچہ ہوگا اسے میں نے فروخت کیا تو یہ درست نہیں ہوگا، نیز وہ شئی بیچنے والے کی ملکیت میں بھی ہو، بیچتے وقت جو چیز اس کی ملکیت اور قبضہ میں نہ ہو اس کو بیچنا درست نہیں۔ اس سے صرف دو صورتیں مستثنیٰ ہیں، سلم اور استصناع، سلم یہ ہے کہ قیمت نقد ادا کر دی جائے اور سامان جو ابھی بیچنے والے کے پاس موجود نہ ہو لیکن بازار میں دستیاب ہو، ایک مدت کے بعد حاصل کیا جائے، "استصناع" یہ ہے کہ کاریگر کو پیشگی قیمت ادا کرکے مصنوعات کا آرڈر دیا جائے، حالاں کہ مصنوعات پہلے سے موجود نہ ہوں[1]۔

خرید و فروخت کے صحیح ہونے کے لئے ایک ضروری شرط یہ بھی ہے کہ جو چیز بیچی جارہی ہے وہ مالِ متقوم ہو یعنی مال بھی ہو اور شریعت اس کو

---

(۱) ہندیہ ۳/۴۔

قابلِ قیمت بھی قرار دیتی ہو (۱) متقوم اور قابلِ قیمت ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ شرعاً اس سے فائدہ اٹھانا مباح ہو، المال المباح الانتفاع بہ شرعاً (۲) اس بنیاد پر ایسی چیزیں جو حرام ہوں اور شرعاً ان سے فائدہ اٹھانا مباح نہ ہو ان کی خرید و فروخت جائز نہیں ہوگی، حدیث میں اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں، آپؐ نے مسلمانوں کے لئے شراب کی خرید و فروخت کو منع فرمایا (۳) اسی طرح آپؐ نے شکاری کتے کے علاوہ دوسرے کتوں کی قیمت کو منع فرمایا۔ ۔ مُردار کے چمڑوں اور بتوں کے خرید و فروخت کرنے کو منع فرمایا، فتحِ مکہ کے موقعہ سے ارشاد ہوا کہ اللہ اور اس کے رسولؐ نے شراب، مُردار، سور اور بتوں کی خرید و فروخت کو حرام قرار دیا ہے (۴)

انہی روایات سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ جن اشیاء کو شریعت ناپاک اور نجس قرار دیتی ہے ان کی خرید و فروخت جائز نہ ہوگی۔ اس کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ آپؐ نے نر جانور کے مادہ کے ساتھ جفتی کی اجرت لینے کو ناجائز قرار دیا (۵) اسی لئے فقہاء انسانی فضلہ کی خرید و فروخت کو ناجائز قرار دیتے ہیں، ہاں اگر اس کے ساتھ مٹی مِل گئی اور فضلہ مغلوب ہوگیا تو اب اس کی خرید و فروخت جائز ہوگی (۶)

فروختنی سامان قابلِ انتفاع ہو:

---

(۱) کونہ مالاً موجوداً متقوماً۔ رد المحتار ۴/۵۔

(۲) رد المحتار ۴/۱۰۱۔

(۳) ترمذی کتاب البیوع باب ماجاء فی النہی للمسلم ان یدفع الی الذمی الخمر۔

(۴) ترمذی عن جابر باب ماجاء فی بیع جلود المیتۃ والاصنام۔ وبخاری کتاب البیوع باب بیع المیتۃ والاصنام

(۵) ترمذی عن ابن عمر کتاب البیوع باب ماجاء فی کراہیۃ عسب الفحل۔

(۶) درمختار علی ہامش الرد ۴/۱۰۵۔

خرید و فروخت کے جائز ہونے اور نہ ہونے کا خاص تعلق کسی چیز کے قابلِ انتفاع ہونے اور نہ ہونے سے بھی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جن چیزوں کی خرید و فروخت کی ممانعت کتاب و سنت سے صراحتاً نہ ثابت ہو اور وہ کسی دور میں اس لائق ہو جائے کہ اس سے نفع اٹھایا جا سکے تو فقہاء اس کی خرید و فروخت کو جائز قرار دیتے ہیں مثلاً عام اصول یہی ہے کہ کیڑے مکوڑے اور حشرات الارض سانپ وغیرہ کی خرید و فروخت جائز نہیں، لیکن ریشم کے کیڑے اور اس کے انڈے اور شہد مکھی کی خرید و فروخت کو جائز قرار دیا گیا ہے۔ فقیہ ابواللیث نے جونک کی خرید و فروخت کو جائز قرار دیا ہے، اس لئے کہ اس سے علاج میں فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ اور علامہ حصکفی نے نقل کیا ہے کہ اسی پر فتویٰ بھی ہے (۱) اسی طرح علامہ شامیؒ نے لکھا ہے کہ دوا میں سانپ کا استعمال کیا جا سکتا ہو تو اس کی خرید و فروخت بھی جائز ہوگی (۲) بلکہ حصکفی نے ایک اچھا قاعدہ نقل کیا ہے کہ: ان جواز البیع یدور مع حل الانتفاع (۳) خنزیر کے بال کی خرید و فروخت بھی اسی بنیاد پر فقہاء کے یہاں جائز قرار پائی ہے، پس حاصل یہ ہے کہ جن اشیاء کی خرید و فروخت کی ممانعت قرآن و حدیث میں صراحتاً مذکور نہیں اور وہ کسی زمانہ میں قابلِ انتفاع ہو جائیں تو فقہاء اس کے بارے میں نرم گوشہ اختیار کرتے ہیں اور اس کی خرید و فروخت کو جائز قرار دیتے ہیں۔

خرید و فروخت میں شرطیں؟

شریعت یہ بھی چاہتی ہے کہ خرید و فروخت کے معاملہ میں ایسی کوئی شرط نہ لگائی جائے جو معاملہ بیع کے اصل تقاضوں کے خلاف ہو مثلاً بیع کے ذریعہ خریدار سودے کا مکمل

---

(۱) درعلیٰ ہامش الرد ۴/۱۱۱۔
(۲) ردالمحتار ۴/۱۱۱۔
(۳) درمختار ۴/۱۱۱۔

مالک ہو جاتا ہے اور وہ اس میں ہر طرح کے تصرف کا مجاز ہے، اب اگر بیچنے والا ایسی کوئی شرط لگا دے جس سے خریدار کے حقِ تصرف پر تحدید عائد ہوتی ہے تو یہ نامناسب شرط سمجھی جاتی ہے اور معاملہ فاسد ہو جاتا ہے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خرید و فروخت کے ساتھ شرط لگانے سے منع فرمایا ہے، نهى النبى عليه السلام عن بيع وشرط (۱)

لیکن اگر کوئی شرط عرف و رواج کا درجہ حاصل کرلے تو پھر معاملہ کے ساتھ ایسی شرط عائد کرنے میں کوئی قباحت نہیں، عالمگیری میں ہے:

.... اولم يرد الشرع	ایسی شرط کہ شریعت اس کے جواز کے بارے میں
بجوازه ولكنه متعارف كما اذا	وارد نہ ہو لیکن وہ مروج ہو، مثلاً چمڑا یا تسمہ
اشترى نعلا وشراكاً على ان	اس شرط پر خرید کرے کہ بیچنے والا اس کا جوتا
يحذوه البائع جاز البيع استحساناً	بنادے تو استحساناً یہ جائز ہوگا اور اگر
وان اشترى صرماً على ان يخرز	
البائع له خفا او قلنسوة بشرط	بایں شرط کہ فروخت کنندہ اس کے لئے اپنے
ان يبطن له البائع من عنده فالبيع	پاس سے استر بنائے تو اس شرط کے ساتھ
بهذا الشرط جائز للتعامل (۲)	رواج و تعامل کی وجہ سے خرید و فروخت جائز ہوگی۔

فی زمانہ بہت سی چیزیں ہیں کہ ان کی خرید و فروخت کے ساتھ کمپنیاں ایک مخصوص مدت کے لئے گارنٹی قبول کرتی ہیں اور اس مدت میں اگر کوئی خرابی پیدا ہو جائے تو درستگی کی ضامن ہو جاتی ہیں یا کسی شی کی خریداری پر مزید کوئی اور شی تجار دیا کرتے ہیں ــــــــــ یہ صورتیں جائز ہوں گی کیوں کہ ان کا شمار اب معروف اور مروج شرائط میں ہے۔

---

(۱) الطبرانی فی الاوسط عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ عن النبی صلعم (تخریج ہدایہ ۳/۴۲ درایہ
(۲) ۱۳۲/۳۔

قبضہ کے بعد فروخت :

خرید و فروخت اور تجارت کے سلسلہ میں اسلام نے جو احکام دیئے ہیں ان میں ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ کسی چیز پر قبضہ کے بعد ہی اس کو فروخت کیا جائے بعض روایات میں مطلقاً قبضہ سے پہلے فروخت کو روکا گیا ہے (۱) بعض میں یہ ممانعت خاص کھانے پینے کی اشیار کی بابت منقول ہے، من ابتاع طعاماً فلا یبعہ حتی یستوفیہ (۲) اس طرح کی متعدد روایات منقول ہیں اسی بنا پر امام شافعی کے نزدیک تو کسی بھی شی پر قبضہ حاصل کرنے سے پہلے اس کو فروخت کرنا جائز نہیں (۳) امام مالکؒ کے نزدیک یہ حکم صرف غذائی اشیار کے لئے ہے دوسری اشیار اس حکم میں داخل نہیں ہیں (۴) اور احناف کے نزدیک منقولہ اشیار (جو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جائی جا سکتی ہوں) میں قبضہ ضروری ہے، غیر منقولہ اشیار کی فروخت قبضہ سے پہلے بھی جائز ہے (۵) ——— جہاں شوافع نے حدیث کے عموم پر عمل کیا ہے مالکیہ نے ان حدیثوں کو اصل قرار دیا ہے جن میں صرف غذائی اشیار پر قبضہ کا ذکر ہے، وہیں حنفیہ نے مسئلہ کی اصل روح اور شریعت کے منشار و مقصود پر نظر رکھی ہے۔

احناف کے پیشِ نظر یہ ہے کہ مقصود "غرر" یعنی امکانی دھوکہ کا سدِّ باب ہے جب تک کوئی چیز قبضہ میں نہ آجائے احتمال موجود ہے کہ شاید قبضہ ہی میں نہ آپائے، ایسی شکل میں وہ اپنے عہد کو پورا نہیں کر پائے گا، منقولہ اشیار میں تو

---

(۱) مسلم کتاب البیوع باب بطلان بیع المبیع قبل القبض۔

(۲) بخاری ۱/۲۸۶ باب بیع الطعام قبل ان یقبض الخ۔

(۳) شرح نووی علی المسلم ۲/۵۔

(۴) حوالۂ سابق۔

(۵) شرح نووی علی المسلم ۲/۵۔

اس طرح کا احتمال موجود ہے لیکن غیر منقولہ اشیاء میں اس کا کوئی احتمال نہیں کہ وہ چیز ضائع ہو جائے یا گم ہو جائے یا چرالی جائے اس لئے صرف منقولہ اشیاء ہی میں فروخت کرنے کے لئے اولاً قبضہ ضروری ہوگا (۱)

کمیشن ایجنٹ:

ہمارے زمانہ میں خرید و فروخت کی بہت سی ایسی صورتیں مروج ہیں جو ایجنٹ کے ذریعہ ہوتی ہے، کمپنی اور کارخانہ کا ایجنٹ معاملہ طے کرتا ہے اور خود اس پر کمیشن وصول کرتا ہے ——— سوال یہ ہے کہ ایجنٹ کا اس طرح کمیشن لینا درست ہوگا؟ اور شرعاً یہ اجرت جائز ہوگی یا نہیں؟

امام بخاری نے اس سلسلہ میں ایک مستقل عنوان قائم کیا ہے اور نقل کیا ہے کہ ابن سیرین، عطاء، ابراہیم نخعی اور حسن بصری جیسے بلند پایہ علماء ایجنٹ کے کمیشن کو جائز قرار دیتے تھے۔ ابن عباس سے منقول ہے کہ کوئی شخص کسی کو کپڑا دے اور کہے کہ اس کپڑے کو فروخت کر لو، اتنے روپئے سے زیادہ جو قیمت حاصل کرو گے وہ تمہاری ہوگی تو اس میں مضائقہ نہیں۔ غالباً خود امام بخاری کا رجحان اس کے جائز ہونے کی طرف ہے، اس لئے کہ آگے خود انہوں نے حضورؐ کی اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ المؤمنون عند شروطھم، ہر مسلمان کو اپنی شرطوں اور معاہدات پر قائم رہنا چاہیے یعنی ایجنٹ اور مالک کے درمیان جو باتیں طے ہوئی ہوں، فریقین کو ان (۲) پر قائم رہنا چاہیے

ائمہ اربعہ کے درمیان اس سلسلہ میں اختلاف ہے، امام مالک کے نزدیک سامان کے فروخت کرنے پر اجرت متعین کرنا جائز ہے بشرطیکہ فروخت کی کوئی مدت

---

(۱) دیکھئے فتح القدیر ۱۳۸/۶۔

(۲) دیکھئے بخاری کتاب الاجارۃ باب اجر السمسرۃ۔

بھی متعین کر دی ہو، اگر مالک سامان کہے کہ تم یہ سامان فروخت کر دو اور اس کے بدلے تم کو ایک درہم دیا جائے گا یا ہر سو دینار پر کچھ متعین کر دے تو یہ جائز ہے، یہی رائے امام احمد کی بھی ہے، ابن تین نے لکھا ہے کہ اگر مدت متعین کر دی جائے کہ اتنی مدت پر تمہیں فروخت کرنا ہے تو ایجنٹ کو دیا جانے والا نفع "اجارہ" ہے۔ اور کوئی مدت متعین نہیں کی تو فقہ کے اصطلاح کے مطابق "جعل" ہے (۱) اور ابو عبد الملک نے لکھا ہے کہ اس کی بنیاد عُرف پر ہے گو اس طرح اجرت متعین کرنے میں ایک درجہ کا ابہام پایا جاتا ہے لیکن لوگوں کے تعامل کی وجہ سے اس کو جائز قرار دیا گیا ہے لکن جوزت لما مضی من عمل الناس علیہ (۲)

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ گو امام ابو حنیفہ کے مسلک پر کمیشن ایجنٹ کے کاروبار کی بعض صورتیں ایسی ہیں جو جواز کے دائرہ سے باہر ہیں لیکن فی زمانہ اس کی کثرت اور ایک حد تک کاروباری دنیا میں اس کی ضرورت کو ملحوظ رکھتے ہوئے فقہاءِ مالکیہ کی رائے کو قبول کرنے میں کوئی قباحت نہیں۔

تالاب میں مچھلیوں کی خرید و فروخت (۳)

ہمارے زمانے میں تالاب میں مچھلی کی خرید و فروخت کا معاملہ کثرت سے رائج ہے اور بسا اوقات بعض معاملات اس میں غیر شرعی بھی ہوتے ہیں اس لئے ضرورت ہے کہ اس کے احکام اچھی طرح سمجھ لئے جائیں، کسی چیز کو فروخت کرنے کے لئے دو باتیں ضروری ہیں، اول یہ کہ جو چیز بیچی جا رہی ہے وہ بیچنے والے کی ملکیت ہو، یہ تو ظاہر ہی ہے، دوسرے یہ کہ اس کی حوالگی اور سپردگی ممکن ہو۔ اگر وہ فی الحال

---

(۱) یہ فقہ مالکی کی ایک خصوصی اصطلاح ہے۔

(۲) عمدۃ القاری ۱۲/۱۳۔

(۳) ملخص از "جدید فقہی مسائل" حصہ اوّل۔

اس کے حوالہ کرنے پر قادر نہ ہو تو بیع درست نہ ہوگی مثلاً بھاگے ہوئے جانور یا کسی گم شدہ سامان کو فروخت کیا جائے کہ گو وہ اپنے اصل مالک ہی کی ملکیت ہے لیکن بروقت اس کے حوالہ کرنے پر قادر نہیں ہے۔

مچھلی کے سلسلہ میں بھی یہی تفصیل ہے، اگر مچھلی اس شخص کی ملک میں داخل ہے اور وہ بآسانی اس کے حوالہ کرنے پر قادر بھی ہے تو اب اس کی خرید و فروخت درست ہوگی۔ اگر وہ اس کی سپردگی پر قادر نہ ہو یا ابھی اس کا مالک ہی نہ ہوا ہو تو خرید و فروخت کا معاملہ جائز نہ ہوگا۔

مچھلی کا مالک بننے کی تین صورتیں ہیں، اول یہ کہ مچھلیوں کی نشو و نما کیلئے اس کو بطورِ خاص کسی نے تالاب میں رکھا ہو، تو اب اس مچھلی اور اس کی نسل کا وہی مالک قرار پائے گا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ مچھلی تو اس نے نہ ڈالی ہو لیکن مچھلیوں کے تالاب میں لانے یا آنے والی مچھلیوں کے واپس نہ جانے کے لئے اس نے کوئی تدبیر کی ہو، اب اس تالاب یا حوض میں آنے والی مچھلیوں کا مالک وہی ہوگا۔ تیسری صورت یہ ہے کہ کوئی شخص مچھلی کا شکار کر کے اپنے برتن میں محفوظ کر لے۔ چوتھی صورت جس میں آدمی مچھلی کا مالک نہیں ہو پاتا ہے یہ ہے کہ کسی کا تالاب ہو، اس میں از خود مچھلیاں آجائیں اس کی سعی و کوشش کو اس میں کوئی دخل نہ ہو، یہاں محض یہ بات کہ تالاب اس کی زمین میں واقع ہے کو اس بات کے لئے کافی نہیں سمجھا گیا ہے کہ اس زمین کا مالک ان بچوں اور انڈوں کا بھی مالک ہو بلکہ جو بھی اس بچہ یا انڈا کو اٹھا لے وہی اس کا مالک ہے۔

اذا افرخ طير في ارض رجل فهو لمن اخذه وكذا اذا باض فيها (۱)

مچھلی کے بآسانی مقدور التسلیم یعنی حوالگی پر قادر ہونے کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ شکار کے بعد وہ کسی برتن میں محفوظ کر لے جیسا کہ عام طور پر ہوا کرتا ہے یا مچھلی

---

(۱) الہدایہ ج:۳۔

کو کسی ایسے چھوٹے گڑھے میں رکھے جس سے نکالنا آسان اور سہل ہو۔

اَب ظاہر ہے کہ جن صورتوں میں آدمی مچھلی کا مالک ہی نہ ہو اس میں تو خرید و فروخت درست ہی نہیں ہے اور جب مچھلی کا مالک ہو جائے تب بھی اسی وقت درست ہو گی جب اوپر ذکر کی گئی دونوں صورتوں میں سے کوئی صورت پائی جائے (۱)

باغات اور پھلوں کی خرید و فروخت :

خرید و فروخت کی بعض صورتیں جو مروج ہیں اور ایسی ہیں کہ شرعی اور فقہی اعتبار سے ان کا جواز مشکوک ہے یا ان کی بعض صورتیں ناجائز ہیں ایسے مسائل میں ایک باغات اور پھلوں کی خرید و فروخت بھی ہے۔

باغات کی خرید و فروخت کی ممکنہ اور مروجہ صورتیں یہ ہیں :-

(۱) پھل ابھی آئے بھی نہ ہوں اور باغ فروخت کر دیا جائے جیسا کہ بعض اوقات ایک یا کئی کئی سال کے لئے باغات فروخت کر دیئے جاتے ہیں۔

(۲) پھل نکل آئے لیکن ابھی ابتدائی حالت میں ہوں، انسانی استعمال کے لائق نہ ہوئے ہوں اور ان کو بیچ دیا جائے۔

(۳) کچھ پھل نکل آئے، کچھ ابھی نہیں نکلے بلکہ مستقبل میں ان کا نکلنا متوقع ہو اور موجودہ اور آئندہ نکلنے والے دونوں طرح کے پھل فروخت کر دیئے جائیں۔

(۴) پھل نکل آئے اور انسانی استعمال کے لائق بھی ہو گئے جس کو فقہ و حدیث میں "بدو صلاح" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

پھر آخر الذکر تینوں صورتوں (۲ - ۴) میں تین صورتیں ہو سکتی ہیں :-

---

(۱) جو تفصیلات ذکر کی گئی ہیں حافظ ابن ہمام نے ہدایہ کی شرح "فتح القدیر" میں اس کو لکھا ہے اور ابن عابدین شامی نے نقل کیا ہے۔ شامی ۴/۱۰۶۔

(الف) خریدار سے طے پاگیا کہ وہ پھل فوراً توڑ لے گا۔

(ب) طے ہوا کہ پھل پکنے تک درخت پر باقی رہے گا۔

(ج) نہ فوراً توڑنا طے پایا، نہ پھل پکنے تک درخت پر اس کا باقی رکھنا، بلکہ اس سے خاموشی اختیار کی گئی۔

اس طرح یہ چار صورتیں دراصل دس صورتوں پر مشتمل ہیں:۔

۱۔ پہلی صورت کہ پھلوں کے نکلنے سے قبل ہی اس کو بیچ دیا جائے، یہ جائز نہیں اس سے متعلق صریح وصحیح روایات موجود ہیں، حدیث میں اسی کو "بیع معادمہ" یا "بیع سنین" سے تعبیر کیا گیا ہے (۱)

۲۔ پھل نکل آیا لیکن قابلِ استعمال نہ ہو، ایسا پھل اگر اس شرط پر خرید کیا جائے کہ خریدار اسے فوراً توڑ لے گا تو یہ صورت بالاتفاق درست ہے، ابن قدامہ کہتے ہیں "القسم الثانی: ان یبیعها بشرط القطع فی الحال فیصح بالاجماع لان المنع انما کان خوفا من تلف الثمرة وحدوث العاهة علیها قبل اخذها (۲)

تاہم اگر خرید وفروخت کا معاملہ طے پا جانے کے بعد خریدار نے خواہش کی کہ ابھی تیار ہونے تک اس کو درخت پر رہنے دیا جائے اور درخت بیچنے والے نے اس کو قبول کرلیا تو اس میں بھی مضائقہ نہیں، علاء الدین سمرقندی کا بیان ہے: فان کان ذلك باذن البائع جاز وطاب له الفضل (۳)

اسی طرح پھل تیار ہونے سے پہلے ہی خرید کرلیا اور خرید وفروخت کے معاملہ کے وقت یہ طے نہ پایا کہ پھل ابھی توڑے گا یا اسے تیار ہونے تک باقی رکھے گا، امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس صورت میں بھی معاملہ درست ہو جائے گا، ائمہ

---

(۱) سننِ ترمذی ۱/۲۴۵۔ باب ماجاء فی المخابرة والمعادمة۔

(۲) المغنی ۴/۲۰۔

(۳) تحفة الفقہاء ص ۵۶۔

ثلاثہ کے نزدیک درست نہیں ہوگا، "القسم الثالث: ان یبیعہا مطلقاً ولم یشترط قطعاً ولا تبقیہ فالبیع باطل وبہ قال مالک والشافعی واجازہ ابو حنیفۃؒ۔ (۱)

احناف نے گو اس کو جائز رکھا ہے لیکن ان کے یہاں بھی واجب ہے کہ اس طرح معاملہ طے پا جانے کے بعد خریدار پھل توڑ لے، اس کو حق نہیں ہے کہ درخت پر پھل باقی رکھے وعلی المشتری قطعہا فی الحال اذا باع مطلقاً او بشرط القطع (۲)

اور اگر معاملہ اس شرط کے ساتھ طے پا جائے کہ مالک پھل درخت پر رہنے دے گا تا آنکہ پھل پک نہ جائے تو ائمۂ ثلاثہ کے ہاں تو بیع فاسد ہوگی ہی، امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک بھی درست نہ ہوگی۔ اما اذا باع بشرط الترک فہو فاسد (۳) کیوں کہ خرید و فروخت کے معاملہ میں خریدار نے ایک ایسی شرط لگا دی ہے جس میں اس کے لئے منفعت ہے اور ایسی شرط سے آپؐ نے منع فرمایا ہے۔

۳۔ کچھ پھل نکل آئے اور کچھ نہیں نکلے بلکہ مستقبل میں ان کا نکلنا متوقع ہو، اب مالکِ باغ تمام پھلوں کو فروخت کرتا ہے، ان کو بھی جو نکل آئے اور ان کو بھی جو نہیں نکلے امام مالکؒ کے نزدیک یہ صورت جائز ہے، ائمۂ ثلاثہ امام ابو حنیفہؒ، شافعیؒ اور احمدؒ کے نزدیک جائز نہیں۔ واذا باع الثمرۃ الظاہرۃ وما یظہر بعد ذلک لم یصح البیع عند ابی حنیفۃ والشافعی واحمد وقال مالک یجوز (۴)

اسی طرح اگر پھل قابلِ استعمال ہو گئے اور باغ کے باقی پھل ابھی قابلِ استعمال نہیں ہوں تو بھی امام شافعی و احمد کے برخلاف امام مالک نے اس کی اجازت دی ہے بشرطیکہ باغ کے تمام درخت ایک ہی پھل کے ہوں، احناف کے ہاں عام اصول کے مطابق نکلے ہوئے پھلوں کے ساتھ ان پھلوں کی فروخت درست نہ ہوگی جو ابھی

---

(۱) المغنی ۴/۷۲۔ (۲) عالمگیری ۳/۱۰۹۔ (۳) تحفۃ الفقہاء ۵۵۔ (۴) رحمۃ الامۃ ۱۷۷۔

نکلے ہی نہ ہوں، یہی فقہاء احناف کے یہاں ظاہر روایت ہے۔

دوسری طرف عوام میں بڑھتا ہوا تعامل، کہ کچھ پھل آتے ہی باغ فروخت کر دیا جاتا ہے اسی کو سامنے رکھتے ہوئے بعض فقہاء نے اس میں نرم روی اختیار کی ہے۔ چنانچہ ابن نجیمؒ نے نقل کیا ہے کہ امام فضلی کہتے ہیں کہ لوگوں کا انگور کی خرید و فروخت میں اسی نوعیت کا تعامل ہو گیا ہے اور اب ان کو اس سے روکنے میں حرج ہے، اس لئے استحساناً میں اس کو جائز قرار دیتا ہوں، نیز امام محمدؒ نے درخت پر لگے ہوئے گلاب کی خرید و فروخت کی اجازت دی ہے حالانکہ گلاب کے پھول یکبارگی نہیں نکلتے اور کھلتے ہیں، بلکہ یکے بعد دیگرے نکلتے ہیں۔ بعد کے فقہاء نے عام تعامل کو سامنے رکھتے ہوئے اس مسئلہ میں امام فضلی ہی کی رائے پر عمل کیا ہے پھر چوں کہ مارکٹ میں جو کچھ پھل آتا ہے وہ اسی طریق پر، اس لئے پھل کا کھانا ہی حرام ہو جائے گا پس اب اس طرح کی خرید و فروخت نے ضرورت کا درجہ اختیار کر لیا ہے لہٰذا جس طرح انسانی ضرورت کی رعایت کرتے ہوئے آپؐ نے "سلم" کی اجازت دیدی حالاں کہ وہ ایک شئی معدوم کو فروخت کرنا ہے اسی طرح پھلوں کی خرید و فروخت کی اس نوعیت کے معاملات کو بھی درست کہنا چاہیئے۔

۴۔ پھل نکل آئے اور انسانی استعمال کے قابل بھی ہو گئے، جس کو حدیث میں "بدو صلاح" سے تعبیر کیا گیا ہے، ائمہ ثلاثہ مالکؒ، شافعیؒ اور احمدؒ کے نزدیک اس صورت میں بہرحال خرید و فروخت درست ہے، چاہے غیر مشروط خرید و فروخت ہو یا فوراً توڑنے کی شرط ہو یا پھل کی تیاری تک درخت پر رکھنے کی، نیز خریدار کو غیر مشروط معاملہ یا پھل کی تیاری تک درخت پر رکھنے کی شرط کی صورت میں حق حاصل ہو گا کہ پھل کی تیاری تک پھل درخت پر رہنے دیا جائے۔ وجملة

ذلك انه اذا بدأ الصلاح فى الثمرة جاز بيعها مطلقاً وبشرط القطع وبذلك قال مالك والشافعى وقال ابوحنيفة واصحابه لايجوز بشرط التبقية (۱)

امام ابوحنیفہؒ وابویوسفؒ کے نزدیک پھل کے درخت پر ایک عرصہ لگے رہنے کی شرط لگادی جائے تو بیع درست نہ ہوگی، امام محمدؒ نے اس کی تفصیل کی ہے کہ اگر پھل تیار ہو چکے ہوں تو ایسی شرط لگانے میں مضائقہ نہیں اور یہ شرط معتبر بھی ہوگی اور اگر پھل تیار ہونے سے پہلے اس طرح کا معاملہ ہو تو درست نہ ہوگا۔ عموم بلویٰ کے تحت طحاوی نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ ابن نجیم و حصکفی وغیرہ کے بیان کے مطابق اسی پر فتویٰ بھی ہے۔

پھلوں کی فروخت میں مروّج استثناء:

ایک خاص عرف بعض علاقوں میں یہ ہے کہ خریدار پھل کی کچھ متعین مقدار مالک کو دیا کرتا ہے، جس کو بعض مقامات پر "ڈالی" یا "جنس" سے بھی تعبیر کرتے ہیں، اس صورت میں اگر باغ کے ایک درخت کی تعیین کرلی جائے کہ اس کا پھل خود مالک لے گا تب تو جائز ہونے میں کوئی کلام نہیں، اس لئے کہ فقہاء نے فروخت میں کسی متعین درخت کے استثناء کو درست قرار دیا ہے، لیکن اگر درخت کے بجائے پھل کی مقدار مستثنیٰ کی کہ اتنے پھل مالک کو دیئے جائیں گے جیسا کہ آج کل عام طور پر مروج ہے تو یہ صورت مالکیہ کے یہاں جائز ہے احناف کے یہاں جائز نہیں ولایجوز ان یبیع ثمرة ویستثنی منها ارطالا معلومة خلافا لمالك (۲) اور امام شافعی اور احمدؒ کی بھی وہی رائے ہے جو احناف کی ہے (۳) میرا خیال یہ ہے کہ

(۱) المغنی ۴/۷۵۔
(۲) ھدایہ ۳/۱۱۔
(۳) فتح القدیر ۵/۲۹۲۔

اول تو تعامل کو سامنے رکھ کر اس مسئلہ میں بھی مالکیہ کی رائے اختیار کرلی جائے تو نامناسب نہیں، دوسرے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ احناف کے یہاں متفق علیہ نہیں ہے، صاحب ہدایہ کا کہنا ہے کہ یہ حسن بن زیاد کی روایت ہے ورنہ ظاہر روایت کا تقاضا ہے کہ اس کو جائز ہونا چاہیئے اس لئے کہ جب وہ متعینہ مقدار فروخت کی جاسکتی ہے تو فروخت سے اس کا استثناء بھی کیا جاسکتا ہے: مایجوز ایراد العقد علیہ بانفرادہ یجوز استثناءہ من العقد (۱)

مولانا تھانوی نے بھی اس "جنس" یا "ڈالی" کو تعامل کی بنا پر جائز قرار دیا ہے۔ (۲)

حقوق کی خرید فروخت:

ہمارے زمانہ میں اشیاء اور املاک کی طرح حقوق بھی خریدے اور بیچے جاتے ہیں بلکہ بعض حقوق تو ایسے ہیں کہ معاشی اعتبار سے ان کی اہمیت عام اموال و جائداد کے مقابلہ کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے، سوال یہ ہے کہ ایسے حقوق کی خرید و فروخت، اس کا معاوضہ لینا اور دینا جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز ہے تو کون سے حقوق اس لائق ہیں کہ ان کی خرید و فروخت کی جاسکے؟

اس سلسلہ میں حاصل یہ ہے کہ بعض حقوق محض دفعِ ضرر کیلئے دیئے گئے ہیں، حالانکہ اصلاً انسان کو یہ حقوق حاصل نہ ہونے چاہیئے تھے مثلاً حقِ شفعہ حقِ حضانت و پرورش، شوہر پر عورت کا حقِ عدل وغیرہ۔ یہ حقوق ضرورۃً انسان کو دیئے جاتے ہیں اس لئے اگر کوئی شخص ان حقوق سے دستبردار ہوجاتا ہے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ ان حقوق کا ضرورتمند نہیں ہے لہذا اب وہ ان حقوق کے باب میں حقدار ہی باقی نہ رہا، ایسے حقوق کی نہ خرید و فروخت درست

---

(۱) ہدایہ ۳/۱۱۔
(۲) امداد الفتاویٰ۔

ہے نہ کسی اور طور اس کا عوض وصول کرنا جائز ہے۔ شامی نے موصیٰ لہٗ کے حقِ خدمت اور شفیع کے حقِ شفعہ کے درمیان فرق کرتے ہوئے اس نکتہ پر روشنی ڈالی ہے:

وحاصله ان ثبوت حق الشفعة للشفيع وحق القسم للزوجة وكذلك حق الخيار في النكاح للمخيرة انما هو لدفع الضرر عن الشفيع والمرأة وماثبت لذلك لا يصح الصلح عنه .... اما حق الموصى له بالخدمة فليس كذالك بل ثبت له على وجه البر والصلة فيكون ثابتاً له أصالةً فيصح الصلح عنه اذا نزل عنه لغيره (۱)

دوسری قسم کے حقوق وہ ہیں جو حکمِ شرعی یا ایسے عرف کی بنا پر (جو شریعت کے عمومی مصالح سے مطابقت رکھتے ہوں) اصالۃً کسی شخص کے لئے ثابت ہوں یہ بھی دو طرح کے ہیں، بعضے وہ ہیں جو ایک شخص سے دوسرے شخص کی طرف منتقل کئے جاسکتے ہیں، دوسرے وہ جن کا ایک شخص سے دوسرے شخص کی طرف انتقال نہیں ہوسکتا، ان کی خرید و فروخت بھی نہیں ہوسکتی کہ خرید فروخت کے لئے انتقالِ مِلک ضروری ہے اور یہ حقوق قابلِ انتقال نہیں ہیں۔ ہاں بطریق صلح و تنازل (دست برداری) اس کا عوض وصول کیا جاسکتا ہے، ان حقوق کی فروخت کے جائز نہ ہونے کی دلیل وہ حدیث ہے جس میں آپؐ نے حق ولاء کے خرید فروخت اور اس کے ہبہ سے منع فرمایا ہے (۲) اور دست برداری اختیار کرکے عوض وصول کرنے کی دلیل قصاص و خلع ہے جس میں مقتول کا وارث حق قصاص اور شوہر بیوی پر "ملکیتِ نکاح" سے باہم طے شدہ معاوضہ کے بدلہ دست کش ہوسکتا ہے۔ اور یہ شریعت کے مسلّمات اور فقہاء کے متفقات میں سے ہے۔

---

(۱) ردالمحتار ۴/۱۶۔
(۲) بخاری، باب بیع الولاء وہبتہ۔

رہ گئے وہ حقوق جن کی منتقلی ممکن ہے "مال" کے حکم میں ہیں اور ان کی خرید فروخت درست ہے۔

اس تفصیل کے مطابق حقوق و منافع کی فروخت کی جو صورتیں فی زمانہ رائج ہوگئی ہیں وہ یہ ہیں: خلو یعنی حقِ اجارہ کی فروخت جس کو "پگڑی" سے تعبیر کیا جاتا ہے، حقِ ایجاد، حق تالیف، رجسٹرڈ ٹریڈ مارک اور ناموں کی فروخت نیز فضا کی فروخت، اور یہ سبھی جائز ہیں (۱)

سود:

معیشت کے باب میں شریعتِ اسلامی نے جس چیز کو سب سے زیادہ ناپسند کیا ہے اور اس پر نفریں بھی بھیجی ہے وہ سود ہے۔ قرآن مجید نے کھلے لفظوں میں سود خوری کی ممانعت فرمائی یا ایھا الذین اٰمنوا لا تأکلوا الربوٰ (آل عمران ۱۳۰) قرآن میں ایک موقعہ پر سود خواروں کا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ وہ قیامت کے دن اس کیف و حال کے ساتھ قبر سے اٹھیں گے کہ گویا آسیب نے ان کو ہوش و حواس سے محروم کر دیا ہو۔ (بقرہ: ۲۷۵) اور کیوں نہ ہو کہ سود خواری ہے ہی ایسی لعنت جس کو حرص ہوس، دنیا طلبی اور بیش از بیش حصولِ دنیا کا جنون بے قابو کر کے رکھ دیتا ہے اور غریبوں اور کمزوروں کے پسینہ اور خون سے اس کو قند و نبات کی لذت کا احساس ہونے لگتا ہے اس لئے قیامت میں ہوش و حواس سے اس کی یہ محرومی اس کے جرم کے عین مطابقِ حال سزا ہے، ولا یظلم ربك احداً۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے سخت غیظ و غضب اور تنبیہ و توبیخ کے لہجہ میں سود کی ممانعت فرمائی ہے۔ ارشاد ہوا کہ سود کے بہتر (۷۲) درجہ گناہ ہیں

---

(۱) تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو "جدید فقہی مسائل حصہ دوم" مقالہ: حقوق کی خرید و فروخت، طبع دوم۔

اور اس میں کمتر گناہ یہ ہے کہ آدمی اپنی ماں سے زنا کرے (۱)۔ ایک روایت میں ہے کہ سود کا ایک درہم حالتِ اسلام میں تینتیس بار زنا سے بڑھ کر ہے (۲) ایک روایت میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب کسی آبادی میں سود اور زنا کی کثرت ہو جاتی ہے تو پھر ان پر عذابِ الٰہی کا ظہور ہوتا ہے (۳) ایک موقعہ سے ارشاد فرمایا کہ جب کسی قوم میں سود عام ہو جاتا ہے تو اس پر قحط مسلط کیا جاتا ہے (۴) یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ نے نہ صرف سود کے کھانے کو منع فرمایا بلکہ سود کے معاملہ میں کسی طرح کے تعاون کو بھی ممنوع قرار دیا، خود زبانِ رحمت مآب کے ذریعہ سود لینے والے، دینے والے گواہ بننے والے اور سودی کاروبار لکھنے والے سبھوں پر لعنت کی گئی ہے (۵)۔

بنک انٹرسٹ:

سود ایسے اضافہ کو کہتے ہیں جس کے مقابلہ میں معاملہ کے دوسرے فریق کی طرف سے کوئی عوض نہ ہو (۶) یہی تعریف تقریباً دوسرے اہلِ علم نے بھی کی ہے۔ سود کی اس تعریف سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سود چاہے کسی وقتی ضرورت کے تحت قرض پر لیا جائے یا تجارتی قرض پر، وہ بہر صورت حرام ہے کیوں کہ حدیث اور فقہاء کی تصریحات سے سود کی جو حقیقت سامنے آتی ہے اس میں دونوں ہی طرح کے سود شامل ہیں۔

---

(۱) مجمع الزوائد ۴/۱۱۷۔

(۲) مجمع الزوائد ۴/۱۱۷، بحوالہ طبرانی عن عبد اللہ بن سلام۔

(۳) مجمع الزوائد ۴/۱۱۸، بحوالہ طبرانی عن ابن عباس۔

(۴) حوالۂ سابق بحوالہ مسند احمد عن عمرو بن العاص۔

(۵) ابو داؤد عن عبد اللہ بن مسعود ۲/۴۷۳ باب فی آکل الربٰو وموکلہ۔

(۶) عنایہ علی ہامش الفتح ۶/۱۴۷۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ بینک وغیرہ جو لوگوں کی رقوم کو تجارتی اغراض کے لئے استعمال کرتا ہے اس کی طرف سے ملنے والا نفع "سود" میں داخل نہیں ہے کیوں کہ اس سے غریبوں ... کا استحصال نہیں ہوتا لیکن یہ خیال صحیح نہیں کیونکہ:

۱۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی تفریق کے بغیر ہر طرح کے قرض پر نفع کے حصول کو ناجائز قرار دیا ہے، ارشاد ہوا کل قرض جر نفعاً فهو ربا۔

۲۔ یہ رائے اس اصول پر مبنی ہے کہ قرآن کے زمانۂ نزول میں سود خوری کی جو کیفیت پائی جاتی تھی، آیتِ ربا میں صرف اسی صورت کی ممانعت تسلیم کی جائے گی، لیکن یہ فقہاء کے اس اصول مقررہ کے خلاف ہے کہ نصوص میں ہمیشہ الفاظ کے عموم کا اعتبار ہوتا ہے نہ کہ اس کے موقعۂ ورود کا، العبرة لعموم اللفظ لا لخصوص المورد۔

۳۔ خود زمانۂ نبوت میں بھی تجارتی قرضوں اور سودی قرضوں کا رواج تھا لیکن ربا کی حرمت سے متعلق آیات و روایات میں تجارتی و غیر تجارتی قرضوں میں کسی طرح کی تفریق نہ کی جانی اس بات کی علامت ہے کہ ممانعت کا یہ حکم تجارتی قرضوں کو بھی شامل ہے (۱)

۴۔ یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے کہ تجارتی قرضوں میں استحصال نہیں ہوتا کیونکہ تاجر کو اس سرمایہ کے استعمال میں نقصان بھی ہو سکتا ہے، کبھی نہ نفع اور نہ نقصان کی صورت بھی پیش آسکتی ہے اور عین ممکن ہے کہ نفع کے مقرر کردہ تناسب کے برابر بھی نفع حاصل نہ ہو سکے۔

بنک انٹرسٹ کا مصرف:

---

(۱) ملاحظہ ہو: مولانا تقی عثمانی کی تکملہ فتح الملہم ۱/۵۷۱ تا ۵۷۴۔

اس تفصیل کی روشنی میں بنک سے حاصل ہونے والا نفع ربا ہے جس کو بنک میں چھوڑنے سے ایک سودی کاروبار کا تعاون ہوتا ہے اور کبھی ایسی رقوم کا استعمال اسلام کے خلاف بھی ہوتا ہے۔ اس لئے اس رقم کا نکال لینا اور نکال کر فقراء و مساکین پر یا رفاہی امور میں خرچ کر دینا واجب ہے۔ البتہ مساجد کی تعمیر میں اس کا استعمال اس کی عظمت و حرمت کے خلاف ہے اسلئے اس سے منع کیا جائیگا۔(۱)

سُودی قرض لینا کب جائز ہے؟

سودی قرض لینا کب جائز ہے؟ ابن نجیم نے اس بارے میں لکھا ہے کہ حاجتمندوں کیلئے سودی قرض لینے کی گنجائش ہے (۲) لیکن یہ مسئلہ کہ کس حاجت کو شرعی حاجت شمار کیا جائے گا؟ فقہاء کی صراحتوں سے اصولی طور پر اس سلسلہ میں یہ بات منقح ہوتی ہے کہ:

۱۔ عام حالات میں محض معیار زندگی کی بلندی خوب سے خوب تر کی تلاش کے پیش نظر سودی قرض لینا جائز نہیں۔

۲۔ ضرورت یعنی ایسے حالات میں جب کہ کھانے کپڑے، علاج وغیرہ کی بنیادی ضرورت کی فراہمی کے لئے سودی قرض کے سوا کوئی چارہ نہ رہے اور فاقہ مستی کی نوبت ہو تو سودی قرض لینا جائز ہے۔

۳۔ حاجت کے تحت بھی یعنی جب سودی قرض نہ لینے کی شکل میں شدید مشقت یا ضرر کا اندیشہ ہو تو بھی سودی قرض لینے کی گنجائش ہے، جیسے غیر شادی شدہ لڑکیوں کی شادی کے لئے اس پر مجبور ہو۔

---

(۱) تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو: جدید فقہی مسائل دوم ۲۷ — ۲۶۹۔

(۲) الاشباہ والنظائر مع الغمز ۱/۲۹۴۔

مشقت کی ایسی صورتوں میں جو اجتماعی بن گئی ہوں، حکم نسبتاً زیادہ خفیف ہے،
اشخاص و افراد کے لئے سودی قرض کب حاجت بن جاتا ہے اور کب نہیں؟
اس کا اندازہ ان کے شخصی حالات، ان کے علاقے اور خاندان کے معیارِ زندگی سے
کیا جائے گا (۱)

رہن کے مال سے فائدہ اٹھانا

اسلام نے سود کا دروازہ بند کرنے کے لئے قرض کا دروازہ کھولا ہے
بلکہ قرض کے ذریعہ غریبوں اور کمزوروں کی مدد کی حوصلہ افزائی کی ہے اور زکوٰۃ
کی ایک مستقل مد مقروضوں کی اعانت کو قرار دیا ہے (والغارمین) قرض پر بطور
وثیقہ اور ثبوت کے رہن رکھنے کی بھی اجازت دی گئی ہے اور یہ بھی قرآن ہی نے
بتا دیا ہے کہ مال مرہون پر قبضہ ہی برقرار رکھنے کا حق ہوگا، نفع اٹھانے کا حق نہیں
ہوگا۔ فان لم تجدوا کاتباً فرھٰن مقبوضۃ (البقرۃ — ۲۸۳) خود رسول اکرمؐ
نے اپنی زرہ مبارک ایک یہودی کے پاس رہن رکھ کر کچھ کھانے کی اشیاء خرید
فرمائی ہے (۲) لیکن چوں کہ اسلام میں قرض پر کسی بھی طرح کا نفع اٹھانا حرام ہے،
اور پیغمبر اسلام نے اس کو سود قرار دیا ہے "کل قرضٍ جر نفعا فھو ربواً"، اور
سود کے بارے میں حقیقتِ سود تو کجا شبہ سود بھی ناقابلِ برداشت ہے
اس لئے رہن کے سامان سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہوگا۔

اس میں شبہ نہیں کہ بعض فقہاء احناف نے مالک کی اجازت سے

---

(۱) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو راقم الحروف کا مقالہ "بینک انٹرسٹ، سودی قرض اور ہندستان کی شرعی حیثیت۔ جدید فقہی مسائل حصہ دوم ۷۶ — ۲۷۳۔

(۲) بخاری عن عائشہؓ کتاب الرہن، باب من رہن درعہ۔

رہن سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دی ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے کیوں کہ سود کا حاصل کرنا اور اس سے فائدہ اٹھانا بہرحال ناجائز ہے گو رضامندی اور خوشی سے حاصل کیا جائے۔ خاتم الفقہاء علامہ شامیؒ نے اس پہلو پر توجہ کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ فقیہ عبداللہ سمرقندی مالک کی اجازت سے بھی سامانِ رہن سے فائدہ اٹھانے کو ناجائز قرار دیتے تھے، پھر بعض علماء نے نقل کیا ہے کہ اگر قرض دیتے وقت سامانِ رہن سے فائدہ کی شرط لگا دی ہو تب تو ناجائز ہوگا اور سود ہوگا ورنہ نہیں، علامہ شامی نے اس "اگر مگر" پر خود تبصرہ کیا ہے اور لکھا ہے:

والغالب من احوال الناس انھم انما یریدون عند الدفع الانتفاع ولولاہ لما اعطاہ الدراھم وھذا بمنزلۃ الشرط لان المعروف کالمشروط وھو مما یعین المنع (۱)۔	لوگوں کے عمومی حالات یہ ہیں کہ لوگوں کا مقصود دے کر نفع حاصل کرنا ہوتا ہے، ایسا نہ ہو تو وہ طالبِ قرض کو درہم نہ دیں اور یہ شرط کے درجہ میں ہے اس لئے کہ رواج شرط کے درجہ میں ہے اور یہ بات اس صورت کے ممنوع ہونے کو متعین کر دیتا ہے۔

پس قولِ فیصل، رائے صحیح، مذہبِ محتاط اور اسلام کے اصولِ عامہ سے ہم آہنگ یہی بات ہے کہ سامانِ رہن سے کسی طرح کا فائدہ اٹھانا قرض دہندہ کے لئے جائز نہیں، نہ مقروض کی اجازت سے اور نہ اس کی اجازت کے بغیر۔ فی زمانہ رہن کی زمین کی کاشت و پیداوار اور مکان کی رہائش وغیرہ سے انتفاع کا جو رواج ہو گیا ہے وہ قطعاً ناجائز خلافِ شریعت اور سود میں داخل ہے۔

فروخت بہ شرط واپسی:

آج کل شہروں میں بعض لوگ ایسا کرتے ہیں کہ جتنا روپیہ قرض لینا یا دینا

(۱) شامی ۵/۱۱ — ۳۱۰۔

ہوتا ہے، مقروض اپنا مکان قرض دینے والے کے ہاتھ اس شرط کے ساتھ فروخت کر دیتا ہے کہ وہ جب قرض ادا کرے گا تو اپنا مکان واپس لے لیگا اور پھر وہ بدستور اس کی ملک میں آجائے گا۔

فقہاء کے یہاں اس کو بیع بالوفاء، رہن معاد، بیع امانت اور بیع اطاعت سے تعبیر کیا جاتا ہے، شریعت کے اصول کے مطابق اگر کوئی ایسی شرط لگادی جائے جو تقاضائے خرید و فروخت کے خلاف ہو تو خرید و فروخت درست نہیں ہوتی، یہاں چوں کہ اس معاملہ کے ساتھ یہ شرط بھی لگادی گئی ہے کہ ایک مدت کے بعد وہ شئی واپس کر دینی ہوگی اور یہ بیع کے اصول اور تقاضوں کے خلاف ہے، اس لئے معاملہ درست نہیں ہونا چاہیے۔ البتہ عملاً اس کی صورت بالکل رہن کی سی ہے اور فقہاء نے بھی ایک طرف اس کے غیر معمولی تعامل اور دوسری طرف فقہی قباحت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس کو رہن کی حیثیت سے جائز رکھا ہے۔ اب اس معاملہ کو رہن قرار دینے کا صاف مطلب یہ ہوگا کہ اس خریدار کو جس کی حیثیت دراصل رہن رکھے گئے مال کے امین کی ہے اور جسے فقہ کی اصطلاح میں "مرتہن" سے تعبیر کیا جاتا ہے اس سے استفادہ کا کچھ حق نہیں ہوگا۔

البیع الذی تعارفه اهل زمننا احتیالاً للربا وسموه بیع الوفاء وهو رهن فی الحقیقة لایملکه ولاینتفع به الا باذن مالکه وهو ضامن لما اکل من ثمرة واتلف من شجرة۔ (۱)

وہ بیع جس کا آج کل ہمارے زمانہ میں سود سے بچنے کیلئے حیلہ کیا جارہا ہے اور لوگ اس کو بیعِ وفاء کا نام دیتے ہیں، درحقیقت "رہن" ہے، نہ وہ اس کا مالک ہے اور نہ ہی مالک کی اجازت کے بغیر اس سے نفع اٹھا سکتا ہے، درخت کا جو پھل وہ کھائے یا درخت کو جو نقصان پہنچائے وہ اس کا ضامن ہوگا۔

---

(۱) ردالمحتار ۵/۲۴۶۔

رشوت:

شریعت میں کمائی کے جن طریقوں کی سخت مذمت کی گئی ہے ان میں ایک رشوت بھی ہے۔ رشوت کا لینا اور دینا دونوں حرام ہے، ایک حدیث میں تو آپ ﷺ نے ان دونوں پر اپنی زبانِ مبارک سے لعنت بھیجی ہے (۱)

رشوت ظلم نہ کرنے کیلئے حاصل کی جانے والی رقم بھی ہے اور جائز حق دینے پر لی جانے والی رقم بھی (۲) لینا تو بہر طور حرام ہے البتہ اپنی جان و مال، عزت و آبرو کے تحفظ اور انصاف اور جائز حق کے حصول کے لئے رشوت دینے کی گنجائش ہے (۳)

اسی طرح کسی دشمنِ اسلام کے شر سے حفاظت کے لئے اس کو رشوت دی جائے یہ بھی جائز ہے جیسا کہ خود حضور ﷺ مفسد شعراء کی زبان بندی کے لئے دیا کرتے تھے (۴)

یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ اس قسم کی ناجائز رقوم ہدیہ یا انعام کے نام پر دی جائیں تب بھی وہ رشوت ہی ہیں، اسی لئے فقہاء نے لکھا ہے کہ قاضی کے لئے قریبی رشتہ داروں اور وہ لوگ جو پہلے سے تحفہ دینے کے عادی رہے ہوں، انہیں کے تحفے قبول کرنے جائز ہیں، جو لوگ پہلے سے تحفہ دینے کے عادی نہ ہوں یا دیتے رہے ہوں لیکن اس مقدار میں نہ دیا کرتے ہوں یا قاضی کے اجلاس میں ان کا مقدمہ ہو تو ان کا تحفہ یا دعوت قبول کرنا جائز نہیں (۵) علامہ شامیؒ نے لکھا ہے کہ یہی حکم گاؤں اور مختلف شعبوں کے ذمہ داروں، حکومت کی طرف سے مقررہ مفتیوں، حکومت کے عمال، مارکٹ کے ذمہ داران وغیرہ کا بھی ہے بلکہ مقروض

---

(۱) ابوداؤد، کتاب الاقضیہ باب فی کراہیۃ الرشوۃ — ترمذی کتاب الاحکام باب جاء فی الراشی والمرتشی فی الحکم۔

(۲) شامی ۴/۳۰۳۔

(۳) الاشباہ والنظائر لابن نجیم ص: ۱۵۸ قاعدہ: ماحرم اخذہ حرم اعطاءہٗ۔

(۴) درمختار علی ہامش الرد ۵/۲۷۲۔

(۵) درمختار ۴/۳۱۱۔

قرض دہندہ کو خلافِ عادت تحفہ دے تو یہ بھی اسی حکم میں ہے (۱)

اس تفصیل سے یہ بات عیاں ہے کہ دفتروں اور آفسوں میں کام کرنیوالے لوگ اپنے مفوضہ فرائض کے انجام دہی پر انعام وغیرہ کے نام سے جو وصول کرتے ہیں اور جو قبیح اور غیر شرعی رواج کے تحت معمول میں داخل ہو گئے ہیں قطعاً ناجائز اور حرام ہیں، رشوت ہیں اور ان کا واپس کر دینا واجب ہے۔

قمار وجوا :

اسلام کا بنیادی تصور یہ ہے کہ ہر شخص کو خود اپنی محنت اور جد وجہد سے نفع حاصل کرنا چاہیئے۔ محنت کے بغیر محض دوسروں کا استحصال کر کے فائدہ اٹھانے کو اسلام ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے، اسی لئے تجارت کو نہ صرف جائز بلکہ بہتر قرار دیا گیا ہے کہ اس میں تاجر اپنی محنت اور ذہانت کا صلہ وصول کرتا ہے اور سود کو ناجائز اور حرام کیا گیا کہ اس میں سود خوار کسی محنت کے بغیر غریبوں اور مفلسوں کا استحصال کر کے سرمایہ بڑھاتا رہتا ہے۔

قمار میں بھی یہی بات پائی جاتی ہے۔ قمار کا اطلاق ہر ایسے معاملہ پر ہوتا ہے جو نفع اور نقصان کے درمیان دائر ہو مثلاً لاٹری کا ٹکٹ ہے، اگر کوئی شخص پانچ روپیہ میں خرید کرتا ہے تو اسے نفع کی بھی امید ہے اور نقصان کا خطرہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسے ایک لاکھ روپیہ کا مجوزہ انعام مل جائے اور عین ممکن ہے یہ پانچ روپیہ بھی واپس نہ آئے، یا مثلاً دو آدمی میں دوڑ کا مقابلہ ہو کہ اگر تم آگے بڑھ گئے تو تم کو پانچ روپئے دیدیں گے اور ہم بڑھ گئے تو تم کو ہمیں دینا ہو گا، یہاں معاملہ نفع اور نقصان کے درمیان دائر ہے اس لئے "قمار" ہو گا۔

---

(۱) ردالمحتار ۴/۳۱۱۔

یہاں بھی دراصل وہی بات پائی جاتی ہے کہ حاصل ہونے والا نفع کسی محنت کا معاوضہ نہیں ہے اور جو نقصان پہنچا ہے اس کی کوئی معقول اور منصفانہ وجہ نہیں ہے۔ جس شخص کو لاٹری کے ایک لاکھ روپے مل گئے، اس نے یہ رقم ذاتی محنت اور جہد و کاوش سے حاصل نہیں کی ہے اور جس کے پانچ روپے رائیگاں گئے اس کے یہ پانچ روپے کسی معقول وجہ کے بغیر اس ایک لاکھ روپے حاصل کرنے والے کے ہاتھ چلے گئے۔

اس کو "شرکت" اور "مضاربت" پر قیاس نہیں کرنا چاہیے۔ وہاں نفع اور نقصان معاملہ کے ہر دو فریق کو یکساں طور پر پہنچتا ہے ایسا نہیں ہوتا کہ ایک کو نفع ہو اور دوسرا نقصان اٹھائے، اس طرح نفع اور نقصان کا مدار "اتفاق" نہیں ہے بلکہ ان کی ذاتی محنت اور کاوش ہے جب کہ قمار میں ایک فریق مکمل فائدہ اٹھاتا ہے اور دوسرا فریق مکمل نقصان۔ نیز نفع و نقصان کی بنیاد محنت نہیں ہے بلکہ اتفاق ہے۔

قمار کے نقصانات:

قمار کے جو اخلاقی اور تمدنی اثرات و نتائج مرتب ہوتے ہیں وہ بجائے خود ایسے ہیں کہ ان سے منع کیا جائے۔ اس کی وجہ سے حرص و لالچ پیدا ہوتی ہے آدمی خود غرض اور ہوس پرست بن جاتا ہے، باہم حسد و ڈاہ کی نفسیات جاگتی ہے، آپس میں نفرت و عناد جڑ پکڑتی ہے اور سعی و محنت کے بجائے اسی طرح بیٹھے بٹھائے کھانے کمانے کا جذبہ پروان چڑھتا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے الفاظ میں:

"قمار سے حاصل ہونے والا مال حرام اور باطل ہے اس لئے کہ یہ لوگوں سے

ان کا مال چھیننا اور جہالت، حرص و لالچ اور غلط آرزوؤں کے پیچھے چلنا ہے . . . تمدن اور تعاون میں اس کا کوئی دخل نہیں ہے، نقصان اٹھانے والا خاموش رہ جائے تو غصہ اور افسوس کے ساتھ خاموش رہے گا، لڑے تو ایک ایسی بات پر لڑے گا جس کا سبب وہ خود بنا ہے، فائدہ اٹھانے والا اس جوئے سے لذت اندوز ہوتا ہے اور زیادہ سے زیادہ کی لالچ میں گرفتار رہتا ہے اور یہ حرص کسی مقام پر جاکر رکتی نہیں ہے۔ اس کا سلسلہ چل پڑے تو معیشت کو نقصان ہوگا، باہمی مخاصمت بڑھے گی۔ معاشی تگ و دو ٹھپ پڑ جائے گی۔ اور اس تعاون سے جو تمدن کی بنیاد ہے، لوگوں میں اعراض پیدا ہو جائے گا۔ اگر آپ نے کسی جوئے خوار کو دیکھا ہے تو آپ کو اس کا بخوبی اندازہ ہوگا (۱)"

جوئے کے نقصانات کا اہم پہلو یہ ہے کہ ایک عادت سی بن جاتی ہے۔ ایک شخص ہارتا اور نقصان اٹھاتا جاتا ہے اور پھر اپنی بقیہ پونجی کو ایک موہوم فائدہ اور جیت کی امید پر لگاتا چلا جاتا ہے، اکثر اوقات یہ مدہوشی انسان کو مکمل قلاش اور دریوزہ گر بنا کر چھوڑتی ہے اور کبھی کبھی تو معاملہ اس حد تک فزوں ہو جاتا ہے کہ لوگ مال و سرمایہ سے گذر کر عزت و آبرو کا سودا کرنے اُتر آتے ہیں اور بیوی بیٹی تک کی بازی لگا چھوڑتے ہیں۔ والعیاذ باللہ۔

قمار ایامِ جاہلیت میں:

ایامِ جاہلیت میں قمار کا رواج بہت زیادہ تھا، اس کی زیادہ رائج صورت تھی کہ ان کے پاس کچھ پانسے ہوتے تھے جن پر مختلف مقدار لکھی رہتی

---

(۱) حجۃ اللہ البالغہ ۲/۹۸۔

تھی، مثلاً تہائی (ثلث) آدھا (نصف) وغیرہ، بعض پر "لاَ" (نہیں) لکھا ہوتا تھا، اب جس کے نام پر جو پانسا نکلا اسی کے بقدر اس کو حصہ ملتا تھا اور جس کے نام پر "لاَ" ہوتا وہ بالکل محروم قرار پاتا تھا، حالانکہ جس شئ کی تقسیم کی جاتی اس میں سبھوں کے سرمائے یکساں طور پر لگتے تھے ــــ اسی کو وہ "ازلام" کہا کرتے تھے۔

قرآن مجید :

عربوں میں چوں کہ قمار کا رواج بہت قدیم اور بڑی کثرت سے تھا، اس لئے اس کی حرمت میں تدریج سے کام لیا گیا، پہلے مرحلہ میں صرف اس قدر کہا گیا کہ جوئے کے نقصانات اس کے فائدے سے زیادہ ہیں :

یسئلونک عن الخمر والمیسر قل فیھما اثم کبیر ومنافع للناس واثمھما اکبر من نفعھما ۔ (البقرۃ ــــ ۲۱۹)

لوگ آپ سے شراب اور جوئے کے متعلق دریافت کرتے ہیں، کہہ دیجئے کہ اس میں بڑا گناہ ہے، لوگوں کے لئے گو نفع بھی ہے مگر نقصان نفع سے بڑھ کر ہے۔

یہاں "میسر" سے مراد قمار ہے، دوسرے مرحلہ میں نہ صرف یہ کہ مکمل طور پر اس کی حرمت کا اعلان کر دیا گیا بلکہ اس کے لئے انتہائی تاکید اور سخت تنبیہ کا اسلوب اختیار کیا گیا، چنانچہ ارشاد ہوا :

یاایھا الذین اٰمنوا انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشیطان فاجتنبوہ لعلکم تفلحون ۝ انما یرید الشیطان ان یوقع بینکم العداوۃ والبغضاء

اے اہلِ ایمان! شراب، جوا، بت اور پانسے ناپاک اور شیطانی کام ہیں، ان سے بچو، امید ہے کہ اس طرح تم کامیاب ہوگے، شیطان چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعہ تمہارے درمیان عداوت و نفرت پیدا کر دے اور تم کو ذکرِ خداوندی

فی الخمر والمیسر ویصدکم عن ذکر اللہ وعن الصّلوٰۃ فھل انتم منتھون۔ اور نماز سے روک دے پھر کیا تم لوگ اس سے رکو گے؟؟۔ (مائدہ ـــ ۹۰)

احادیث میں بھی اس کی بڑی مذمت آئی ہے۔ آپؐ نے فرمایا جو شخص اپنے ساتھی سے کہے، آؤ، تمہارے ساتھ جوا کھیلیں، اسے صدقہ کرنا چاہیئے (۱) یعنی صرف جوے کی دعوت بھی اتنا بڑا جرم ہے کہ صدقہ کے ذریعہ اس کا کفارہ ادا کردینا چاہیئے، چہ جائے کہ خود جوا کھیلنا یا جوئے کا کاروبار کرنا ـــــ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے تمام تجارتی معاملات اور کاروبار کو ممنوع قرار دیا ہے جس میں قمار اور جوا پایا جاتا ہو۔

لاٹری اور معمے:

لاٹری میں بھی قمار اور ربوٰ دونوں ہی پایا جاتا ہے، اس لیئے کہ جو ٹکٹ خرید کرتا ہے اگر اس کے نام سے لاٹری نکلے جو اکثر اوقات روپیہ ہی کی صورت میں ہوتی ہے تو لین دین کے معاملہ (عقد معاوضہ) میں ایک طرف سے کم اور دوسری طرف سے زیادہ معاوضہ ہوجائے گا اور یہی "ربوا" ہے، دوسرے اس میں نفع و نقصان مبہم اور خطرہ میں رہتا ہے کہ اگر نام نکل آیا تو نفع ہوگا نہ نکلا تو اصل پونجی بھی ڈوب جائے گی۔ پھر یہ نفع ٹکٹ خریدنے والوں کی محنت کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ محض بخت و اتفاق ہے کہ اسی کا نام نکل آیا ـــــ ایسے ہی مبہم اور زیر خطر نفع و نقصان کو قمار کہتے ہیں، اس لیئے قمار بھی پایا گیا۔

امام ابوبکر جصاص رازی لکھتے ہیں:

لاخلاف بین اھل العلم جوئے کی حرمت اور "مخاطرہ" کے جوا ہونے میں

---

(۱) بخاری و مسلم۔

فی تحریم القمار وان المخاطرة من	اہلِ علم کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ۔
القمار قال ابن عباس ان المخاطرة	ابن عباس نے فرمایا کہ مخاطرہ جوا ہے ۔
قمار (۱)	

⁂ ⁂ ⁂ ⁂

قریب قریب یہی نوعیت معمہ کی بھی ہے ، اس میں بھی معمہ پُر کرکے بھیجنے والا فیس ادا کرتا ہے ، حل صحیح نکل آیا تو زیادہ رقم ملتی ہے ورنہ اصل پیسے بھی واپس نہیں ہوتے ، ہاں اگر معمہ بھیجنے والوں سے کوئی فیس نہ لی جائے تو یہ صورت درست ہوگی اور اس رقم کی حیثیت خالص انعام کی قرار پائے گی ۔

انشورنش :

قمار آمیز کاروبار جو آج کل جاری ہیں ، ان میں سرفہرست انشورنش کا مسئلہ ہے ، گو انشورنش کی صورتوں اور پالیسیوں میں خاصا تنوع پایا جاتا ہے لیکن عام طور پر وہ دو مفاسد سے خالی نہیں ہیں ، ایک سود ، دوسرے قمار ـــــ سود تو ہر صورت میں ہے ، اس لئے کہ جمع شدہ رقم کی حیثیت قرض کی ہے اور منافع گویا اس مہلت کا معاوضہ ہے ، اسی کا نام ربوٰ ہے ، اور اگر مدتِ مقررہ سے قبل موت واقع ہوگئی تو قمار بھی پایا گیا کیوں کہ مال حاصل ہونے یا نہ ہونے کی بنیاد ایک ایسی چیز کو بنایا جارہا ہے جس کا موجود ہونا اور نہ ہونا مبہم ہے ، اسی کو فقہاء "خطر" اور "مخاطرہ" سے تعبیر کرتے ہیں اور ایسی تمام چیزوں کو قمار قرار دیتے ہیں

لاخلاف بین اھل العلم فی تحریم القمار وان المخاطرة من القمار (۲)

یہاں بھی یہی صورت ہے کہ مقررہ میعاد کے درمیان موت یا اس عضو

---

(۱) احکام القرآن ۱/۳۸۸ ۔

(۲) حوالۂ سابق ۔

یا کاروبار کے ضائع یا ہلاک ہونے کی وجہ سے جو نفع متوقع ہے اس کا حاصل ہونا اور نہ ہونا موقع خطر میں ہے کہ اگر یہ چیزیں سلامت رہ گئیں تو یہ نفع حاصل نہ ہو سکے گا۔ اور چوں کہ کم رقم دے کر زیادہ رقم حاصل کی جارہی ہے، اس لئے سود بھی ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں کے لئے:

لیکن ہندوستان کے موجودہ حالات میں ہندو مسلم فسادات کی کثرت اور ان فسادات کا اتفاقاً پیش نہ آنا بلکہ بعض جماعتوں اور تحریکوں کی طرف سے مسلمانوں کی جان و املاک کی ہلاکت و بربادی کی سعی نے یہ سوال پیدا کر دیا ہے کہ بہ حالتِ موجودہ ہندوستانی مسلمانوں کے لئے کیا انشورنش کی اجازت دی جاسکتی ہے؟ اور اس کو جائز قرار دیا جاسکتا ہے؟

اس سلسلہ میں علماء کی ایک جماعت جواز کا فیصلہ کر چکی ہے، حقیقت یہ ہے کہ موجودہ حالات میں مسلمانوں کے لئے جماعتی اعتبار سے جان و مال اور کاروبار کا انشورنس فقہی اصطلاح کے اعتبار سے "حاجت" کا درجہ ضرور اختیار کر گیا ہے اور عمومی اور اجتماعی نوع کی حاجتیں ضرورت ہی کا درجہ رکھتی ہیں (۱)، بلکہ فقہاء نے تو انفرادی حاجت کی بنا پر بھی سودی قرض لینے کی اجازت دی ہے ویجوز للمحتاج الاستقراض بالربح (۲) اور دفع ضرر ہی نہیں بلکہ کسی چیز کے تعامل اور رواج کو بھی حاجت کی کیفیت پیدا ہونے کے لئے کافی تصور کیا گیا ہے و منها الافتاء بصحة بيع الوفاء حين كثر الدين على اهل بخارى وهكذا بمصر وقد سموه بيع الامانة (۳) اسی طرح جن چیزوں میں کاریگروں سے غیر موجود

---

(۱) الاشباہ والنظائر للسیوطی ص: ۱۷۹۔

(۲) الاشباہ والنظائر لابن نجیم مع الغمز ۱/۲۹۴۔

(۳) حوالۂ سابق۔

مصنوعات کے خریدنے کا رواج ہو، ان میں رواج وتعامل کو ملحوظ رکھتے ہوئے فقہاء نے "استصناع" کی اجازت دی ہے : ثم انما جاز الاستصناع فیما للناس فیہ تعامل اذا بین وصفاً علیٰ وجہ یحصل لتعریف اما فیما لا تعامل فیہ ...... لم یجز (۱) اسی طرح حاجت کی بنا پر "ضمانِ درک (۲)"، وغیرہ کی گنجائش سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ہندوستانی مسلمان اپنے جان ومال اور تجارت وصنعت وغیرہ کے سلسلہ میں جس ضرر شدید سے دوچار ہیں وہ مذکورہ حاجتوں سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اس لئے اجتماعی حاجت کی بنا پر ہندوستان کے موجودہ حالات میں جان ومال اور تجارت وصنعت کا انشورنس جائز ہوگا۔

دوسرے امت کا اختلاف رحمت ہے اور جہاں دقت پیدا ہو جائے وہاں اختلاف سے فائدہ اٹھاتے ہوئے علماء کے مشورہ سے قول ضعیف پر بھی عمل کیا جاسکتا ہے، جیسا کہ شامی نے لکھا ہے (۳) امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک دارالحرب میں عقود فاسدہ کے ذریعہ حصولِ مال مسلمان کے لئے جائز ہے، یہ رائے گو دلائل کے اعتبار سے مرجوح ہے لیکن بے اصل نہیں ہے، ایسا ملک جو دارالحرب ہو لیکن اہلِ اسلام سے اس کی مصالحت ہوگئی ہو اور گویا اسکی حیثیت معاہدین کی ہوگئی ہو، امام محمد کی حسب تحریر ان سے بھی عقودِ فاسدہ جائز ہے۔

فلوان اهل دار من دار الحرب	اگر دارالحرب کے لوگ اہل اسلام سے صلح کرلیں پھر
وادعوا اهل الاسلام فدخل اليهم	کوئی مسلمان ان کے ملک میں جائے اور دو درہم
مسلم وبايعهم الدرهم بالدرهمين	کے بدلہ ایک درہم خرید کرلے تو اس میں کوئی

---

(۱) قاضی خان ۱/ ۴۹۹۔

(۲) "ضمانِ درک" سے مراد یہ ہے کہ خریدار بیچنے والے سے سامان لینے کے علاوہ مزید ضمانت حاصل کرے کہ اگر اس سامان کا کوئی حقدار نکل آئے تو وہ اس سامان کی قیمت وصول کرے گا۔

(۳) ردّ المحتار۔

لم یکن بذلک بأس لان بالموادعة لم تصر دارهم دار الاسلام (۱)

مضائقہ نہیں اس لئے کہ اس مصالحت کی وجہ سے ان کا ملک دار الاسلام نہیں بن جاتا۔

ہندوستان میں بھی یہاں کی حکومت اور غیر مسلم شہریوں کو ایک حد تک "موادعین" کی فہرست میں رکھا جا سکتا ہے، پس ایک طرف مسلمانوں کی یہ اجتماعی حاجت اور دوسری طرف فقہ حنفی میں یہ گنجائش اس بات کا جواز فراہم کرتی ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کو جان، مال، تجارت اور کاروبار کے انشورنش کی اجازت دی جائے۔

اس سلسلہ میں ۱۵، ۱۶ دسمبر ۱۹۶۵ء کو مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء لکھنؤ نے ایک نشست بلائی تھی جس میں کچھ نمائندہ اہل علم نے شرکت کی تھی اس اجتماع نے انشورنش کے سلسلہ میں جو متوازن، بصیرت افروز اور حقیقت پسندانہ رائے قائم کی ہے۔ وہ یوں ہے:

"مجلس یہ رائے رکھتی ہے کہ اگرچہ انشورنس کی سب شکلوں کے لئے ربوا و قمار (سود اور جوا) لازم ہے اور ایک کلمہ گو کے لئے ہر حال میں اصول پر قائم رہنے کی کوشش کرنا ہی واجب ہے لیکن جان و مال کے تحفظ و بقا کا جو مقام شریعت اسلامیہ میں ہے مجلس اسے بھی وزن دیتی ہے۔ نیز مجلس اس صورت حال سے بھی صرف نظر نہیں کر سکتی کہ موجودہ دور میں نہ صرف ملکی بلکہ بین الاقوامی ریاستوں سے انشورنش انسانی زندگی میں اس طرح دخیل ہو گیا ہے کہ اس کے بغیر اجتماعی اور کاروباری زندگی میں طرح طرح کی دشواریاں پیش آتی ہیں اور جان و مال کے تحفظ کے لئے بھی بعض حالات میں اس سے مفر ممکن نہیں ہوتا۔ اس لئے ضرورت شدیدہ کے پیش نظر اگر کوئی شخص اپنی

---

(۱) الشرح الکبیر ۴/۱۴۹۳۔

زندگی یا اپنے مال یا اپنی جائیداد کا بیمہ کرائے تو مذکورہ بالا ائمۂ کرام کے قول کی بنا پر اس کی شرعاً گنجائش ہے۔

اوپر کی عبارت میں لفظ "ضرورتِ شدیدہ" سے مراد یہ ہے کہ جان یا اہل و عیال یا مال کے ناقابل برداشت نقصان کا قوی اندیشہ ہو۔

"ضرورت شدیدہ" موجود ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ مجلس کے نزدیک مبتلیٰ بہٖ (جو شدید دشواریوں میں مبتلا ہو کر بیمہ کرانا چاہتا ہو) کی رائے پر منحصر ہے جو خود کو عنداللہ جواب دہ سمجھ کر علماء کے مشورہ سے قائم کرے"(۱)

موجودہ انشورنس کا اقتصادی نقصان

ویسے انشورنس کا موجودہ نظام غیر اسلامی ہونے کے علاوہ معاشی اعتبار سے بھی نظرِ ثانی کا محتاج ہے۔ موجودہ نظام میں بینک کی طرح اصل فائدہ چند سرمایہ داروں کو حاصل ہوتا ہے، انہیں کے پاس دولت کا ارتکاز ہوتا جاتا ہے اور عام لوگوں کو اس سے جو نفع حاصل ہوتا ہے اس کا تناسب بہت معمولی ہوتا ہے۔ مثلاً اگر ایک سال میں اس اسکیم میں ایک سو آدمی شریک ہوں اور ان سے ایک لاکھ روپے حاصل ہوں تو انشورنس کمپنی ان کو تجارت، صنعت اور مختلف کاروبار میں لگا کر بے پناہ فائدہ بٹورتی ہے، اس کا فائدہ ۹۰ فیصد حصہ چند سرمایہ داروں کے جیب میں جاتا ہے، عام شرکاء کے حصہ میں جو نفع ملتا ہے

---

(۱) اس پر شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی مرحوم، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی مرحوم، مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب مفتاحی، مولانا سید فخر الحسن صاحب مرحوم، مولانا محمد منظور نعمانی، مولانا سعید احمد اکبرآبادی مرحوم، مولانا محمد ادریس صاحب ندوی مرحوم، مولانا شاہ عون احمد صاحب، مولانا ابواللیث صاحب ندوی مرحوم، مولانا محمد اسحاق سندیلوی نے دستخط کیے ہیں۔

اس کی مجموعی قدر حاصل ہونے والے منافع کا ۱۰ فیصد سے زیادہ نہیں ہوتا، اگر ایک دو ممبر کی موت ہوئی تو کمپنی جغرافیائی حالات اور سابقہ ریکارڈ کی روشنی میں پہلے سے اس کو ملحوظ رکھتی ہے۔

اقتصادی لحاظ سے یہ بات زیادہ مفید اور بہتر ہوتی ہے کہ چند آدمیوں میں دولت کا ارتکاز ہونے کے بجائے وہ زیادہ سے زیادہ ہاتھوں میں پھیلے اور گردش میں رہے، اس طرح غربت کم ہوگی اور نفع میں عام لوگوں کو شرکت کا موقع ملے گا، اس لئے اسلام نے شرکت اور مضاربت کے اصول پر کاروبار کا نظام رکھا ہے تاکہ حاصل ہونے والے نفع سے کاروبار کے تمام شرکاء یکساں طور پر مستفید ہو سکیں۔

زراعت وکاشتکاری

تجارت کے بعد دوسرا اہم ذریعۂ معاش زراعت اور کاشتکاری ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زراعت کی بڑی حوصلہ افزائی فرمائی ہے حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ مسلمان کوئی درخت یا کھیتی لگائے اور اس میں سے انسان، درندہ، پرندہ یا چوپایہ کھائے تو وہ اس کے لئے صدقہ ہو جاتا ہے[۱] اسی لئے بعض صحابہ خاص اہتمام سے درخت لگایا کرتے تھے، امام احمدؒ نے حضرت ابوالدرداءؓ سے خاص اسی نیت سے درخت لگانا نقل کیا ہے (۲) حضرت حسن سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ شہد مکھی اور درخت باعثِ برکت ہے[۳] حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی ہزار ترقی اور صنعتی ارتقار کے باوجود آج

---

(۱) بخاری کتاب الحرث والمزارعۃ باب فضل الزرع الخ، ترمذی کتاب الاحکام باب ماجاء فی الغرس۔

(۲) مجمع الزوائد ۴/۶۸-۶۷۔

(۳) حوالۂ مذکور۔

بھی زمین ہی انسان کی غذائی ضروریات کی تکمیل کا سب سے بڑا ذریعہ ہے اور اسی کے ذریعہ نہ صرف غذا بلکہ علاج وادویہ کی ضروریات بھی پوری ہوتی ہیں، اسی لئے اسلام نے اس کی بڑی حوصلہ افزائی فرمائی ہے۔ زمین کا خواہ مخواہ افتادہ رہنا اور اس کی قوتِ کاشت سے فائدہ نہ اٹھانا ناپسندیدہ بات ہے، چنانچہ اگر ایسی افتادہ زمین ہو جس کو فقہ کی اصطلاح میں "موات" کہتے ہیں تو اسے جو بھی آباد کرلے جائز ہے (۱) امام ابو حنیفہ کے نزدیک ایسی سرکاری غیر مزروعہ زمین سرکار کی اجازت سے کاشت کی جاسکتی ہے۔ پھر اگر تین سال گذر جائے اور وہ کوئی فائدہ نہ اٹھائے تو زمین اس سے لیکر دوسرے کو حوالہ کردی جائے گی تاکہ دوسروں کو استفادہ کا موقع مل سکے (۲) امام شافعی اور امام احمد کے نزدیک تو ایسی افتادہ زمین کی آبادکاری کے لئے حکومت سے اجازت کا حصول بھی ضروری نہیں (۳)

البتہ دوسرے مشاغل کی طرح کاشت کاری میں بھی اتنا غلو اور اشتغال کہ دوسرے فرائض سے غفلت ہو جائے مناسب نہیں، چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو امامہ باہلی کے گھر میں کھیتی باڑی کے سامان دیکھے تو فرمایا کہ جس قوم کے گھروں میں یہ آتا ہے وہاں ذلت بھی آجاتی ہے (۴) غالباً ایسا اس لئے فرمایا گیا کہ کھیتی باڑی کرنے والے نہ جہاد اور دفاع کی تیاری کرپاتے ہیں اور نہ اسفار، اس کی وجہ سے ان کے اندر بزدلی اور بزدلی کی وجہ سے ذلت پیدا ہو جاتی ہے (۵)

---

(۱) ابوداؤد۔

(۲) خلاصۃ الفتاویٰ ۴/۳۔

(۳) رحمت الامۃ ص: ۳۶

(۴) بخاری کتاب المزارعۃ باب ما یحذر من عواقب الاشتغال الخ۔

(۵) دیکھئے عمدۃ القاری ۱۲/۱۵۶۔

کاشت میں بٹائی داری

شریعت میں ایسی نظیریں موجود ہیں کہ ایک شخص کے پاس اسباب و وسائل ہوں اور دوسرے کے پاس صلاحیت ہو اور ان دونوں کے مجموعہ سے جو پیداوار حاصل ہو وہ دونوں میں تقسیم ہو جائے "مضاربت" کا ماحصل یہی ہے۔

سوال یہ ہے کہ کاشتکاری میں بھی یہ بات کہ ایک شخص کی زمین ہو اور دوسرے شخص کی طرف سے محنت ہو، جائز ہے یا نہیں اور اسی زمین کی پیداوار دونوں میں تناسب کے لحاظ سے تقسیم ہو جائے؟۔ اس سلسلہ میں روایتیں مختلف ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل خیبر کے ساتھ اسی طرح کا معاملہ طے کیا تھا کہ وہ کھیتی کریں اور نصف پیداوار آپ کے حوالہ کریں (۱) اس سے بٹائی داری کا جواز معلوم ہوتا ہے، دوسری طرف رافع بن خدیج اور بعض دوسرے راویوں کی روایت ہے کہ آپؐ نے اس سے منع فرمایا (۲) اس سے ناجائز ہونا معلوم ہوتا ہے۔

لیکن درحقیقت ان دونوں روایتوں میں کوئی تعارض نہیں۔ اصل میں اس طرح کاشتکاری اور نفع کی دونوں میں تقسیم جائز ہے بشرطیکہ زمینوں کے کسی خاص حصہ کی پیداوار یا متعینہ مقدار فریقین میں سے کوئی اپنے لئے مخصوص نہ کرلے اس لئے کہ ممکن ہے کہ زمین کے اسی حصہ میں پیداوار ہو یا اتنی مقدار ہی میں غلہ نکلے تو ایسی صورت میں دوسرا فریق بالکل محروم رہ جائے گا اسلئے یہ شکل جائز نہیں۔

اس حدیث کی جو تاویل کی گئی ہے اس کی تائید خود امام بخاری کی روایت سے ہوتی ہے، امام بخاری نے رافع بن خدیج سے نقل کیا ہے کہ ہم لوگ زمین میں

---

(۱) ترمذی عن ابن عمر ابواب الاحکام باب ماجاء فی المزارعۃ۔

(۲) ترمذی عن رافع بن خدیج ابواب الاحکام باب ماجاء فی المزارعۃ۔

ایک متعین گوشۂ زمین کو مالک زمین کے لئے چھوڑ دیتے تھے، اس سے منع کیا گیا (۱) چنانچہ امام ابوحنیفہ نے گو بٹائی داری کو مکمل منع کیا ہے لیکن آپ کے بعض تلامذہ اور اکثر فقہاء نے اس کی اجازت دی ہے، ہاں اس صورت کو منع کیا ہے جبکہ زمین کا مخصوص حصہ یا پیداوار کی ایک مخصوص مقدار فریقین میں سے کوئی اپنے لئے مخصوص کر لے اور اسی پر فتویٰ ہے۔

کچھ اور احکام

"مزارعت" کی تفصیلات باہمی معاہدہ اور عرف کے تحت طے پائیں گی، بیج مالک کی طرف سے ہو یا کاشتکار کی طرف سے؟ یہ عرف و عادت پر موقوف ہے اسی طرح کھیتی مکمل ہونے کے بعد اس کی کٹوائی اور گھر پہنچوائی کس کے ذمہ ہے، ان سب میں لوگوں کا عام عرف اور تعامل اصل اور بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے اور اسی کی روشنی میں اس کا فیصلہ ہوگا (۲)

صنعت و حرفت

صنعت و حرفت کو اسلام میں بڑی اہمیت حاصل ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ سب سے بہتر کمائی کیا ہے؟ فرمایا آدمی کا اپنے ہاتھ سے کام کرنا (۳) ایک اور روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ صنعت و حرفت جاننے والے مسلمان کو پسند فرماتا ہے (۴) صنعت و حرفت میں بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے

---

(۱) بخاری کتاب المزارعة باب قبیل باب المزارعة بالشطر۔
(۲) ملخص از: فتاویٰ ہندیہ ۵/۲۲۵ و ما بعدہٗ۔
(۳) مجمع الزوائد ۶۰/۴ باب ایدی الکسب افضل۔
(۴) ان اللہ یحب المؤمن المحترف وفیہ عاصم بن عبید اللہ وہو ضعیف۔ مجمع الزوائد ۶۲/۴ باب الکسب و التجارۃ الخ۔

چھوٹی انسانی خدمت اور حفاظت و جہاد کے تمام اسباب آجاتے ہیں، مسلمانوں نے ابتدائی دور ہی سے اس طرف بڑی توجہ دی ہے اور سائنسی ترقی میں بڑا کردار ادا کیا ہے۔ بدقسمتی سے ۱۷ ویں صدی سے جب یورپ نے اس سمت میں تیز گامی کے ساتھ سفر طے کیا تو مسلمانوں نے اپنی سست انگاری اور غفلت کی وجہ سے اس میدان سے بالکل اپنے کو الگ تھلگ کرلیا جس کے سنگین نتائج ہمارے سامنے ہیں والی اللہ المشتکی۔

دو بنیادی اصول

صنعت و حرفت میں صرف دو اصول سامنے رہنے چاہئیں اور وہ یہ کہ اس کے ذریعہ گناہ میں براہِ راست تعاون نہ ہوتا ہو مثلاً مورتیوں اور مجسموں کا بنانا جائز نہیں، زنار کا بنانا جائز نہیں کہ وہ برادرانِ وطن کے یہاں ایک مذہبی شعار کا درجہ رکھتی ہے، اسی طرح ذی روح کی تصاویر اور ان کے مجسمے بنانا جائز نہیں کہ خود حضورؐ نے اس سے منع فرمایا ہے (۱)

دوسرا اصول یہ ہے کہ اپنی مصنوعات کو ایسے لوگوں سے فروخت کرنا جو اس کے ذریعہ فتنہ برپا کرسکتے ہوں، جائز نہیں، مثلاً مخالف اسلام قوتوں کو اسلحہ کی فراہمی جائز نہیں ہوگی کہ اس کا استعمال غلط ہوگا (۲) اسی پر دوسری مصنوعات کو بھی قیاس کیا جاسکتا ہے۔

اجارہ و مزدوری

کسبِ معاش کا تیسرا ذریعہ مزدوری اور ملازمت ہے، اس معاملہ کو

---

(۱) مسلم عن ابن عباس باب تحریم تصویر صورۃ الحیوان وتحریم اتخاذ ما فیہ صور الخ۔

(۲) درمختار ۵/۲۵۰۔

فقہ کی اصطلاح میں اجارہ اور کام کرنے والے کو اجیر کہتے ہیں، مزدور کا مسئلہ چوں کہ اہم ترین مسائل میں سے ہے اس لئے اس پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالی جاتی ہے:

مزدوروں کا مسئلہ ان مسائل میں سے ہے جس کو گذشتہ نصف صدی کے اہم ترین مسائل میں شمار کیا جاسکتا ہے اور یہ فطری بات ہے، دنیا کی ساری بہار دراصل انہی کے دم سے ہے۔ بلند قامت عمارتیں ہوں، صاف ستھری سڑکیں ہوں یا دیہات کے سبزہ زار کھیت اور بل کھاتی ہوئی نہریں، سب کو انہی کے خون و پسینہ اور قوتِ بازو سے غذا ملتی ہے، یہ بھی عجیب ستم ظریفی ہے کہ معاشی ترقی اور خوشحالی میں سب سے کم حصہ مزدوروں ہی کو ملتا ہے حالاں کہ وہ سب سے زیادہ اس کے حقدار تھے۔ یہاں اس بات کی وضاحت کر دینی مناسب ہوگی کہ جب ہم مزدور کا لفظ بولتے ہیں تو اس سے صرف وہ جفاکش طبقہ ہی مراد نہیں ہوتا جو جسمانی محنتوں اور مشقتوں کے کام کرتا ہے بلکہ وہ ملازمین بھی مراد ہوتے ہیں جو لکھنے پڑھنے یا دوسرے دماغی قسم کے کام کرتے ہیں۔

اسلام نے دوسرے شعبہ ہائے زندگی کی طرح اس باب میں بھی مفصل اور واضح ہدایات دی ہیں جس میں آجر اور مزدور دونوں ہی کے حقوق کی رعایت ہے اور اعتدال و توازن بھی ہے۔

مزدوروں کی اہمیّت

سب سے پہلے تو اسلام نے مزدوروں کو ایک بلند مقام اور منصب کا حامل قرار دیا اور عام طور پر جو اس طبقہ کو کمتر اور حقیر گردانا جاتا تھا جو اَب تک باقی ہے، کی نفی کی، آپ نے فرمایا:

- حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آٹھ یا دس سال تک حضرت شعیب علیہ السلام کی مزدوری کی (۱)
- حلال روزی کی تلاش میں محنت و کاوش کو عند اللہ پورے ایک سال امام عادل کے ساتھ جہاد سے افضل قرار دیا گیا (۲)
- چھوٹے بچے، ماں باپ اور خود اپنی کفالت کے لئے دوڑ دھوپ (سعی) کو آپؐ نے اللہ کی راہ میں جدوجہد بتایا (۳)
- آپؐ نے فرمایا کہ سب سے پاکیزہ عمل یہ ہے کہ آدمی خود اپنے ہاتھوں کمائے (۴) اور خدا کے نبی حضرت داؤد اپنے ہاتھوں ہی کی کمائی کھایا کرتے تھے (۵)
- اللہ تعالیٰ ایسے مؤمن بندہ کو پسند کرتا ہے جو صنعت و حرفت سے واقف ہو اور اس سے کام لیتا ہو (ان اللہ یحب العبد المؤمن المحترف) (۶)
- آپؐ نے فرمایا تمام انبیاء کرامؑ نے بکریاں چرائی ہیں اور فرمایا خود میں بھی چند قیراطوں پر مکہ والوں کی بکریاں چرایا کرتا تھا (۷)
- کاشتکاری کو مبارک کہا گیا اور اس کا حکم دیا گیا (۸)
- ایک بار آپؐ نے حضرت حکیم بن حزامؓ سے ارشاد فرمایا سب سے حلال وہ ہے جس میں دونوں پاؤں چلیں، ہاتھ کام کریں اور پیشانی عرق آلود ہو (۹)

---

(۱) مسند احمد، ابن ماجہ عن عتبہ بن منذرؓ۔
(۲) ابن عساکر عن عثمانؓ۔
(۳) طبرانی عن کعب بن عجرۃؓ۔
(۴) بیہقی عن علیؓ، طبرانی عن ابی بردہؓ۔
(۵) بخاری عن ابی ہریرۃؓ و مقدامؓ۔
(۶) طبرانی عن ابن عمرؓ۔ (۷) بخاری و ابن ماجہ عن ابی ہریرۃؓ۔
(۸) ابوداؤد عن علی بن حسینؓ مرسلاً۔
(۹) دیلمی عن حکیم بن حزامؓ۔

ان ہدایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں مزدوروں کو ایک معزز اور موقر مقام حاصل ہے اور دوسرے پیشوں اور طبقوں سے ان کی حیثیت کم نہیں ہے۔

اُجرت کی مقدار

اس کے بعد مزدوروں کے حقوق کا مسئلہ آتا ہے جس میں سب سے بنیادی اور اولین چیز اجرت کی مقدار کا تعین ہے۔ اس پر اس حدیث سے روشنی پڑتی ہے جس میں حضورؐ نے غلاموں کے سلسلہ میں درج ذیل ہدایات دی ہیں:

"وہ تمہارے بھائی ہیں جن کو خدا نے تمہارے ماتحت رکھا ہے، لہذا خدا نے جس کے ماتحت اس کے بھائی کو کیا ہو اس کو چاہیئے کہ اس کو وہی کھلائے جو خود کھائے، جو خود پہنے وہی اس کو پہنائے، اس کو ایسے کام کی تکلیف نہ دے جو اس کے لئے دشوار ہو اور اگر ایسے کام کی ذمہ داری سونپ ہی دے تو پھر اس کی مدد کرے (۱)

پیغمبر اسلام اور ان کے اصحابؓ کا اس ہدایت پر مکمل عمل تھا، ان کے غلام اور خدام ان کے ساتھ ہی وہی کھانا کھاتے تھے جو وہ خود کھاتے، غلاموں اور ان کے مالکوں کے کپڑے ایک ہی معیار کے ہوتے تھے۔ ایک بار ایک ہی قسم کی چادر حضرت ابو ذر غفاری اور ان کے غلام اوڑھے ہوئے تھے، ایک شخص نے عرض کیا آپ ایسا کیوں نہیں کرتے کہ وہ چادر بھی خود اوڑھ لیں تاکہ اس کا جوڑا ہو جائے اور غلام کو کوئی اور چادر دے دیں، حضرت ابو ذرؓ نے اس سے انکار کرتے ہوئے حضورؐ کی اسی ہدایت کا حوالہ دیا کہ جو خود پہنو وہی اس کو پہناؤ" (۲)

---

(۱) بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی۔

(۲) بخاری عن معرورؓ۔

اس سے معلوم ہوا کہ مزدوروں اور ملازمین کی اجرت اس قدر ہونی چاہیے کہ کم از کم خوراک اور پوشاک کے معاملے میں اس کا معیار زندگی مالکین اور افسروں کے مساوی اور یکساں ہو۔

دوسرے اجرت کی مقدار اتنی ہو کہ وہ اہل وعیال کی بھی اسی سطح پر پرورش کر سکے، حسب ضرورت خادم رکھ سکے اور مکان بنا سکے۔ آپؐ نے فرمایا جو شخص ہمارا عامل (ملازم) بنے اسے چاہیئے کہ بیوی حاصل کر لے، خادم نہ ہو تو ایک خادم رکھ لے اور مکان نہ ہو تو ایک مکان فراہم کر لے (۱) حضرت سیدنا ابو بکر صدیقؓ نے خلیفہ منتخب ہونے کے بعد فرمایا میرا ذریعۂ معاش میرے اہل وعیال کے لئے کافی تھا، اب میں مسلمانوں کے کام میں مشغول کر دیا گیا ہوں اس لئے ابو بکر کے عیال اسی سرکاری مال میں سے کھائیں گے اور ابو بکر مسلمانوں کے لئے کام کریں گے (۲)

اجرت کی ادائیگی

اُجرت کے سلسلے میں اس اصولی ہدایت کے بعد ــــ کہ ان کی جملہ ضروریات زندگی کی تکمیل کی جائے۔ اسلام نے یہ بھی حکم دیا ہے کہ اجرت کی مقدار پہلے ہی واضح کر دی جائے اور مبہم نہ رکھا جائے:۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نھی استجارۃ الاجیر حتی بین لہ اجرہ۔ (۳)	رسولؐ اللہ نے کسی مزدور سے کام لینے سے منع فرمایا ہے تاآنکہ اس کی اُجرت واضح کر دی جائے۔

(۱) ابوداؤد عن مستورد بن شدادؓ۔

(۲) بخاری عن عائشہؓ۔

(۳) السنن الکبریٰ للبیہقی۔

پھر آپؐ کا معمول تھا کہ کسی کو اس کی مزدوری کم نہ دیتے تھے (۱) آپؐ نے فرمایا تین شخص ایسے ہیں کہ قیامت کے دن میں ان کا دشمن ہوں گا، ان میں سے ایک وہ ہے جو کسی مزدور کو اجرت پر رکھے، اس سے پورا کام لے لے اور اجرت نہ دے۔ (رجل استاجر اجیرا فاستوفی منه ولم یعطه اجره) (۲)

مزدور کی اجرت جلد سے جلد ادا کر دینی چاہیے، آپؐ نے فرمایا کہ مزدور کی اجرت پسینہ خشک ہونے سے پہلے دے دو۔ (اعطوا الاجیر اجره قبل ان یجف عرقه) (۳)

فقہاء نے لکھا ہے کہ اجرت ادا کرنے کی تین صورتیں ہیں، یا تو خود آجر قبل از کام اجرت دے دے، یا مزدور نے پیشگی مزدوری دینے کی شرط لگا دی ہو۔ اب بھی اس کو کام سے پہلے ہی مزدوری دینی ہوگی یا مزدور اپنے کام کی تکمیل کر دے تو کام کی تکمیل کے ساتھ اجرت ادا کرنی ہوگی (۴)

کاموں کی مقدار

مزدور سے کتنا کام لیا جائے؟ اسلام نے اس کی بھی وضاحت کر دی ہے آپؐ نے فرمایا غلاموں سے کوئی ایسا کام نہ لو جوان کی طاقت اور قدرت سے ماورا ہو (۵) یہ ایک اصول ہے جس کی روشنی میں کام کی نوعیت، مقدار، اوقات تینوں ہی کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً اصولِ صحت کی رو سے جن کاموں کو روزانہ چھ گھنٹے

---

(۱) بخاری عن انسؓ۔

(۲) بخاری عن ابی ہریرۃؓ۔

(۳) ابن ماجہ، بیہقی۔

(۴) الفتاویٰ الہندیہ ۴/۵۰۶۔

(۵) موطا امام مالک عن یحییٰ بن یحییٰؓ۔

کیا جاسکتا ہے، ان ملازمین کے لئے یہی اوقات کار ہوں گے اور جو کام آٹھ گھنٹے کئے جاسکتے ہیں ان کے لئے روزانہ آٹھ گھنٹے کی ڈیوٹی ہوگی۔

عموماً بعض لوگ کم عمر بچوں یا دراز عمر بوڑھوں سے اتنا ہی کام لینا چاہتے ہیں جتنا جوان اور توانا آدمیوں سے۔ اسلامی تعلیم کے تحت یہ غلط اور ظالمانہ حرکت ہے جس پر قانون کے ذریعہ پابندی بھی عائد کی جاسکتی ہے، اسی طرح جو مستقل ملازمین ہیں، ضروری ہے کہ ان کے لئے ہفتہ میں ایک دن آرام کے لئے رکھا جائے، اپنے اقربار اور رشتہ داروں سے ملنے کے لئے تعطیل لازمی ہو اور بیماروں کے لئے خصوصی رخصتیں ہوں، فقہ کی کتابوں میں اس کی تصریح موجود ہے۔

حسنِ سلوک

مزدوروں کے ساتھ مالکین اور ذمہ داروں کا کیا سلوک ہونا چاہیئے؟ اس سلسلہ میں حضورؐ کا ارشاد ہے کہ وہ تمہارے بھائی ہیں (انھم اخوانکم) (۱) یعنی ان سے سلوک حاکمانہ نہیں بلکہ برادرانہ ہونا چاہیئے، قرآن میں حضرت شعیبؑ کی بحیثیت آجر یہ صفتیں بیان کی گئی ہیں:

ما ارید ان اشق علیك ستجدنی ان شاء اللہ من الصّالحین۔	میں تم کو تکلیف دینا نہیں چاہتا، انشاء اللہ تم مجھے صَالح و نیک پاؤ گے۔

(القصص)

گویا آجر کا سلوک مزدور کے ساتھ ایسا ہو کہ اس کو تکلیف اور کسی بھی طرح کی ذہنی، جسمانی یا عملی مشقت نہ دے اور اس کے ساتھ نیک سلوک روا رکھے۔ حضورؐ کی حیاتِ طیبہ میں ہمیں اس کا عملی نمونہ یوں ملتا ہے کہ حضرت انسؓ آپ کے

---

(۱) ردالمحتار ج ۳ ص ۳۸۰۔

خاص خدام میں تھے اور بچپن سے جوانی تک آپؐ کے ساتھ رہے مگر کبھی اس کی نوبت نہیں آئی کہ آپؐ نے اونہ بھی کہا ہو یا پوچھا ہو یہ کیوں کیا؟ اور یہ کیوں نہیں کیا؟ (۱) آپؐ کے خادموں میں ایک یہودی لڑکا تھا، وہ بیمار پڑا تو آپؐ اس کی عیادت کو تشریف لے گئے (۲) اسی حسنِ سلوک کا ایک حصہ یہ ہے کہ اگر کوئی مشکل کام اس کو سونپا جائے تو اس کی انجام دہی میں بذاتِ خود بھی مدد کرے (۳)

منافع میں شرکت

اسلام اس بات کو بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے کہ مزدور کاروباری نفع میں شریک ہوں، "مضاربت" کی اصل یہی ہے، مضاربت یہ ہے کہ ایک شخص کا سرمایہ ہے اور دوسرے آدمی کا عمل اور محنت۔ پھر اس سے جو نفع حاصل ہو اس کو باہم متعینہ تناسب مثلاً پچاس فی صد وغیرہ میں تقسیم کر دیا جائے، یہاں دوسرے فریق کو جو کچھ نفع مِل رہا ہے وہ عامل ہی کی حیثیت سے ہو گا۔ اس کی طرف اس حدیث میں بھی اشارہ موجود ہے جس میں آپؐ نے کھانا پکانے والے خادم کو کھانے میں سے کم ازکم ایک دو لقمہ کھلانے کی تلقین کی ہے (۴)

حقوق کا تحفظ

مزدوروں کے حقوق کے سلسلے میں اسلام نے صرف اخلاقی ہدایات ہی سے کام نہیں لیا ہے بلکہ اس کو قانونی تحفظ بھی بخشا ہے اور حکومت کے لئے مداخلت

---

(۱) بخاری و شمائل ترمذی عن انسؓ۔

(۲) بخاری پ۵ کتاب الصلوٰۃ۔

(۳) بخاری و مسلم۔ حدیث گذر چکی ہے۔

(۴) بخاری ابوداؤد، ترمذی۔

کی گنجائش رکھی ہے ۔ چنانچہ قاضی ابوالحسن ماوردی (م ۔ ۴۵۰ھ) "محتسب" کے فرائض پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں :

"اگر کوئی شخص مزدور و ملازم (اجیر) پر زیادتی کرے مثلاً اجرت کم دے یا کام زیادہ لے تو محتسب ایسا کرنے سے روکے اور حسب درجات دھمکائے اور اگر زیادتی اجیر کی طرف سے ہو مثلاً کام کم کرے اور اجرت زیادہ مانگے تو اس کو بھی روکے اور دھمکائے اور اگر ایک دوسرے کی بات کا انکار کریں تو فیصلے کا حق حاکم کو ہے ۔" (۱)

نقصانات کی ذمہ داری

سوال یہ ہے کہ مزدور یا ملازم سے کوئی چیز ضائع ہو جائے تو اس کا ضامن کون ہوگا ؟ ۔ اس سلسلہ میں تھوڑی تفصیل ہے ، مزدوری اور ملازمت کی دو صورتیں ہیں ، ایک یہ کہ معاملہ کی بنیاد کام ہو ، دوسرے یہ کہ معاملہ کی اساس وقت ہو ، پہلے کی مثال سلائی وغیرہ ہے کہ آپ کسی کو کپڑا سینے کو دیں ، یہاں وہ وقت کا پابند نہیں ہے بلکہ کام کا پابند ہے کہ کپڑا سی کر دے ، دوسرے کی مثال اس طرح ہے کہ کسی کو آپ مدرس مقرر کریں کہ وہ روزانہ پانچ یا چھ گھنٹے تعلیم دے ، یہاں وہ وقت کا پابند اور اس میں حاضری کا مکلف ہے چاہے طلبہ ہوں یا نہ ہوں اور پڑھانے کی نوبت آئے یا نہ آئے ، اسی طرح دن بھر کیلئے کسی مزدور کو مکان کی تعمیر کے لئے رکھا جائے ، یہاں وہ اس بات کا پابند ہے کہ وہ دن بھر اپنا وقت دے ۔

پہلے قسم کے ملازم کو "اجیر مشترک" اور دوسری قسم کے ملازم کو "اجیر خاص"

---

(۱) الاحکام السلطانیہ للماوردی (مترجم) ص ۳۹۹ باب ۲۰ ۔

کہتے ہیں، اجیر مشترک سے کوئی چیز ضائع ہو جائے تو وہ خود اس کا ضامن ہو گا۔ اور تاوان ادا کرے گا۔ اجیر خاص سے اس کی زیادتی اور ارادہ کے بغیر جو سامان ضائع ہو جائے وہ اس کا ذمہ دار نہ ہو گا (۱)

بندھوا مزدور

بندھوا مزدور کی ظالمانہ رسم باوجود اس تمدنی ارتقا اور علم و روشن خیالی کے اب بھی بعض علاقوں میں موجود ہے مگر اسلام میں اس کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ اسلام اس کو انسان کا خالص نجی مسئلہ تصور کرتا ہے کہ وہ کسی کا کام کرے یا نہ کرے، نہ صرف ایک فرد دوسرے فرد کو بلکہ حکومت بھی کسی فرد اور شہری کو اس پر مجبور نہیں کر سکتی سوائے اس کے کہ کبھی ایسے خصوصی حالات پیدا ہو جائیں کہ قومی اور اجتماعی مصلحت کے تحت افراد کو کسی عمل پر مجبور کرنا پڑے۔

یہی وجہ ہے کہ فقہاء نے نکاح، خرید و فروخت وغیرہ دوسرے معاملات کی طرح اس میں بھی طرفین کی رضامندی اور آمادگی کو ضروری قرار دیا ہے (۲) اسی طرح اسلام میں ہر شخص کو نقل و حرکت اور ایک جگہ سے دوسری جگہ آمد و رفت کی آزادی حاصل ہے اور یہ اس کا خالصۃً ذاتی اور شخصی مسئلہ ہے۔ وہ جہاں اور جس شہر و علاقہ میں جا کر مزدوری اور ملازمت کرنا چاہے کر سکتا ہے:

من یہاجر فی سبیل اللہ یجد فی الارض مراغماً کثیراً وسعۃ۔ (النساء)

مزدوروں کی ذمہ داریاں:

---

(۱) فتاویٰ عالمگیری ج ۳ ص ۵۵۵۔

(۲) واما رکنہا فالایجاب والقبول، الفتاویٰ الہندیہ ج ۴ ص ۴۰۰ کتاب الاجارۃ۔

۲ ل و حرام

جہاں مزدور اور ملازمین کے یہ حقوق ہیں وہیں ان کی ذمہ داریاں اور فرائض بھی ہیں جن کی طرف قرآن مجید نے دو مختصر لفظوں میں اشارہ کر دیا ہے۔ حضرت شعیبؑ نے حضرت موسیٰ کو جس بنیاد پر اپنا ملازم متعین کیا وہ ان کی صاحبزادی کی یہ اطلاع تھی کہ :

یاابت استاجرہ ان خیر من استاجرت القوی الامین ۔ (القصص)	ابا جان ان کو مزدور رکھ لیجئے، بہترین مزدور جسے آپ رکھیں گے وہ ہوگا جو طاقتور اور امانت دار ہو۔

یہاں اچھے مزدور کی دو صفات بیان کی گئی ہیں، ایک قوت و صلاحیت اور دوسرے امانت و دیانت۔ اس سے معلوم ہوا کہ اہلیت کے بغیر کسی کام کی ذمہ داری نہ لے، اس لئے فقہاء نے فاترالعقل طبیب (الطبیب الماجن) کو علاج سے روک دینے کا حکم دیا ہے (۱)

دوسرے یہ کہ وہ اپنے کام، ذمہ داریوں اور سونپی گئی اشیاء کے معاملہ میں امانت دار اور دیانت دار ہو، اگر مفوضہ کام میں وہ قصداً کوئی نقص رہنے دے یا متعینہ وقت کا اپنی ذمہ داریوں کے لئے پورا پورا استعمال نہ کرے تو یہ بات دیانت کے خلاف ہوگی، چنانچہ علماء نے لکھا ہے کہ

عدل کے ساتھ وزن کرو، میں یہ بھی داخل ہے کہ ملازمین اپنے اوقاتِ ملازمت کا پورا پورا خیال رکھیں (۲)

امانت میں یہ بھی داخل ہے کہ رشوت نہ لے، رشوت یہ ہے کہ اپنی مفوضہ ذمہ داریوں کی انجام دہی کا الگ سے پیسہ وصول کرلے، حضورؐ نے

---

(۱) الاشباہ والنظائر لابن نجیم ۔

(۲) معارف القرآن مصنفہ مفتی محمد شفیع صاحبؒ ۔

اس سے بڑی شدت سے منع فرمایا ہے، ارشاد ہے: رشوت لینے والا اور دینے والا دونوں ہی دوزخ میں ہیں (الراشی وَالمرتشی کلاهما فی النار) (۱) رشوت صرف وہی نہیں ہے جو رشوت کے نام پر لی جائے بلکہ وہ رقم بھی رشوت میں داخل ہے جو عام لوگ کسی کے عہدے سے متاثر ہوکر "ہدیہ" اور "نذر و نیاز" کے نام سے پیش کریں، رشوت کی یہ وہ قسم ہے جس میں اچھے خاصے دیندار لوگ بھی مبتلا ہیں، چنانچہ فرمایا جو شخص کسی کے لئے سفارش کرے، وہ اس کے لئے تحفہ بھیجے اور وہ اس کو قبول کرلے، اس نے بہت بڑا سود لیا ہے (۲) اور حضرت عمرؓ نے عاملوں کو ہدایا و تحائف بیت المال میں جمع کرنے کا حکم دیا تھا۔ اسی لئے فقہاء نے قاضی کے لئے فریقینِ مقدمہ سے ہدیہ قبول کرنے کو ناجائز قرار دیا ہے۔

ناجائز ملازمتیں

ایسی چیزوں کی ملازمت اور مزدوری جائز نہیں ہے جو معصیت اور گناہ ہو اس لئے کہ جس طرح گناہ کرنا جائز نہیں ہے اسی طرح گناہ کیلئے سبب اور ذریعہ بننا اور اس میں تعاون بھی ناجائز ہے اور جو جس درجہ کا گناہ ہو اس میں تعاون بھی اسی درجہ کا گناہ ہے۔ چنانچہ فقہاء لکھتے ہیں:

لایجوز الاستجار علیٰ شئ من الغناء والنوح والمزامیر ...... ولا اجر لهم فی ذلک (۳)	مزامیر، نوحہ زنی اور گانے بجانے وغیرہ کے کاموں پر کسی کو اجیر رکھنا درست نہیں ہے اور وہ اجرت کے حقدار نہیں ہوتے ہیں۔

---

(۱) طبرانی عن ابن عمروؓ۔

(۲) ابوداؤد عن ابی امامہؓ۔

(۳) عالمگیری ۴/۴۴۹، باب اجارۃ المعاصی۔

ظاہر ہے جب ان کاموں کے لئے ملازم رکھنا درست نہ ہوگا اور اگر کوئی شخص معاملہ طے ہو جانے کے بعد یہ کام کر ہی لے تو اجرت واجب نہ ہوگی تو خود کسی شخص کا ایسی ملازمت اختیار کرنا کیوں کر جائز ہوگا اور اس ملازمت کا فائدہ ہی کیا ہوگا جس پر کوئی مزدوری نہ ملے؟

اسی حکم میں سینما ہال کی ملازمت، گانے بجانے کے کام، انشورنس کی ایجنسی اور انشورنس اور بینک کی ایسی ملازمتیں ہیں جن میں سودی کاروبار لکھنا پڑے یا اس میں لین دین کرنا پڑے۔

عمر ملازمت کے درمیان سبکدوشی

ملازمت کے سلسلہ میں ایک اہم مسئلہ عمر ملازمت اور درمیان میں سبکدوشی اور معطلی کا ہے۔ یہاں یہ بات ذہن نشیں کر لیجیے کہ ملازمت کے احکام کا اصل مدار فریقین کا باہمی معاہدہ ہے اگر کسی ریاست کا قانون ہو کہ اس کے یہاں ملازم اپنی عمر کے ۵۵ یا ۵۸ سال تک ملازمت پر برقرار رہے گا تو یہ گویا ملازم اور حکومت کے درمیان ایک معاہدہ ہے کہ ملازم اپنی عمر اس حد تک پہنچنے تک کارگذار رہے گا اور حکومت اس کو اجیر رکھے گی۔

اب کسی معقول وجہ اور عذر کے بغیر دونوں ہی اس مدت کی تکمیل کے پابند ہوں گے، نہ حکومت کو اختیار ہوگا کہ وہ اسے معزول کر دے اور نہ ملازم کو حق ہوگا کہ بلاوجہ اور حکومت کی رضامندی کے بغیر اس کام سے سبکدوش ہو جائے چنانچہ فقہاء مکان کے کرایہ پر لگانے کے احکام ان الفاظ میں لکھتے ہیں:

لو قال اٰجرتك هذه الدار	اگر کوئی شخص یوں کہے، میں نے تم کو یہ مکان
سنة كل شهر بدرهم جاز	ایک سال کے لئے کرایہ پر دے دیا ہے، ہر ماہ

بالاجماع .... فلا یملك احدهما الفسخ قبل تمام السنة من غیر عذرٍ (۱)

کے بدلہ ایک درہم تو بالاتفاق جائز ہے، اور فریقین میں سے کوئی ایک سال کی تکمیل تک بلاعذر اس معاملہ کو توڑ نہیں سکتے۔

ہاں اگر کوئی عذر پیش آئے تو یک طرفہ اقدام کیا جا سکتا ہے مثلاً ملازم کی غیر قانونی اور مجرمانہ حرکتوں پر حکومت معزول کر سکتی ہے اور ملازم اپنی ناسازیٔ صحت وغیرہ کی بنا پر کام چھوڑ دینا چاہے تو چھوڑ سکتا ہے۔ یہ حکم جس طرح سرکاری محکموں کا ہے ایسے ہی پرائیویٹ اداروں کا ہے۔

مکان اور سواری کا اجارہ

شریعت میں جس طرح انسان سے اجرت پر کام لینا جائز ہے اسی طرح دوکان، مکان وغیرہ کو بھی اجرت پر لینا درست ہے اور خود حدیث سے ثابت ہے (۲) شریعت کے عام اصول اور اجارہ کے عمومی قواعد کے مطابق مکان کے کرایہ پر لینے کے لئے بھی ضروری ہے کہ کرایہ کی مقدار اور مدت متعین کر دی جائے، وہ اس میں کیا کرے گا، رہائش اختیار کرے گا یا کوئی دوسرا کام کرے گا اس کی تعیین ضروری نہیں، ہاں اگر مکان کو کسی ایسے غیر معمولی کام کے لئے استعمال کریں جس سے مکان کے تحفظ کو نقصان پہنچ سکتا ہو تو اس کی صراحت کر دینی ہوگی جیسے دھوبی، لوہار، آٹا پیسنے کی مشین، اس طرح کے کاموں کا ارادہ ہو تو پھر ضروری ہے کہ اس کی وضاحت کر دے۔ (۳)

---

(۱) فتاویٰ عالمگیری ۴/۵۰۸۔

(۲) دیکھئے مجمع الزوائد ۴/۱۱۱ باب فی اجارۃ المکان المبارک۔

(۳) البحر الرائق ۸/۱۰۹۔

اسی طرح سواری یا باربرداری کے لئے سواری کا کرایہ لینا بھی درست ہے فقہاء نے لکھا ہے کہ اس کے لئے سوار، اٹھایا جانے والا سامان، جہاں سے جہاں لے جایا جارہا ہو، اس کی تعیین وغیرہ ضروری ہوگی (۱)

فقہاء کے یہاں ان ساری وضاحتوں کا اصل مقصد ممکنہ نزاع اور اختلاف کا سد باب ہے۔ موجودہ زمانہ میں جو تیز رفتار سواریاں ہیں ان کے لئے جو قوانین اور قواعد ہیں، انہی کے مطابق معاملات ہوں گے، اس لئے کہ قانون کی وجہ سے اس کی حیثیت عرف کی ہوگئی ہے اور جو چیز عرف کے مطابق ہوتی ہے وہ نزاع واختلاف کا سد باب کرتی ہے۔

زرِ ضمانت:

آج کل صاحبِ مکان کرایہ دار سے کچھ رقم بطور زرِ ضمانت حاصل کرتے ہیں، ایسا اس لئے کیا جاتا ہے تاکہ کرایہ دار کے ضرر سے خود کو محفوظ رکھا جاسکے، یہ ایک طرح سے کرایہ کے ساتھ قرض کی شرط ہے جو رواج کی حیثیت اختیار کرچکی ہے اور اگر کوئی شرط رواج کا درجہ اختیار کرلے تو پھر وہ جائز اور درست ہو جاتی ہے (۲) اس لئے جائز ہے۔

پگڑی:

فی زمانہ شہروں اور قصبات میں کرایہ داری کے ساتھ پگڑی کا رواج بھی عام ہوگیا ہے۔ پگڑی کی کئی صورتیں ممکن ہیں:

۱۔ مالکِ مکان کا کرایہ دار سے پگڑی لینا۔

۲۔ پگڑی کے ذریعہ دوکان حاصل کرنے والے کرایہ دار کا خود مالکِ مکان

---

(۱) البحر الرائق ص: ۱۲۔

(۲) ہندیہ ۴/۴۴۲۔ تفصیل کے لئے جدید فقہی مسائل حصہ دوم دیکھی جائے۔

یا نئے کرایہ دار سے پگڑی وصول کرنا۔

۳۔ جس کرایہ دار نے پگڑی دیئے بغیر مکان حاصل کیا ہو اس کا مالکِ مکان یا نئے کرایہ دار سے پگڑی وصول کرنا۔

۱۔ پہلی صورت جائز ہے، مالکِ مکان پگڑی لے کر گویا کرایہ ہی کا ایک حصہ بعجلت وصول کرلیتا ہے اور کرایہ کا بقیہ حصہ ماہوار بالاقساط حاصل کرتا ہے اور ایسا کرنا جائز ہے، علامہ شامی نے اپنے زمانہ میں "خدمت" اور "تصدیق" کے نام سے کرایہ دار سے یکمشت کچھ رقم وصول کرنے کا ذکر کیا ہے جس کی نوعیت قریب قریب پگڑی ہی کی ہے[1]۔

۲۔ دوسری صورت بھی جائز ہے، دراصل حق ملکیت اور حق قبضہ دو مستقل حقوق ہیں جو مکان سے متعلق ہیں، کرایہ دار پگڑی ادا کرکے حقِ قبضہ خرید کرلیتا ہے اور حقِ ملکیت اصل مالک کا باقی رہتا ہے، اب یہ کرایہ دار اصل مالکِ مکان یا نئے کرایہ دار سے اسی حقِ قبضہ کی قیمت پگڑی کے نام پر وصول کرلیتا ہے۔ فقہاء کے یہاں ایسی نظیریں موجود ہیں کہ جن میں بعض حقوق کو قابلِ قیمت تسلیم کیا گیا ہے۔[2]

۳۔ تیسری صورت جائز نہیں جس کرایہ دار نے پگڑی کے بغیر مکان یا دکان حاصل کی ہے چوں کہ وہ صرف حقِ انتفاع کا مالک ہے حقِ قبضہ کا مالک نہیں اس لئے وہ خود مالکِ مکان یا نئے کرایہ دار سے پگڑی حاصل کرنے کا مجاز نہیں، اگر پگڑی نئے کرایہ دار سے حاصل کرتا ہے تو غصب کے حکم میں ہے اور خود مالکِ مکان سے لے تو رشوت ہے۔ اگر اس نے مکان یا دکان میں کوئی تعمیری اضافہ کیا ہے تب بھی وہ پگڑی لینے کا حقدار نہیں بلکہ صرف اس اضافہ کی مناسب قیمت وصول کرسکتا ہے، قانون ملکی گو اس کے حق اجارہ کو عام حالات میں ناقابلِ انفساخ قرار دیتا ہے لیکن چونکہ یہ قانونِ شرعی کے مغائر ہے اسلئے اس کا اعتبار نہیں[3]۔

---

(۱) رد المحتار ۴/۱۷۔

(۲) دیکھئے رد المحتار ۴/۱۵ وحموی علی الاشباہ "القاعدۃ السادسۃ"۔

(۳) تفصیل کیلئے دیکھئے قاموس الفقہ، دوم، مادہ "بدلِ خلو"۔ جدید فقہی مسائل، دوم ۲۰۵ – ۲۸۱۔

گیارہواں باب

آداب و اخلاق

اسلام خُدا کا آخری، محفوظ اور مکمل دین ہے جو انسانیت کی ہدایت و راستی اور اس کی دنیا و عقبیٰ کی فلاح و کامیابی اور سعادت و خوش بختی کا ضامن ہے، حفاظت و ہدایت اس کی خاص شان ہے۔ اس کا دستور اساسی قرآن مجید کی شکل میں اس طرح محفوظ ہے کہ بجائے خود ایک معجزہ ہے۔ جامعیت و ہمہ گیری اس کا خاص وصف ہے۔ زندگی کا کونسا گوشہ ہے جس کو اس کے خورشید ہدایت نے بے نور چھوڑا ہے؟ اور جہانِ رنگ و بو میں پیش آنے والا کونسا قضیہ ہے جس کی اس نے عقدہ کشائی نہیں کی؟

مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کی تعلیمات کو وسعت دی جائے تو وہ ایک وسیع و طویل کتاب ہے، وہ عقیدۂ و ایمان ہے۔ عبادت و بندگی ہے، خشیت و تضرع ہے، خدا کا ذکر ہے، آخرت کی فکر ہے، قانونِ معاشرت ہے، اصول معاملت ہے، نظام اجتماعی ہے، ضابطۂ عدل و قضا ہے، قواعد جرم و سزا ہے، تزکیۂ اخلاق ہے، حقوق الناس کی رعایت ہے۔ عورتوں کی کرامت کا راز ہے، مردوں کیلئے اپنی منصب شناسی

کا آئینہ ہے، بچوں کا محافظ ہے، جانوروں کیلئے پیامِ رحمت ہے، تہذیب و ثقافت اور تمدن کی معراج ہے، علماء کیلئے جولانگاہ علم و تحقیق ہے، عامیوں کے لئے سرچشمۂ ہدایت و توفیق ہے، صبح و شام کا خضرِ طریق اور روز و شب کا رہبرِ کامل ہے، سلطانی بھی ہے اور درویشی بھی، امارت بھی ہے اور محکومیت بھی، دولت و ثروت بھی ہے اور صبر و قناعت بھی، خلوت بھی ہے اور جلوت بھی ______ کونسی صنف و جنس ہے جو اس کی بارانِ رحمت سے محروم ہے اور کونسا گوشۂ زندگی ہے جو اسکی ہدایت و رہبری سے تاریک ہے؟۔

لیکن اس کی وسعت و ہمہ گیری کو سمیٹا جائے تو محض دو لفظوں "اسوۂ محمدی" سے عبارت ہے، آپ کے شب و روز، شام و سحر، خلوت و جلوت عبادت و معاشرت، معاملات و تعلقات ایک آئینہ ہیں۔ اس آئینے میں جس کی زندگی جتنی مکمل محسوس ہو وہ ایمان و اسلام کی کسوٹی میں اسی قدر پورا ہے، اسی کو قرآن نے لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ (الاحزاب: ۲۱) کہا اور اسی حقیقت کو شاعرِ حق شناس اقبال نے یوں کہا ؎

به مصطفیٰ برساں خویش را که دیں ہمہ اوست
اگر به او نه رسیدی تمام بولہبی ست

کتاب کے اس آخری باب میں اسوۂ محمدی کی چند جھلکیاں ہیں آداب و معمولات ہیں، اخلاقی ہدایات اور نقوشِ شام و سحر ہیں جو اہلِ ایمان کی چشمِ عقیدت کا سرمہ اور نگاہِ احترام کا سکون ہیں۔

صلی اللہ علیہ وسلم۔

گھر میں داخل ہونے کی اجازت

کسی کے گھر میں داخل ہوتے وقت واجب ہے کہ پہلے اجازت لی جائے، اسی کو حدیث میں "اِستیذان" کہا گیا ہے۔ قرآن مجید میں اس سلسلہ میں مفصل حکم موجود ہے:-

"اے اہل ایمان! اپنے گھروں کے سوا دوسروں کے گھروں میں اہل خانہ کو سلام کیے اور اجازت لئے بغیر نہ داخل ہو، یہ تمہارے حق میں بہتر ہے۔ امید کہ تم اس سے نصیحت حاصل کروگے، اگر وہاں کسی کو نہ پاؤ تب بھی جب تک اجازت نہ مِل جائے داخل نہ ہو اور اگر واپس ہوجانے کو کہا جائے تو واپس ہوجاؤ کہ یہی تمہارے لئے پاکیزہ ہے اور اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے باخبر ہے ——— ہاں ایسے مکان جو رہائشی نہ ہوں اور وہاں تمہارے سامان رکھے ہوں، میں بلا اجازت داخل ہوجانے میں بھی مضائقہ نہیں (تاہم یاد رکھو کہ) اللہ ان باتوں سے بھی واقف ہے جن کا تم اظہار کرتے ہو اور ان باتوں سے بھی جن کو (نہاں خانۂ دل میں) چھپا رکھے ہو۔" (نور ۲۷۔ ۲۹)

اس سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ جب بھی کسی کے گھر میں داخل ہوا جائے تو اجازت چاہی جائے اور اجازت چاہنے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے سلام کرے پھر داخلہ کی اجازت چاہے۔ آیت میں گو کہ پہلے "استیناس" یعنی اجازت چاہنے اور پھر سلام کا ذکر ہے مگر عربی زبان میں یہ عام بات ہے کہ کبھی کبھی عملی ترتیب کو نظر انداز کرتے ہوئے بھی الفاظ کا ذکر کردیا جاتا ہے۔ احادیث میں استیذان کا جو طریقہ مروی ہے اس میں پہلے سلام کا

ذکر ہے ـــــــــــــــ اس استیذان کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے جا کر سلام کرے پھر اپنا نام لے کے اندر آنے کی اجازت چاہے، چنانچہ آپ نے ایک صحابی کو اسی طرح اجازت لینے کا طریقہ ارشاد فرمایا (۱)۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری حضرت عمرؓ کے پاس گئے تو فرمایا یَستأذن ابو موسیٰ (ابو موسیٰ اجازت کا طالب ہے)۔

اجازت لیتے وقت نام کی وضاحت کر دینی چاہیئے تاکہ صاحبِ مکان کو اشتباہ نہ ہو۔ حضرت جابر بن عبد اللہ ایک مرتبہ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اجازت چاہی۔ آپؐ نے دریافت فرمایا کون صاحب ہیں؟ انہوں نے جواب دیا "اَنا" (میں)، آپؐ نے فرمایا اَنا اَنا کہنے سے کیا حاصل؟ اس سے کوئی پہچانا نہیں جاتا (۲)۔

اجازت لینے کی صورتیں

استیذان کا اصل مقصد اجازت چاہنا، اپنی آمد کی اطلاع دینا اور دوسروں کی آزادی میں خلل انداز نہ ہونا ہے، یہ مقصد جس طریقہ سے بھی حاصل ہو جائے استیذان کیلئے کافی ہو گا، مثلاً "بِل" بجا کر اپنا نام بتا دینا دَروازہ پر دستک دینا، شناختی کارڈ بھیج دینا۔ اس لئے کہ یہ ساری چیزیں اس مقصد کی تکمیل کر دیتی ہیں۔ البتہ دستک کی آواز اتنی تیز نہ ہو کہ لوگ ڈر جائیں، چنانچہ تفسیر قرطبی میں نقل کیا ہے کہ صحابہ حضورؐ کے دَروازے پر ناخنوں سے دستک دیتے تھے۔

---

(۱) ابوداؤد، باب فی الاستیذان۔

(۲) ترمذی، باب ماجاء فی التسلیم قبل الاستیذان۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر صاحب مکان ملاقات سے معذرت کردے تو کچھ ناگواری محسوس کیے بغیر واپس ہو جانا چاہیے، اسی طرح تین بار سلام کرنے اور اجازت چاہنے کے باوجود اگر جواب نہ آئے تو واپس ہو جانا چاہیے جیسا کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری نے حضورؐ سے نقل کیا ہے اور اس کی تائید حضرت ابوسعید خدری نے بھی فرمائی ہے (۱) البتہ یہ اور بات ہے کہ اسلامی اخلاق کا تقاضا ہے کہ بلا عذر ملاقاتوں سے معذرت نہ کی جائے۔

بعض خصوصی اوقات کے علاوہ جیسے صبح، دوپہر، شب والدین کے پاس بلا اجازت بھی جا سکتے ہیں، حضرت علی کی روایت ہے جو رسول اللہ کے پروردہ اور داماد تھے کہ میں جب رات کو حضورؐ کے پاس آتا تو آپؐ بطورِ اجازت کھنکار دیا کرتے (۲)

پردہ کی رعایت

اجازت لینے کا طریقہ یہ ہے کہ اس طرح نہ کھڑا ہو کہ اہلِ خانہ کی بے ستری ہو جائے بلکہ دائیں یا بائیں جانب کھڑا ہو، حضرت عبداللہ بن بُسر سے مروی ہے کہ جب حضورؐ کسی کے دروازے پر آتے تو سامنے کھڑے ہونے کی بجائے دائیں یا بائیں کھڑے ہو جاتے اور فرماتے السلام علیکم، السلام علیکم (۳)

اطلاع اپنے گھر میں بھی مستحب ہے:

(۱) ابوداؤد، باب کم مرۃ یسلم الرجل الخ۔
(۲) نسائی شریف عن ابن نجی، باب التنحنح فی الصلوٰۃ۔
(۳) سنن ابوداؤد، باب کم مرۃ یسلم الرجل فی الاستیذان۔

اس آیت میں دوسروں کے گھر میں داخل ہونے کیلئے استیذان کا حکم دیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ خود اپنے گھر میں جہاں اس کی بیوی ہو اجازت چاہنا ضروری نہیں مگر مستحب طریقہ یہ ہے کہ وہاں بھی بلا اطلاع نہ جائے بلکہ کھنکار کر یا قبل از وقت اس کی اطلاع کر کے جائے۔

پبلک مقامات کے احکام

اس آیت سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ استیذان ان گھروں کے لئے ہے جو رہائش گاہ کی حیثیت رکھتے ہوں، اس لئے کہ "بیت"، عموماً ایسے ہی مکان کو کہتے ہیں، وہ جگہیں جو کسی کی رہائش گاہ نہ ہوں بلکہ عام طور پر وہاں لوگوں کی آمدورفت ہوا کرے جیسے دفاتر، مدرسے، مسجدیں، یہاں آمد و رفت کی جا سکتی ہے سوائے اس کے کہ عام لوگوں کے آنے پر امتناع ہو۔

اسی طرح آیت میں "بیوتِ غیر مسکونہ" میں آنے کی اجازت دی گئی اس سے دراصل وہ جگہیں مراد ہیں جو کسی خاص فرد کی ملکیت نہ ہو بلکہ عام لوگوں کے استعمال کی ہوں، مسافر خانے، ویٹنگ روم، ریلوے اسٹیشن، بَس اسٹینڈ یہاں ہر شخص کو جانے کی اجازت ہوگی۔

ٹیلیفون کا حکم

اسی طرح استیذان کی فہرست میں بعض بزرگوں نے ٹیلیفون کو بھی رکھا ہے کہ ٹیلیفون کے ذریعہ بھی گویا ملاقات کی جاتی ہے اس لئے اگر طویل گفتگو کرنی ہو تو پہلے اجازت لے لینی چاہیئے۔

افسوس کہ استیذان جو ایک امر واجب ہے اور قرآن و حدیث میں

اس کی سخت تاکید آئی ہے یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص بلا اجازت تمہارے گھر میں جھانکے اور تو اس پر کنکری پھینکے یہاں تک کہ اس کی آنکھ جاتی رہے تو تم پر کوئی مؤاخذہ نہیں ہے (۱) ہمارے معاشرہ میں یہ مسئلہ یکسر غیر اہم ہو کر رہ گیا ہے۔

سلام

اسلام میں سلام کو بڑی اہمیت دی گئی ہے، قرآن مجید نے اس کو پیغمبرانہ عمل بتایا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے مہمانوں کو سلام کیا (۲) مسلمانوں کو ہدایت کی گئی کہ وہ گھر میں داخل ہوں تو سلام کریں (۳) اور سلام کیا جائے تو انہیں الفاظ میں یا اس سے بہتر الفاظ میں جواب دیں (۴) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے بعد سب سے پہلے ان کو جو حکم دیا گیا وہ یہی تھا کہ فرشتوں کو سلام کریں اور ان کا جواب سنیں، یہی سلام وجواب بنو آدم کیلئے ہوگا (۵)

ایک دفعہ آپؐ سے دریافت کیا گیا کہ اسلام کا سب سے بہتر عمل کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا، یہ کہ کھانا کھلاؤ اور ہر شناسا اور ناشناسا کو سلام کرو۔ (۶)

حضورؐ نے حقوق العباد سے متعلق جن سات باتوں کا حکم فرمایا ان میں سے

---

(۱) ترمذی، باب ما جاء فی الاستیذان

(۲) الذاریٰت — ۲۵۔

(۳) النور — ۶۱۔

(۴) النساء — ۸۶۔

(۵) بخاری ومسلم عن ابی ہریرہؓ، باب بدء السلام ۲/۹۱۹۔

(۶) حوالۂ سابق ۲/۹۲۱، بخاری ومسلم عن عبداللہ بن عمرو بن العاص۔

ایک یہ بھی ہے کہ سلام کو رواج دو (۱) اور آپ نے سلام کو باہم محبت اور میل جول بڑھنے کا باعث قرار دیا (۲) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ بسا اوقات صرف اس لئے بازار جایا کرتے تھے کہ راہ چلنے والوں اور ملاقاتیوں کو سلام کریں (۳)

سلام کے الفاظ

سلام کے منقول الفاظ اس قدر ہیں "السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ" جواب میں بھی "و" کے اضافہ کے ساتھ اتنا ہی منقول ہے "وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ"، چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو اسی حد تک سلام کا جواب دیا ہے (۴) ——————— امام نووی نے لکھا ہے کہ سلام میں چاہے ایک ہی شخص مخاطب کیوں نہ ہو، مگر "کم"، یعنی جمع کا صیغہ استعمال کرنا چاہیئے اور جواب دینے والے کو "و" کا اضافہ کرنا چاہیئے، یعنی "وعلیکم" (۵) بہتر طریقہ ہے کہ سلام کرتے ہوئے "برکاتہ"، تک پورا فقرہ ادا کیا جائے، چنانچہ ایک شخص حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور کہا "السلام علیکم"، پھر بیٹھ گئے، آپ نے فرمایا ان کے لئے دس نیکیاں دوسرے آنے والے نے اس کے ساتھ "ورحمۃ اللہ" کا اضافہ کیا، آپ نے

---

(۱) حوالہ سابق، بخاری ومسلم عن البراء بن عازب۔
(۲) مسلم، باب من حق المسلم للمسلم رد السلام ۲/۲۱۳، مسلم عن ابی ہریرہؓ۔
(۳) مؤطا امام مالکؒ عن طفیل بن ابی بن کعب۔
(۴) بخاری ومسلم عن عائشہؓ۔ باب من رد السلام فقال علیک السلام وقالت عائشہ وعلیہ السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، بخاری ۲/۹۲۴۔ (۵) ریاض الصالحین باب کیفیۃ السلام۔

ان کو بیس نیکیوں کا اور "وبرکاتہ" تک کہنے والوں کو تیس ۳۰ نیکیوں کا مستحق قرار دیا (۱)۔

سلام کے بعض آداب

سلام ایسی آواز میں کرنا چاہیئے کہ سونے والے جاگ نہ اٹھیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی معمول تھا (۲) ملاقات کے وقت سلام کرنا چاہیئے پھر اگر تھوڑا فصل بھی ہو یہاں تک کہ ایک دیوار اور کمرہ کا فصل آجائے تو بھی دوبارہ سلام کرنا چاہیئے (۳) کسی مجلس میں جائے تو اس وقت بھی سلام کرے اور واپس ہوتے وقت بھی بلکہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ واپسی کا سلام ابتدائی سلام سے زیادہ افضل ہے (۴)

سلام کے آداب میں یہ ہے کہ سوار پیادہ چلنے والے پر، پیدل چلنے والا بیٹھے ہوئے شخص کو اور تھوڑے لوگ زیادہ افراد کے مجمع کو سلام کریں (۵) اسی طرح گذرنے والے بیٹھنے والوں اور چھوٹے بڑوں کو سلام کرنے میں سبقت کریں (۶) لیکن اس کا یہ بھی مطلب نہیں کہ وہ سلام میں پہل نہ کریں تو دوسرے سلام کریں ہی نہیں بلکہ ہر شخص کو پہل کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

---

(۱) ابوداؤد، ترمذی، عن عمران بن حصین۔ باب ما ذکر فی فضل السلام ترمذی ۹۸/۲ باب کیف السلام ابوداؤد ۷۰۶/۲۔

(۲) مسلم عن مقداد۔

(۳) ابوداؤد عن ابی ہریرہؓ باب فی الرجل یفارق ثم یلقاہ یسلم علیہ ۷۰۶/۲۔

(۴) رد المحتار ۲۶۷/۵۔

(۵) بخاری عن ابی ہریرہؓ باب یسلم الراکب علی الماشی ۹۲۱/۲۔

(۶) حوالہ سابق۔

آپؐ نے فرمایا، لوگوں میں اللہ سے سب سے قریب وہ شخص ہے جو سلام میں پہل کرے[1] بالخصوص بچوں کو تو ازراہِ تربیت پہلے سلام کرنے کی تاکید کرنی چاہئے، آپؐ کا جب بھی بچوں سے گذر ہوتا ان کو سلام فرماتے (۲)۔

ایسا شخص جو علانیہ فسق و فجور میں مبتلا ہو، حوصلہ شکنی اور اصلاح کی غرض سے ان کو سلام نہیں کرنا چاہئے۔ اسی طرح جو کسی شرعی وجہ مثلاً نماز، تلاوت، خطبہ و اذان، احکام و مسائل کی تکرار وغیرہ یا کسی طبعی وجہ سے مثلاً کھانے کی وجہ سے سلام کا جواب دینے سے عاجز ہو تو اِن حالات میں سلام نہ کیا جائے اور کوئی شخص سلام کرے تو اس کا جواب دینا ضروری نہیں (۳) البتہ خیال رہے کہ کسی فاسق و فاجر کو سلام نہ کرنے کی وجہ سے تعلقات میں مزید تلخی اور امید اصلاح کی کم یا منقطع ہو جانے کا اندیشہ ہو تو ایسی صورت میں سلسلۂ سلام باقی رکھنا چاہیئے کہ اصل مقصود مفادِ دینی کی رعایت ہے۔

جماعت میں سے کسی ایک شخص کو سلام کرنا اور جواب دیدینا کافی ہے ضروری نہیں کہ سبھی الگ الگ سلام کریں اور جواب دیں (۴) ضرورتاً اشارہ سے سلام کرنا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے اس طرح کہ ساتھ ساتھ سلام کے الفاظ بھی کہے جائیں (۵) مگر عیسائیوں، یہودیوں کی طرح اشارہ سلام کے لئے استعمال کرنا درست نہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع

---

(۱) ابوداؤد، مسند احمد، ترمذی عن ابی حالہ، باب فی فضل من بدأ بالسلام ابوداؤد ۲/۷۰۶۔
(۲) بخاری و مسلم عن انس بن مالک باب التسلیم علی الصبیان بخاری ۲/۹۲۳۔
(۳) درمختار ۵/۲۶۷۔
(۴) ابوداؤد عن علی بن ابی طالب باب ماجاء فی رد الواحد عن الجماعۃ ۲/۷۰۸۔
(۵) ترمذی عن صہیب، باب ماجاء فی الاشارۃ فی الصلوٰۃ۔

۲۷
حلال و حرام

فرمایا ہے (۱) اسی میں ہندوؤں کی طرح ہاتھ جوڑنا بھی داخل ہے۔

خیر مقدمی کلمات

ملاقات کے موقعہ پر سلام کے علاوہ اگر کوئی اور خیر مقدمی کلمہ کہا جائے تو اس میں قباحت نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بعض مواقع پر اس طرح کا کلمہ کہنا ثابت ہے۔ فتح مکہ کے موقعہ پر حضرت ام ہانی اور حضرت عکرمہ کی آمد پر مرحبا کہتے ہوئے استقبال فرمایا ہے (۲) ہاں صبح بخیر، شب بخیر، گڈ مورننگ وغیرہ کے الفاظ مسنون طریقہ کے خلاف ہیں۔ ایام جاہلیت میں لوگ کہا کرتے تھے "انعم اللہ بك عیناً" (اللہ تم کو اپنی نعمت سے نوازے) اور "انعم صباحاً (صبح بخیر) اسلام کی آمد کے بعد اس سے منع کر دیا گیا (۳)

مصافحہ

مصافحہ ہاتھ سے ہاتھ ملانے کا نام ہے (۴) مصافحہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں میں سے ہے۔ آپؐ نے اس کو ملاقات کی تکمیل قرار دیا ہے (۵) خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول مبارک بھی مصافحہ کا تھا۔ حضرت ابو ذرؓ فرماتے ہیں کہ میری جب بھی آپؐ سے ملاقات ہوئی، آپؐ نے

---

(۱) ترمذی عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ، باب ما جاء فی کراہیۃ اشارۃ الید فی السلام ۹۹/۲

(۲) ترمذی کتاب الاستیذان باب ما جاء فی مرحبا۔

(۳) ابو داؤد عن عمران بن حصین ۷۰۹/۲۔

(۴) ھی الصاق صفحۃ الکف بالکف، مرقاۃ ۵۷۴/۴۔

(۵) ترمذی عن ابی امامۃ۔ باب ما جاء فی المصافحۃ۔

ضرور ہی مصافحہ فرمایا (۱) روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مصافحہ کی ابتدا سب سے پہلے اہلِ یمن نے کی ہے (۲) صحابہ کا بھی معمول باہم مصافحہ کرنے کا تھا (۳) اور کیوں نہ ہوتا کہ ارشاد نبویؐ ہے کہ دو مسلمان جب بھی باہم ملیں اور مصافحہ کریں تو الگ ہونے سے پہلے ان کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں (۴) ایک روایت میں یوں بھی ارشاد فرمایا گیا کہ مصافحہ باہمی کینہ و کدورت کو دور کرتا ہے (۵)

مصافحہ کا وقت آغاز ملاقات ہے، اس طور کہ پہلے سلام کیا جائے پھر مصافحہ (۶) اس موقعہ پر ایک دوسرے کو مغفرت کی دُعا دینے کی بھی تلقین فرمائی ہے (۷) یغفر اللہ لنا ولکم کہنا اسی فرمان کی تکمیل ہے۔

بعض نمازوں کے بعد جو خاص طور پر مصافحہ کا رواج ہو گیا ہے یہ بدعت اور مکروہ ہے، مشہور محدث اور فقیہ ملا علی قاری حنفی نے اس پر بڑی بصیرت افروز گفتگو فرمائی ہے، لکھتے ہیں:-

"فجر و عصر کے وقت لوگوں کے مصافحہ کا عمل مستحب و مشروع طریقے کے مطابق نہیں ہے۔ اس لئے کہ مصافحہ کا عمل آغازِ ملاقات ہے، ان نمازوں میں لوگ، بغیر مصافحہ کے باہم ملاقات کرتے ہیں، باہم گفتگو کرتے ہیں، علمی مذاکرہ کرتے ہیں اور ان سب چیزوں میں خاصا وقت گذارتے ہیں، پھر جب نماز

---

(۱) ابوداؤد عن ابی ذر باب فی المعانقہ۔

(۲) ابوداؤد عن انس بن مالک، باب فی المصافحہ ۲/۷۰۸۔

(۳) ترمذی عن انس بن مالک، باب ماجاء فی المصافحہ۔

(۴) حوالۂ سابق نیز ابوداؤد عن براء بن عازب، باب فی المصافحہ۔

(۵) مشکوٰۃ عن عطاء مرسلاً ۲/ باب فی المصافحہ والمعانقہ، الفصل الثالث۔

(۶) مرقاۃ ۴/۵۷۵۔ (۷) ابوداؤد، باب فی المصافحہ۔

پڑھ لیتے ہیں تو مصافحہ کرنے لگتے ہیں، اسی لئے ہمارے
بعض علماء نے صراحت کی ہے کہ اس وقت مصافحہ مکروہ ہے
اور حقیقت یہ ہے کہ وہ قبیح بدعتوں میں سے ہے، ہاں اگر
کوئی مسجد میں آئے، لوگ مصروف نماز ہوں یا نماز شروع ہی
کیا چاہتے ہوں پھر نماز سے فراغت کے بعد آنے والا شخص
پہلے ان کو سلام کرے پھر مصافحہ ——— تو یہ بلا شبہ
مسنون مصافحہ ہوگا۔ تاہم اس کے باوجود اگر کوئی مسلمان
مصافحہ کیلئے ہاتھ بڑھائے تو ہاتھ کھینچنا نہ چاہیئے کہ اس
میں ایک مسلمان کو ایذاء پہونچانا ہے جو رعایت ادب سے
بڑھ کر ہے ——— حاصل یہ کہ اس وقت مروجہ
طریقہ پر مصافحہ کی ابتداء تو مکروہ ہے مگر بد خلقی (مجابرہ)
مناسب نہیں"(۱)۔

مصافحہ ایک ہاتھ سے ہو یا دو ہاتھ سے؟ یہ اتنی اہم بات نہیں جتنی اہمیت کہ لوگوں نے دے رکھی ہے۔ حدیث میں زیادہ تر "ید" ہاتھ کے الفاظ آئے ہیں جو عربی قاعدہ کے لحاظ سے واحد ہونے کی وجہ سے ایک ہاتھ کو بتاتا ہے مگر زبان کا ایک محاورہ یہ بھی ہے کہ کبھی ہاتھ بول کر دونوں ہاتھ، پاؤں بول کر دونوں پاؤں اور آنکھ بول کر دونوں آنکھیں مراد لی جاتی ہیں۔ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کی روایت موجود ہے کہ میرا ہاتھ حضورؐ کے دونوں ہاتھوں کے درمیان تھا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ معمولِ مبارک دو ہاتھوں سے مصافحہ کا بھی تھا اسلئے صحیح یہی ہے کہ دونوں طرح

---

(۱) مرقاۃ ۴/۵، ۷۵، باب المصافحہ والمعانقہ۔

مصافحہ کیا جاسکتا ہے، اس میں شدت نہ کرنی چاہیئے۔

معانقہ :

ملاقات کے موقعہ سے معانقہ یعنی گلے لگانا بھی آپؐ سے ثابت ہے۔ حضرت ابوذر سے مروی ہے کہ میرے یہاں حضورؐ نے اطلاع بھیجی، میں گھر پر موجود نہ تھا، آیا تو خبر ہوئی اور حاضرِ خدمت ہوا۔ آپؐ اپنی چارپائی پر تھے آپؐ نے مجھے چمٹالیا (۱) فتح خیبر کے موقع سے جب زید بن حارثہ مدینہ پہنچے تو آپ مارے خوشی کے بے تابانہ اٹھے اور ان کو گلے لگایا اور چوما (۲) اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک قابلِ لحاظ مدت کے بعد ملاقات ہو تو اظہار محبت کے لئے معانقہ بھی کیا جاسکتا ہے، معانقہ محض گلے لگانے کا نام ہے۔ ہمارے یہاں تین بار جو معانقہ کا رواج ہے وہ صحیح نہیں، اسی طرح نماز عیدین کے بعد جو معانقہ کا رواج سا ہوگیا ہے وہ اسی طرح اور انہی وجوہ کی بنا پر ——— جو فجر و عصر کے بعد مصافحہ کے سلسلہ میں ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے ——— مکروہ ہے، ہاں اگر کوئی معانقہ کیلئے آگے بڑھے تو تشدد بھی نہ برتا جائے کہ جیسا کہ مذکور ہوا یہ ایک مسلمان کے لئے ایذاء اور ہتک کا باعث ہوگا۔

احتراماً کھڑا ہونا

شخصیات کے احترام میں بہت مبالغہ اسلام میں پسند نہیں، اسی بناء پر آپؐ نے تعظیماً کھڑے ہونے کو پسند نہیں فرمایا، ایک بار آپؐ تشریف لائے

---

(۱) ابوداؤد، باب فی المعانقۃ۔

(۲) ترمذی باب ماجاء فی المعانقۃ والقبلۃ۔

اور صحابہ کھڑے ہو گئے تو فرمایا کہ یہ عجمیوں کا طریقہ ہے، اس طرح کھڑے نہ ہوا کرو (۱) لیکن اس کو ایک مستقل رسم اور رواج بنائے بغیر کبھی جوشِ محبت میں کھڑا ہو جائے تو مضائقہ نہیں۔ حضرت عائشہؓ راوی ہیں کہ حضرت فاطمہؓ جب تشریف لاتیں تو آپؐ ان کے لئے کھڑے ہوتے، یہی عمل حضرت فاطمہؓ کا آپؐ کے ساتھ تھا (۲) غزوۂ بنو قریظہ کے موقع سے جب حضرت سعدؓ بحیثیتِ حکم تشریف لائے تو خود آپؐ نے صحابہؓ سے کھڑے ہونے کو کہا قوموا الیٰ سیدکم (۳) —— لیکن کسی شخص کے اندر اس خواہش کا پیدا ہو جانا کہ لوگ اس کے لئے کھڑے ہوں اور لوگ کھڑے نہ ہوں تو اس کا برا ماننا، سخت مذموم اور ناپسندیدہ ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ ایسا شخص جہنم کو اپنا ٹھکانہ بنا رہا ہے (۴) افسوس کہ بعض خانقاہوں اور مشائخ نے اس کو اپنے آداب میں داخل کر لیا ہے ؏

چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی؟

بوسہ :

بعض اوقات انسان ملاقات کے وقت پاکیزہ جذبات کے ساتھ جوشِ محبت میں بوسہ لے لیتا ہے، اس طرح کا عمل بعض اوقات حضورؐ سے بھی ثابت ہے، فقہاء نے احادیث اور شریعت کے اصول کو سامنے رکھ کر اس سلسلہ میں احکام مقرر کئے ہیں :۔

---

(۱) ابوداؤد عن ابی امامہ، باب الرجل یقوم للرجل یعظمہ بذلک۔

(۲) ابوداؤد، باب فی القیام۔

(۳) حوالۂ مذکور۔

(۴) ابوداؤد، باب الرجل یقوم للرجل۔

بڑوں کے بوسہ کے سلسلہ میں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ غیر محرم مرد و عورت کے لئے تو ایک دوسرے کا بوسہ ناجائز ہے ہی، ایک مرد کے لئے دوسرے مرد کا یا ایک عورت کے لئے دوسری عورت کا بوسہ لینا عام حالات میں درست نہیں ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ ایک دوست اپنے دوست یا بھائی سے ملے تو کیا اس کے لئے جھکے، آپؐ نے فرمایا: نہیں، پھر پوچھا گیا کہ کیا اس سے چمٹے اور بوسہ لے؟ تو آپؐ نے اس سے بھی منع فرمایا، پھر ہاتھ پکڑنے اور مصافحہ کرنے کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپؐ نے اس کی اجازت دی (۱)۔

اسی لئے امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک عام حالات میں اس کو مکروہ قرار دیا گیا ہے، چنانچہ علامہ کاسانی فرماتے ہیں: معانقہ اور بوسہ کے سلسلہ میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ امام ابو حنیفہ کے یہاں ایک شخص کیلئے دوسرے شخص کے چہرہ یا ہاتھ یا کسی حصۂ جسم کا بوسہ لینا مکروہ ہے اور امام ابو یوسف کے نزدیک کچھ مضائقہ نہیں (۲)

البتہ جہاں شہوت کا کوئی اندیشہ نہ ہو وہاں گنجائش ہے، چنانچہ ایک دفعہ باہر سے حضرت زید بن حارثہ کی مدینہ واپسی پر فرط مسرت میں آپؐ نے ان سے معانقہ کیا اور بوسہ دیا، اسی طرح وفد عبد القیس آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا تو شرکاء وفد نے آپ کے دست و پائے مبارک کا بوسہ لیا (۳)

---

(۱) ترمذی عن انس، باب جاء فی المعانقۃ والقُبلۃ ۲/۱۰۲۔

(۲) بدائع الصنائع ۵/۱۲ کتاب الاستحسان۔

(۳) ابوداؤد، باب قبلۃ الرجل ۲/۷۰۹۔

اسی طرح محرم بالغ رشتہ داروں کا بوسہ لینا بھی اس وقت جائز نہ ہوگا جب شہوت کا اندیشہ یا احتمال ہو، ہاں جہاں اس کا کوئی احتمال نہ ہو وہاں اجازت ہوگی، چنانچہ آنحضورؐ حضرت فاطمہؓ کا اور حضرت فاطمہؓ حضورؐ کا بوسہ لیا کرتی تھیں (۱)، ایک دفعہ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کو بخار تھا حضرت ابوبکرؓ باہر سے آئے، آکر مزاج پرسی کی اور صاحبزادی کے رخسار کا بوسہ لیا(۲)۔

عیادت :

صحت اور بیماری انسان کا ازلی ساتھی ہے، بیماری انسان کو خدا کی بے پناہ قدرت بھی یاد دلاتی ہے اور صحت جیسی عظیم نعمتِ الٰہی پر شکر کے جذبات اور امتنان کے احساسات بھی پیدا کرتی ہے، بعض اوقات بیماریاں بھی صحت کی ضمانت ہوتی ہیں اور اس میں آخرت کا نفع بھی ہے۔ ارشادِ نبویؐ ہے کہ مؤمن کو ایک کانٹا بھی چبھے اور وہ اسے صبر و رضا کے ساتھ برداشت کرے تو اللہ اس کا ایک درجہ اونچا کر دیتے ہیں (۳) صحت وشفا کی کلید چوں کہ خدا نے اپنے ہی ہاتھ میں رکھی ہے اس لئے اس سے توحید کا استحضار ہوتا ہے، واذا مرضتُ فھو یشفینِ (شعراء — ۸۰)

بیمار شخص کو اسلام رحم اور محبت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور لطف و کرم کا حقدار قرار دیتا ہے۔ قرآن مجید نے بیماری کو بعض فرائض و واجبات کی معافی کے لئے ایک عذر کی حیثیت سے تسلیم کیا ہے (نور: ۶، توبہ: ۹) اسی لئے آپؐ نے عیادت کو بڑے ثواب و اجر کا باعث فرمایا ہے اور اس

---

(۱) بدائع ۵/۱۲۔

(۲) ابوداؤد عن البراء، باب قبلۃ الخد ۲/۷۰۹۔

(۳) ترمذی، کتاب الجنائز، باب فی ثواب المریض۔

کی تلقین کی ہے، ایک روایت میں ہے کہ کوئی شخص بیمار کی عیادت کرے تو خدا کو اس کے پاس پائے گا (۱) بیمار کی عیادت اور مزاج پرسی کو آپؐ نے ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر حق قرار دیا (۲) ایک دفعہ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ ایک مسلمان جب دوسرے مسلمان کی عیادت کرتا ہے تو گویا وہ جنت کے نخلستان میں ہوتا ہے (۳)

آپؐ نے عیادت کے آداب بھی بتائے، دایاں ہاتھ مریض پر رکھے اور یوں دعا پڑھے:

اَللّٰھمّ رب الناس اذھب الباس اشف انت الشافی لاشافی الا انت، شفاءً لایغادر سقماً۔ (۴)	اے اللہ! آپ تمام لوگوں کے پالنہار ہیں، مرض دور فرما دیجیے اور شفا دیجیے کہ آپ ہی شافی ہیں اور ایسی شفا نصیب فرمائیے کہ اسکے بعد مرض کا حملہ نہ ہو۔

یہ دعا بھی دیتے:

لا بأس، طھور ان شاء اللہ۔ (۵)	بیماری سے گھبراؤ نہیں، انشاء اللہ یہ تمہارے لئے خطاؤں کا کفارہ اور پاکی کا ذریعہ ہوگی۔

ایک صاحب کو آپؐ نے درد کی حالت میں درد کے مقام پر ہاتھ رکھ کر تین بار بسم اللہ اور

سات بار اعوذ بعزۃ اللہ وقدرتہ من شر ما اجد واحاذر پڑھنے کی تلقین کی (۶)۔	میں اللہ تعالیٰ کی عزت اور اسکی قدرت کی پناہ چاہتا ہوں ان تمام چیزوں کے شر سے جو موجود ہیں اور جن کا اندیشہ ہے۔

---

(۱) مسلم عن ابی ہریرۃ۔ (۲) ابن ماجہ عن علی باب ماجاء فی ثواب من عاد مریضاً۔
(۳) ترمذی باب ماجاء فی عیادۃ المریض۔ (۴) ترمذی باب ماجاء فی التعوذ للمریض۔
(۵) بخاری عن ابن عباس باب عیادۃ الاعراب (۶) مسلم عن عثمان بن ابی العاص۔

مسلمان فاسق ہو تب بھی اس کی عیادت کی جائے بلکہ چونکہ یہ ایک انسانی ہمدردی کا مسئلہ ہے اس لئے کافر کی عیادت بھی کی جانی چاہیئے کہ اس سے اسلام کے اخلاق حسنہ کا اظہار ہوتا ہے اور یہ اسلام کی طرف ایک خاموش دعوت ہے (۱)

اظہارِ غم کا طریقہ

کسی شخص کی موت پر غم وافسوس فطری بات ہے، شریعت نے ایک طرف اظہار غم کی اجازت بھی دی ہے اور دوسری طرف خدا کی تقدیر اور فیصلہ پر راضی رہنے کو واجب قرار دیا ہے، بے تکلف رونا آجائے اور بے ساختہ آنکھیں اشکبار ہو جائیں تو مضائقہ نہیں کہ خود پیغمبر اسلام ؐ سے اپنے صاجزادہ حضرت ابراہیم رضؓ کے وصال پر اشکبار ہونا منقول ہے (۲) لیکن رونے میں اس درجہ مبالغہ کہ نوحہ کے درجہ کو پہونچ جائے، انسان خدا سے شکوہ سنج ہو جائے، کپڑے پھاڑنے لگے، رخسار وغیرہ پیٹنے لگے متوفی کے اوصاف وکمالات میں مبالغہ کیا جائے، وغیرہ ممنوع ہے (۳)

اسلام سے پہلے لوگ مدتوں متوفی کی موت پر قائم کناں رہتے تھے، اسلام نے جہاں سوگ میں اعتدال کا حکم دیا وہیں اس کیلئے مدت کی تحدید بھی کر دی ہے، فرمایا کہ سوائے بیوی کے جو اپنے شوہر کی وفات پر چار ماہ دس دنوں سوگ کرتی ہے کسی کے لئے کسی کی موت پر تین دنوں

---

(۱) البحر الرائق ۸/۲۰۴۔

(۲) ترمذی، باب ماجاء فی الرخصۃ فی البکاء علی المیت۔

(۳) دیکھیئے: ترمذی، باب ما جاء فی النہی عن ضرب الخدود والخ، وباب ما جاء فی کراہیۃ النوح۔

سے زیادہ سوگواری کی اجازت نہیں (۱) غزوۂ موتہ (۹ھ) میں حضرت جعفر شہید ہو گئے، مدینہ اس کی خبر پہنچی تو حضرت جعفر کے یہاں اس کا اثر بڑا فطری تھا۔ آپؐ نے اس موقع سے ان کے خاندان کے لئے کھانا بھیجنے کی ہدایت فرمائی کہ اس غم نے ان کے دل و دماغ کو مشغول کر رکھا ہے (۲) چنانچہ اہل علم نے میت کے گھر کھانا بھیجنے کو مستحب قرار دیا ہے (۳)

حالتِ عدت میں عورت کو اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ وہ تزئین و آرائش سے گریز کرے لیکن دوسرے اقرباء اپنے کسی عزیز کی موت پر اظہار غم و افسوس کا یہ طریقہ بھی اختیار نہ کریں (۴)

تعزیت :

غم کے موقعہ سے تسلّی و تسکین اور پرسہ و دلدہی کی ضرورت ہوتی ہے، اس سے بے قراری کو قدرے قرار اور بے سکونی کو سکون میسر ہوتا ہے۔ ارشادِ نبویؐ ہے کہ جو شخص کسی مصیبت زدہ کی تعزیت کرے، اس کو بھی اتنا ہی اجر ہے جتنا خود اس مصیبت زدہ شخص کو صبر و شکیب پر (۵) ایک روایت میں ہے کہ جس نے بچہ کی موت پر ماں کی تعزیت کی اس کو جنت میں چادر عطا کی جائے گی (۶)

تعزیت کے موقعہ سے ان الفاظ میں دُعا دی جانی چاہیے :-

---

(۱) ترمذی، باب ماجاء فی عدۃ المتوفی عنہا زوجہا۔

(۲) ابوداؤد، باب صنعۃ الطعام لاہل المیت۔

(۳) ترمذی، باب ماجاء فی الطعام یصنع۔

(۴)

(۵) ابن ماجہ، باب ماجاء فی ثواب من عزّیٰ مصاباً۔

(۶) ترمذی، باب آخر فی فضل التعزیۃ۔

اعظم اللہ اجرك واحسن	اللہ تعالیٰ بہتر اجر عطا فرمائے اور بہتر طور
عزاءك رحم میتك واکثر	پر غم کو دور کر دے، میت پر رحم فرمائے
عددك (۱)	اور تمہاری تعداد میں اضافہ کرے۔

کسی غیر مسلم کی موت ہو جائے تو اس طرح کلماتِ تعزیت کہے جائیں:

اخلف اللہ علیك خیراً	اللہ تعالیٰ تجھ پر کسی بہتر آدمی کو اس کا جانشیں
منه واصلحك ورزقك ولداً	بنائے تیری اصلاح کرے اور تجھے مسلمان
مُسْلماً۔ (۲)	اولاد عطا فرمائے۔

چھینک اور جمائی

آپ نے چھینک اور جمائی کے آداب بھی بتائے، چھینک کو آپ نے بہتر سمجھا ہے کہ یہ چستی اور نشاط کی علامت ہے، جمائی کو ناپسند کیا ہے کہ اس سے سستی و کاہلی کا اظہار ہوتا ہے ——— چھینک آئے تو چہرہ پر ہاتھ یا کپڑا رکھے اور آواز ہلکی رکھنے کی سعی کرے (۳) جس شخص کو چھینک آئے "الحمد للہ" کہے (۴) بعض روایات میں "الحمد للہ علیٰ کلِّ حالٍ" کے الفاظ آئے ہیں (۵) ایک روایت میں آپ نے "الحمد للہ ربّ العالمین" کہنے کو ارشاد فرمایا (۶) سننے والا جواب میں "یرحمک اللہ" (اللہ تجھ پر رحم کرے) کہے۔ (۷)

---

(۱) البحر الرائق ۸/۲۰۴۔ (۲) حوالۂ مذکور۔

(۳) ترمذی، باب ماجاء فی خفض الصوت الخ۔

(۴) مسلم عن ابی ہریرۃ رضؓ، باب تشمیت العاطس وکراہۃ التثاؤب۔

(۵) ترمذی عن ابی ایوب، باب ماجاء کیف تشمیت العاطس۔

(۶) ترمذی، عن سالم بن عبید، حوالۂ مذکور۔

(۷) ترمذی، عن ابی ایوب، حوالۂ مذکور۔

عام طور پر حضورؐ نے اتنی ہی تلقین فرمائی ہے۔ بعض روایات میں اس کے جواب میں پھر چھینکنے والے کو بھی بعض فقرے کہنے کی ہدایت دی ہے۔ حضرت ابوایوب سے مروی ہے کہ "یھدیکم اللّٰہ ویصلح بالکم" (اللہ تجھے ہدایت دے اور تمہارے حالات درست کرے) کہے اور سالم بن عبید سے روایت ہے کہ "یغفر اللّٰہ لنا ولکم" (اللہ ہم کو اور تم کو معاف فرمائے) کے الفاظ کہے جائیں (۱) ـــــــــ الفاظ و تعبیرات کا یہ اختلاف کوئی تضاد کے قبیل کی بات نہیں ہے، منشاء نبویؐ یہ ہے کہ ان الفاظ ماثورہ میں سے کسی طرح بھی کلمۂ تحمید کہا جائے اور جواب دیا جائے، کافی ہے لیکن ان کے بجائے اپنی طرف سے کسی مضمون کا اضافہ نہ کرے، ایک صاحب کو چھینک آئی، انہوں نے جواب میں کہا "السّلام علیك" آپؐ نے اس پر ایسی تعبیر میں جواب دیا جو ناپسندیدگی کا مظہر تھا، فرمایا: "علیك وعلیٰ امّك" (۲)۔ حضرت ابن عمرؓ کے سامنے ایک چھینکنے والے نے "الحمد للّٰہ" کے ساتھ "والسّلام علیٰ رسولِ اللّٰہ" کا اضافہ کر دیا تو آپؓ نے فرمایا کہ درود ہم بھی آپؐ پر بھیجتے ہیں مگر اس موقع سے ہمیں اس کی تعلیم نہیں دی گئی (۳)

تین بار تک چھینک کا جواب دیا جائے اس کے بعد دینا مستحب نہیں (۴) بعض اوقات ایک چھینک کا جواب دینے کے بعد دوسری اور تیسری بار آپؐ نے جواب نہیں دیا اور فرمایا کہ اس شخص کو زکام ہے (۵)

---

(۱) دیکھئے: ترمذی، باب ما جاء کیف تشمیت العاطس۔

(۲) ترمذی، حوالۂ مذکور، یہ فقرہ اصل میں مخاطب کی نادانی اور حمق کے اظہار کیلئے بولا جاتا ہے، مرقاۃ ۴/۵۹۳۔ (۳) ترمذی، باب ما یقول العاطس الخ۔

(۴) ترمذی، باب ما جاء کم یشمت العاطس عن یزید بن عبد الرحمٰن عن امہ عن ابیہا۔

(۵) حوالۂ سابق۔

چھینک کا جواب بعض اہلِ علم کے نزدیک فرضِ عین اور امام شافعیؒ کے نزدیک سنت ہے۔ لیکن عام فقہاء فرضِ کفایہ کہتے ہیں۔ مجلس سے ایک شخص نے جواب دیا تو سب کی طرف سے کفایت ہو جائے گی (۱) مناسب ہے کہ چھینکنے والا "الحمد للہ" ایسی آواز میں کہے کہ دوسرے لوگ سُن سکیں (۲) خود چھینکنے والے کا "الحمد للہ" کہنا بالاتفاق واجب نہیں، مستحب ہے (۳) یا سلام کی طرح مسنون، اگر کسی غیر مسلم کو چھینک آئے اور وہ "الحمد للہ" کہے تو جواب میں "یھدیکم اللہ ویصلح بالکم" (اللہ تم کو ہدایت دے اور تمہارے حالات بہتر کرے) کہنا چاہیئے، آپؐ سے بعض یہود کو اسی طرح جواب دینا ثابت ہے (۴) ______ جمائی آئے تو ممکن حد تک روکنے کی سعی کرے (۵) اور مُنہ پر ہاتھ رکھ لے (۶) کہ جمائی کی حالت میں مُنہ بدہیئت نظر آتا ہے۔

گفتار :-

گفتگو میں سب سے زیادہ جس بات کی تاکید کی گئی ہے وہ ہے سچائی اور راست گوئی اور سب سے زیادہ جس چیز کی مذمت کی گئی وہ ہے جھوٹ اور کذب بیانی، آپؐ نے سچائی کا انجام جنت اور جھوٹ کا دوزخ کو قرار دیا ہے (۷) قرآن مجید نے سیدھی سچی بات کو اعمال کی

---

(۱) مرقاۃ ۵۹۰/۴ (۲) حوالۂ مذکور۔
(۳) فتح الباری ۶۰۲/۱۰، باب الحمد للعاطس۔
(۴) ترمذی، عن ابی موسیٰ، باب ما جاء کیف تشمیت العاطس۔
(۵) بخاری عن ابی ہریرۃ، باب اذا تثاءب فلیضع یدہ علی فیہ۔
(۶) مسلم عن الخدری۔ باب تشمیت العاطس وکراہۃ التثاؤب۔
(۷) بخاری ومسلم عن عبداللہ بن مسعود، مشکوٰۃ ب حفظ اللسان۔

درستی اور گناہوں کی معافی کی ضمانت قرار دیا ہے (احزاب: ۱۲) اس لئے کہ انسان جو کچھ بولتا ہے دنیا میں تو وہ رنگ لاتا ہی ہے، آخرت کے لئے بھی اس کے یہ بول محفوظ ہو جاتے ہیں اور دراصل ہر وقت اس کے قول و فعل کا نگراں اس کے پاس ہی موجود رہتا ہے (ق : ۲) اسی طرح ایسی گفتگو جو بے مقصد اور لایعنی ہو ناپسندیدہ اور مذموم ہے اور یہ ایسی بات ہے کہ اس پر اس کو خدا سے مغفرت کا طلبگار ہونا چاہیئے۔ روایت میں ہے کہ بہترین مسلمان ہونے کی پہچان لایعنی باتوں کا چھوڑنا ہے (۱) اسی طرح ایک روایت میں آپؐ نے خاموشی کو نجات کی ضمانت قرار دیا ہے (۲) چنانچہ آپؐ نے فرمایا کہ کسی مجلس میں لایعنی کلام کی کثرت ہو جائے تو اٹھنے سے پہلے یہ دُعا پڑھ لے :-

سبحانك اللهم وبحمدك	اللہ کی ذات پاک اور قابلِ تعریف ہے
اشهد ان لا اله الا انت	میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ کے سوا کوئی
استغفرك واتوبُ اليك۔	معبود نہیں، آپ سے مغفرت کا طلبگار
(۳)	ہوں اور توبہ کرتا ہوں۔

گفتگو کے آداب میں سے یہ بھی ہے کہ نرم گفتگو کی جائے اور درشت کلامی سے پرہیز کیا جائے۔ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کو جب فرعون کے پاس دعوتِ ایمان دینے کے لئے بھیجا گیا تو خاص طور پر نرم گوئی کی ہدایت کی گئی (طٰہٰ : ۲) گفتگو میں بے ضمیری، تملق و خوشامد اور اپنے نفس کی اہانت روا نہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ کوئی شخص تعریف

---

(۱) مالک عن لقمان باب ماجاء فی الصدق والکذب۔
(۲) ترمذی عن عبداللہ ابن عمرو بحوالۂ مذکور۔
(۳) ترمذی عن ابی ہریرۃ۔

کرے تو اس کے چہرہ پر خاک پھینک دو (۱) مقصود مبالغہ آمیز تعریف کرنے والوں اور خوشامد کرنے والوں کی حوصلہ شکنی ہے۔

گفتگو میں تکلف اور چبا چبا کر باتیں کرنا، اس کو بھی آپؐ نے ناپسند فرمایا اور آپؐ نے ایسا کرنے والے کو اللہ کا مبغوض بندہ قرار دیا ہے (۲) کئی شخص بات کرنے والے ہوں تو جو بڑا ہو وہ گفتگو کا آغاز کرے (۳)

معمولِ مبارک یہ تھا کہ بہتر شیریں اور خوبصورت الفاظ کا استعمال فرماتے، دیہاتیوں کی طرح سخت اور غیر مہذب گفتگو نہ فرماتے جو جس خطاب کا اہل ہوتا اس کے لئے ایسا ہی خطاب اختیار فرماتے (۴) جو بات کہتے اس طرح کہتے کہ لوگ سمجھ لیں، اسی لئے بسا اوقات ایک بات کا تین بار تکلم فرماتے (۵) حضرت عائشہؓ نے آپؐ کی گفتگو کا یہ انداز نقل کیا کہ لفظ لفظ الگ ہوتا اور سننے والا پوری طرح سمجھ لیتا (۶) مگر گفتگو میں تسلسل ہوتا (۷)

آپؐ کی گفتگو اور خطبات و مواعظ جو حدیث کی کتابوں میں موجود ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ مختصر اور پُر معنیٰ گفتگو فرماتے، طویل، لانبی اور اکتا دینے والی گفتگو نہ ہوتی، بلکہ آپؐ نے لوگوں کو بھی اس کی ہدایت فرمائی ہے (۸) ——— زبان کی حفاظت کی آپ نے خاص

---

(۱) مسلم عن مقداد بن اسود۔ (۲) ترمذی باب ما جاء فی الفصاحۃ والبیان۔

(۳) دیکھئے: بخاری باب اکرام الکبیر۔ (۴) زاد المعاد: ۲/۱۱۔

(۵) ابوداؤد باب تکریر الحدیث۔

(۶) ابوداؤد باب الہدی فی الکلام۔

(۷) زاد المعاد ۱/۶۳ فصل فی ہدیہ فی کلامہ۔

(۸) ابوداؤد باب ما جاء فی المتشدق فی الکلام۔

تاکید فرمائی ہے اور فرمایا کہ دو چیزیں ہیں جو زیادہ تر اہلِ دوزخ کو دوزخ میں لے جائے گی، ایک منہ اور دوسرے شرمگاہ (۱)

خطوط :

خطوط رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی لکھے ہیں، حدیث کی کتابوں میں آپؐ کے جو خطوط نقل کیے گئے ہیں وہ یا تو دعوتِ اسلام سے متعلق ہیں یا شریعت کے بعض ارکان کی تفصیل اور توضیح ہیں۔

گو زمانۂ نبوت میں ڈاک کا نظام اس طرح کا نہیں تھا جو اب ہے یہ بعد کے زمانے میں ایجاد ہوا لیکن شریعت کے بعض احکام سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ خطوط کے جواب دینے کے احکام کیا ہیں؟ علامہ سیوطیؒ نے لکھا ہے کہ جیسے سلام کا جواب دینا ایک مسلمان پر حق ہے اسی طرح خط کا جواب دینا بھی خط لکھنے والے کا حق ہے (۲)۔

چوں کہ ہر اچھے کام کی ابتدا بسم اللہ سے ہو، حدیث میں اس کی تلقین کی گئی ہے اس لئے خطوط کے شروع میں بسم اللہ لکھنا چاہیے۔ یہی معمول آپؐ کا اپنے مکاتیب میں تھا۔ بسم اللہ کی جگہ ۷۸۶ لکھنا کافی نہیں۔ مسنون طریقہ یہ ہے کہ خط کی ابتدا مکتوب نویس کے نام سے ہو پھر اس شخص کا نام لکھا جائے جس کے نام خط لکھا جا رہا ہے اور خط میں مکتوب الیہ کے مطابقِ حیثیت اور مناسب حال القاب لکھے جائیں جیسا کہ آپ نے شاہِ روم کو عظیم الروم کے لقب سے مخاطب فرمایا تھا۔ خط دعائیہ الفاظ پر ختم کیا جائے اور آخر میں دستخط کیا جائے یا مہر لگائی جائے یا کوئی

---

(۱) ترمذی عن ابی ہریرہ بحوالہ مشکوٰۃ، باب حفظ اللسان۔

(۲) رد المحتار ۵/۲۶۶۔

۲۸
حلال و حرام

بھی ایسی شکل اختیار کی جائے جس سے مکتوب نویس کی شناخت ہو سکے۔ مکتوب الیہ کو مخاطب کرنے کے بعد اول سلام لکھا جائے پھر خط کا خاتمہ بھی سلام پر ہو ———— یہ تمام آداب ان مکتوباتِ گرامی سے ثابت ہیں جو آپؐ نے بادشاہوں کے نام لکھے تھے (۱)

مجلس :

بیٹھک اور نشست کے بنیادی آداب میں یہ ہے کہ نشست میں وسعت برتی جائے تاکہ بعد میں آنے والوں کو سہولت ہو۔

ارشادِ خداوندی ہے: اذا قیل لکم تفسحوا فی المجالس فافسحوا فی المجالس (المجادلۃ ـ) مجلس میں آنے والوں کو کوئی ایسا عمل نہیں کرنا چاہیئے جس سے کبر کی بو آئے یا دوسروں کی ہتک ہو۔ چنانچہ آپؐ نے اس کو منع فرمایا ہے کہ کسی کو اس کی نشستگاہ سے اٹھا کر اس کی جگہ خود بیٹھ جائے (۲) اسی طرح ایسا کوئی عمل جس سے دوسروں کو خلل ہو، آپؐ نے اس کو ناپسند فرمایا، ارشاد ہوا کہ پہلے سے دو آدمی بیٹھے ہوں تو ان کی اجازت کے بغیر بیچ میں گھسنے کی کوشش نہ کرے (۳) اسی طرح ان لوگوں نے کوئی حلقہ بنا رکھا ہو تو اس کے بیچ میں جا کر بیٹھ جانے کو قابلِ لعنت قرار دیا (۴) اس لیئے کہ یہ عمل نہ صرف دوسروں کیلئے خلل کا باعث ہے بلکہ اس سے کبر اور تعلی کا بھی اظہار ہوتا ہے۔

---

(۱) ملاحظہ ہو: زاد المعاد۔ ۳/۷۱۔

(۲) حوالہ ترمذی عن ابن عمرؓ، باب کراہیۃ ان یقام الرجل من مجلسہ الخ۔

(۳) ترمذی باب ماجار فی کراہیۃ الجلوس الخ۔

(۴) ترمذی باب ماجار فی کراہیۃ القعود وسط الحلقۃ۔

مجلس میں پہنچے تو پہلے سلام کرے واپس ہو تو اس وقت بھی سلام کرے۔ مجلس میں دوسرے کی جو خصوصی نشست گاہ ہو یا تکیہ وغیرہ ہو وہاں پر نہ بیٹھے، اس کو حدیث میں تکرمہ سے تعبیر کیا گیا ہے (۱) کسی عہدہ دار کی کرسی خصوصی نشست گاہ گاؤ تکیہ وغیرہ کے یہی احکام ہیں، ان پر از خود نہ بیٹھنا چاہیئے کہ یہ خلافِ ادب ہے اور میزبان کے احترام اور تعظیم کے خلاف، ———— بیٹھنے کے انداز میں بھی تواضع ہو کہ کبر کی بُو نہ آتی ہو، حضرت قیلہ رضؓ سے مروی ہے کہ میں نے حضورؐ کو ایک بار تواضع کی ایسی کیفیت پر بیٹھا ہوا دیکھا کہ میں بے چین ہو گئی اور گھبرا گئی ارعدات من الفرق (۲) تاہم چوں کہ مختلف لوگوں کے لئے اور مختلف حالات میں بیٹھنے کی الگ الگ ہیئتیں مناسب ہو سکتی ہیں اس لئے آپؐ نے کوئی خاص صورت اور ہیئت متعین نہیں فرمائی۔ بعض اوقات اکڑوں یعنی سرین کے بل پنڈلیاں اٹھا کر بیٹھتے (۳) کبھی تکیہ پر ٹیک لے کر بیٹھتے (۴) فجر کی نماز کے بعد طلوع آفتاب تک پلتھی مار کر بیٹھنے کا معمول تھا (۵)

ہاں ایسی بیٹھک جو متکبرانہ ہو مناسب نہیں۔ ایک صاحب کے پاس سے آپؐ کا گذر ہوا، انہوں نے اپنا بایاں ہاتھ پیٹھ کے پیچھے لگا رکھا تھا اور دائیں ہاتھ پر ٹیک لگا رکھا تھا۔ آنحضورؐ نے اس پر غصہ کا اظہار فرمایا اور فرمایا کہ یہ ان لوگوں کی بیٹھک ہے جو عند اللہ مغضوب ہیں (۶)

---

(۱) ترمذی باب ماجاء فی الاتکاء۔
(۲) ابو داؤد، مشکوٰۃ باب الجلوس۔
(۳) بخاری عن ابن عمرو۔
(۴) ترمذی عن جابر بن سودائہ باب ماجاء فی الاتکاء۔
(۵) ابو داؤد عن جابر بن سمرہ۔ (۶) ابو داؤد عن شرید۔

ملا علی قاری نے اس کی وجہ یہی لکھی ہے کہ اس بیٹھک سے کبر کا اظہار ہوتا ہے، نشست و برخاست میں سب سے اہم بات اچھے ہمنشیں کا انتخاب ہے۔ آپ نے ایک روایت میں اچھے اور بُرے ہمنشیں کے فائدے اور نقصان کو بڑی عمدہ تمثیل سے واضح فرمایا ہے کہ اچھے ہمنشیں عطر فروش کی طرح ہیں اگر عطر نہ ملے تو خوشبو ضرور ملے گی، بُرا ہمنشیں اس شخص کی طرح ہے جس کی بھٹی ہو، آگ سے بچ بھی جائے تو دھنواں سے نہیں بچ سکتا (۱) ———— کوئی بھی مجلس ہو، ہونا یہ چاہیئے کہ وہ اللہ کے ذکر سے بالکل خالی نہ ہو، ایسی مجلس جس میں اللہ کا ذکر نہ ہو، آپ نے فرمایا کہ مُردار گدھے کی طرح ہے اور یہ مجلس اہل مجلس کیلئے باعث حسرت و افسوس ہوگی (۲) ———— حضرت عبداللہ بن عمر نے حضور کا معمول نقل کیا ہے جب آپ مجلس سے اٹھتے تو ایک خاص دعا فرماتے اور وہ یہ ہے:

"اے اللہ ہمیں اپنے خوف کا ایسا حصہ عطا فرما جو ہمارے اور آپ کی نافرمانیوں کے درمیان حائل ہو جائے اور اپنی طاعت کا اتنا حصہ جو آپ کی جنت تک پہنچا ئے، یقین کا اتنا حصہ عطا فرما کہ دنیا کی آزمائشیں ہم پر آسان ہو جائیں۔ خدایا! جب تک ہم زندہ رہیں ہمارے کان آنکھ اور قوت کو لائقِ استفادہ رکھ اور ہماری نسلوں میں اس کیفیت کو باقی رکھ۔ اور ہم پر ظلم کرنے والوں سے تو ہی انتقام لے، ہمارے دشمنوں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما، ہمارے دین کو آزمائش نہ بنا نہ دنیا کو ہماری فکر کا سب سے بڑا مرکز اور علم کا مبلغ اور نہ ہم پر ایسے شخص کو مسلط فرما جو بے رحم ہو" (۳)

---

(۱) بخاری باب فی العطار۔

(۲) ابو داؤد عن ابی ہریرہؓ۔ (۳) ترمذی عن ابن عمر ۲/۱۸۸۔

یہ پُرتاثیر اور جامع دعا جو آپ کے منصبِ نبوت کے شایانِ شان ہے اور کمالِ بندگی اور غایتِ تواضع کا مظہر ہے ـــــــ مجلس کے اخیر میں پڑھنی چاہیئے۔

استراحت و بیداری

اسلام کا تصور یہ ہے کہ انسان کا جسم اس کے پاس امانتِ الٰہی ہے اس لئے اس کی حفاظت وصیانت اور اس کی جائز اور فطری ضروریات اور مقتضیات کی تکمیل ہر مسلمان اور انسان کا فریضہ ہے۔ انسانی جسم کیلئے ایک ضرورت نیند بھی ہے۔ خود قرآن مجید نے نیند کو آرام وسکون کا ذریعہ بنایا ہے (نبار) آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ تم پر تمہاری آنکھ کے بھی حقوق ہیں۔

ان لعینك علیك حق (۱)

سوتے میں اس بات کا خیال ضروری ہے کہ بے ستری نہ ہو، عرب کھلی تہ بند استعمال کرتے تھے۔ اس لئے آپؐ نے پاؤں پر پاؤں چڑھا کر چت سونے کو منع فرمایا (۲) پٹ سونے کو بھی آپؐ نے ناپسند فرمایا اور اس کو ایسا طریقہ قرار دیا جو اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں (۳) سونے کی ہیئت میں خود آپ کا معمول مبارک یہ تھا کہ ابتدا رشب میں سوتے تو دائیں کروٹ پر سوتے اور صبح کے قریب سوتے تو بازو اٹھا کر اس کے سہارے سوتے (۴) ـــــــ خواب بیداری کے سلسلہ میں آپؐ

---

(۱) بخاری عن ابن عمر، باب حق الضیف۔ (۲) ترمذی، باب ما جاء فی کراہیۃ ذلک۔

(۳) ترمذی، باب ما جاء فی کراہیۃ الاضطجاع علی البطن۔

(۴) شرح سنۃ عن ابی قتادہ، مشکوٰۃ، باب الجلوس والنوم والمشی۔

کا معمول یہ تھا کہ عشاء سے پہلے سونے کو ناپسند فرماتے کہ اس سے نمازِ عشاء کے فوت ہونے کا اندیشہ ہے (۱) عشاء کے بعد غیر ضروری گفتگو کو پسند نہیں فرماتے اور سو جاتے (۲)، ہاں مسلمانوں کی کوئی مصلحت ہوتی تو عشاء بعد بھی کچھ جاگ لیتے (۳) رات کے آخری حصہ میں بیدار رہتے (۴) کہ یہی آپؐ کے تہجد کا وقت تھا۔

سونے سے پہلے یہ دعا پڑھتے :-

باسمك اللهم احیٰ و اموت۔ — اے اللہ! آپ ہی کے نام سے زندہ ہوں اور آپ ہی کا نام لے کر مرتا ہوں۔

سُورۂ اخلاص اور معوذتین پڑھتے، دونوں ہتھیلیوں کو اکٹھا کر کے پھونکتے اور سر و چہرہ سے شروع کر کے جہاں تک ہاتھ پہنچ سکتا، ہاتھ پھیر لیتے اور ایسا تین بار فرماتے۔ دایاں ہاتھ دائیں رخسار کے نیچے رکھ کر آرام فرماتے پھر دعا فرماتے: اللهم قنی عذابك یوم تبعث عبادك (۵) (خداوندا! مجھے اس دن اپنے عذاب سے محفوظ رکھ جس دن تو اپنے بندوں کو دوبارہ زندہ فرمائے گا) بعض اور الفاظ و فقرے بھی دعا کے منقول ہیں (۶) بیدار ہوتے تو یہ دُعا پڑھتے:

الحمد لله الذی احیانا بعد ما اماتنا والیه النشور (۷) — تمام تعریف اس اللہ تعالیٰ کیلئے ہے جس نے ہمیں نیند کی اس عارضی موت کے بعد پھر بیداری عطا فرمائی اور اسی کی طرف پھر لوٹنا ہے۔

---

(۱) زاد المعاد ۱/۵۶۔ (۲) ابوداؤد باب النہی عن السمر بعد العشاء۔
(۳) زاد المعاد ۱/۵۶۔ (۴) حوالۂ مذکور (۵) حوالۂ سابق (۶) دیکھئے: حوالۂ مذکور
(۷) حوالۂ مذکور۔

سفر:

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ جامعہ اور اسوۂ مبارکہ میں جہاں حضر اور قیام کے احکام ہیں وہیں سفر اور غریب الوطنی کی زندگی کے لئے بھی روشنی موجود ہے —— بے مقصد سفر کو آپؐ نے پسند نہیں فرمایا، اس لئے سفر کا مقصد جونہی حاصل ہو جائے اپنی جائے سکونت کو واپس آجانا چاہیئے (۱) سفر کیلئے نہایت اہم چیز رفقاءِ سفر ہیں، رسُول اللہؐ نے تنہا سفر کو پسند نہیں فرمایا ہے (۲) بہتر ہے کہ کم سے کم تین آدمی سفر کریں اور تین میں سے ایک کو امیر منتخب کرلیں (۳) آپؐ نے اس بات کو زیادہ بہتر قرار دیا کہ رفقاءِ سفر کم سے کم چار ہوں (۴)۔

دراصل زمانۂ قدیم میں آجکل کی طرح سفر کے ذرائع میسر نہیں تھے قافلوں کی شکل میں سفر ہوتا تھا اور حضورؐ نے فرمایا کہ قافلہ کم سے کم تین آدمیوں سے بنتا ہے (۵) اس زمانے میں حفاظت وصیانت کے نقطۂ نظر سے قافلوں کی شکل میں سفر کرنا ضروری تھا، موجودہ زمانے میں بسیں، ٹرینیں اور جہاز وغیرہ بجائے خود قافلہ کے حکم میں ہے۔

جب آدمی سفر شروع کرے تو لوگوں کو اسے دُعا دینی چاہیئے یہ دعاء خود آپؐ سے مختلف الفاظ میں منقول ہے، دعاء کے الفاظ یہ ہیں:۔

---

(۱) مسلم، باب السفر قطعة من الاداب۔

(۲) ابوداؤد، باب فی الرجل یسافر وحدہٗ۔

(۳) احیاء العلوم ۲/۲۵۲۔

(۴) حوالۂ سابق۔

(۵) تخریج عراقی علی الاحیاء، حوالۂ مذکور۔

استودع اللہ دینکم وامانتکم وخواتیم اعمالکم (۱)
تمہارے دین، تمہاری امانت اور تمہارے خاتمہ اعمال کو اللہ کے حوالہ کرتا ہوں۔

بعض دفعہ آپؐ نے اس طرح دعا دی ہے۔

فی حفظ اللہ وفی کنفہ زودک اللہ التقویٰ وغفر ذنبک ووجھک للخیر حیث کنت (۲)
تم اللہ کی حفاظت اور اس کی نگہبانی میں رہو اللہ تمہیں تقویٰ عطا فرمائے، گناہوں کو معاف فرمائے اور تم جہاں کہیں ہو، خیر کی طرف تمہاری رہنمائی کرے۔

سفر کو نکلنے سے پہلے آپؐ نے سامانِ سفر کی تیاری کے بعد گھر ہی میں چار رکعت نماز پڑھنے کی ہدایت فرمائی ہے، جس میں سورۂ فاتحہ اور قل ھو اللہ پڑھے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرے کہ ان رکعات کے ذریعہ میں آپ کی قربت کا طلبگار ہوں اور تو ان کی وجہ سے میرے اہل وعیال اور مال کا ولی ونگراں اور محافظ ہو جاؤ (۳) پھر جب سواری پر چڑھے تو تین مرتبہ اللہ اکبر کہے اور یہ دعا پڑھے:

سبحان الذی سخر لنا ھذا وما کنا لہ مقرنین وانا الیٰ ربنا لمنقلبون۔
اس کی ذات پاک ہے جس نے ان چیزوں کو ہمارے بس میں کر دیا.... اور ہم تو ایسے نہ تھے جو ان کو قابو میں کر لیتے اور ہم کو اپنے رب کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

یا یہ دعا پڑھی جائے:

اللّٰھم انی اسئلک فی سفری ھذا البر والتقویٰ ومن العمل
اے اللہ میں اپنے اس سفر میں نیکی اور تقویٰ کا خواستگار ہوں اور ہر اس عمل کا بھی

---

(۱) ابوداؤد باب فی الدعاء عند الوداع۔

(۲) احیاء العلوم ۲/۲۵۲۔ (۳) حوالہ مذکور۔

ما ترضیٰ اللّٰھم ھون علینا السفر واطولنا البعد اللّٰھم انت الصاحب فی السفر والخلیفۃ فی الاھل اللّٰھم اصحبنا فی سفرنا واخلفنا فی اھلنا۔ (۱)	جو آپ کو پسند ہو، سفر آسان فرما دیجئے دوری کم فرما دیجئے۔ اے اللہ سفر میں آپ ہی ہمارے رفیق ہیں، اہل وعیال کیلئے آپ ہی نگہبان ہیں، اے اللہ ہمارے سفر میں آپ مدد فرمائیے اور ہمارے اہل وعیال کی حفاظت فرمائیے۔

بعض روایات میں یہ دعا منقول ہے۔

انت الصاحب فی السفر و الخلیفۃ فی الاھل اللّٰھم انی اعوذبك من الھم فی السفر والکابۃ فی المنقلب اللّٰھم اقبض لنا الارض وھون علینا السفر (۲)	اے اللہ سفر میں آپ ہی ہمارے لئے رفیق اور ہمارے اہل کیلئے نگہبان ہیں۔ اے اللہ سفر کی مشکلات سے آپ کی پناہ چاہتا ہوں اے اللہ ہمارے لئے مسافت سفر کو کم فرما اور سفر کو آسان بنا،

پھر سفر کے درمیان جب کبھی اونچائی پر چڑھنا ہو یا نشیب میں اترنا ہو تو یہ دعا پڑھے۔

اللّٰھم لك الشرف علیٰ کل شرف ولك الحمد علیٰ کل حال۔	اے اللہ ہر شرف سے بڑھ کر آپ کا شرف ہے اور ہر حال میں آپ کیلئے حمد وثنا ہے

کہ یہی آپ کا معمول تھا (۳) ــــــــ درمیان میں اگر کسی منزل پر قیام کی نوبت آئے تو آپؐ نے اعوذ بکلمات التامات من شر ما خلق پڑھنے کی ہدایت فرمائی ہے (۴)

---

(۱) زاد المعاد ۲/۳۶۔ (۲) حوالہ سابق۔

(۳) زاد المعاد ۲/۲۷۔ (۴) حوالہ سابق بحوالہ مسلم۔

آپؐ جمعرات کے دن سفر کے آغاز کو بہتر سمجھتے تھے اور زیادہ تر سفر اسی دن فرماتے، رخصت ہونے والے کے ساتھ مشایعت یعنی تھوڑی دور چلنا بھی آپؐ کی سنت ہے (۱) آداب سفر میں یہ بھی ہے کہ جس سواری میں جارہا ہو اس پر مناسب حال بوجھ اٹھائے، جانور پر سواری کرے تو اس کی راحت کا بھی خیال کرے (۲)

سفر میں پانچ چیزوں کا رکھنا خاص معمول تھا، آئینہ، سرمہ دانی، قینچی، مسواک اور کنگھی ———— سفر سے واپس ہوتے ہوئے اس بات کا لحاظ رکھے کہ اچانک رات میں گھر نہ آئے بلکہ صبح یا شام کو آئے اور اہل خانہ کو پہلے سے باخبر کردے (۳) واپسی میں جب شہر میں داخل ہو تو یہ دعا پڑھے:

آئبون تائبون ان شاء	لوٹ رہے ہیں، تائب ہیں، انشاء اللہ
اللہ عابدون لربنا حامدون (۴)	ہم اپنے پروردگار کی حمد و تعریف کریں گے

معمولِ مبارک تھا کہ تشریف آوری کے بعد پہلے مسجد جاتے دو رکعت نماز پڑھتے پھر مکان تشریف لے جاتے (۵) یہ بھی مسنون ہے کہ اعزہ و اقرباء کے لئے کھانے وغیرہ کے کچھ تحفے ساتھ لاتے (۶) سفر سے واپسی پر آنیوالوں کے خیر مقدم اور استقبال کے لئے آگے بڑھ کر ملاقات کرنا بھی ثابت ہے (۷) صحابہ کا معمول تھا کہ طویل سفر سے واپس آتے تو باہم معانقہ بھی کرتے (۸)

---

(۱) احیاء العلوم ۲/۲۵۴۔ (۲) حوالہ سابق ص ۲۵۵۔
(۳) ابوداؤد باب فی الطروق (۴) زاد المعاد ۲/۳۶۔
(۵) حوالہ سابق ص: ۳۸۔ (۶) احیاء العلوم ۲/۲۵۷۔
(۷) دیکھئے ابوداؤد باب فی التلقی۔ (۸) زاد المعاد ۲/۸۳۔

شب و روز کے معمولات مبارکہ

حدیث و سیرت کی کتابوں میں آپ کے شبانہ روز کے معمولات غالباً یکجا مذکور نہیں ہیں، لیکن اگر آپ کے شمائل و احوال کا بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو شام و سحر اور روز و شب کے معمولات جانے جاسکتے ہیں۔ اردو زبان میں مشہور سیرت نگار بلکہ سیرت و تذکرہ کی جانِ بہار علامہ شبلی نعمانی نے ان معمولات کو یکجا کرنے کا اہتمام کیا ہے اور آپ کے شاگرد رشید علامہ سید سلیمان ندوی نے اس پر بیش قیمت اضافہ بھی فرمایا ہے۔ یہاں اسی کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے:

معمولِ مبارک یہ تھا کہ اپنے اوقات کے تین حصے فرماتے، ایک عبادت کے لئے، دوسرا بندگانِ خدا کے لئے، تیسرا خود اپنی ذات کیلئے ـــ آدھی رات یا اس کے بعد بیدار ہوتے، مسواک سرہانے رکھتے، پہلے مسواک پھر وضو فرماتے اور اس کے بعد تہجد میں مشغول ہو جاتے۔ عام معمول آٹھ رکعت تہجد کا تھا، کبھی اس سے زیادہ اور کبھی اس سے کم رکعت ادا فرماتے، فجر کے بعد پالتی مار کر مسجد ہی میں تشریف رکھتے تا آنکہ آفتاب اچھی طرح نکل آتے اس درمیان حسب موقع نصیحت فرماتے، خواب بیان کرتے یا خواب کی تعبیر بیان فرماتے، مالِ غنیمت اور وظائف وغیرہ کی تقسیم بھی اسی وقت ہوتی۔

کچھ دن چڑھے، کبھی چار اور کبھی آٹھ رکعت نماز چاشت ادا فرما کر گھر جاتے اور گھر کے کاموں میں مشغول رہتے، عصر کے بعد ازواجِ مطہرات کے پاس تھوڑی دیر کے لئے جانے کا معمول تھا، جن ام المؤمنین کی باری ہوتی، مغرب بعد سے انہی کے یہاں قیام رہتا، مغرب تا عشاء دوسری ازواجِ مطہرات بھی وہیں آجاتیں۔ عشاء کے بعد جلد سو جاتے اور اس وقت

بات چیت کو ناپسند کرتے۔ سوتے وقت قرآن مجید کی کوئی سورت پڑھ کر سوتے، دعا پڑھتے، دائیں کروٹ ہوتی اور دایاں ہاتھ دائیں رخسار کے نیچے ہوتا، آنکھ کھلتی تو پھر پہلے دعا پڑھتے (۱) ـــــــ دو وقت کھانے کا معمول تھا، دن میں پہلے پہر کے بعد اور رات میں بعد مغرب (۲) دن کے کھانے کے بعد قیلولہ بھی فرمایا کرتے (۳)

بچے ـــــــ اسلام کی نظر میں

بچے اللہ کی بڑی نعمت اور عظیم عطیہ ہیں، انسانی معاشرہ میں ان کی حیثیت پھولوں اور کلیوں کی ہے، وہ انسان کے لئے آنکھوں کی ٹھنڈک اور راحت کا ذریعہ ہیں۔ اسی لئے انسانی فطرت میں صاحب اولاد بننے کا زبردست داعیہ رکھا گیا ہے، یہ داعیہ ایک معمولی آدمی سے لے کر بڑے سے بڑے برگزیدہ انسانوں تک میں موجود ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں دو اولوالعزم انبیاء حضرت ابراہیمؑ اور حضرت زکریاؑ کے سلسلہ میں ذکر کیا گیا ہے کہ انہوں نے خدا سے اولاد کے لئے دعا فرمائی (الصّٰفّٰت ۱۰۰، مریم ۵) اور اللہ تعالیٰ نے اسے قبول فرمایا۔

پھر قدرت کا عجیب کرشمہ ہے کہ انسان جو اس دنیا میں خدا کا خلیفہ اور نمائندہ ہے (البقرۃ ۳۰)۔ اور جس کے لئے پوری کائنات کو مسخر کر دیا گیا ہے (الجاثیہ ۱۳) وہ اپنے بچپن میں سب سے محتاج، کمزور و ناتواں، عاجز و

---

(۱) سیرت النبی دوم ص: ۲۱۲ تا ۲۱۴، معمولات، ملخصاً۔

(۲) جیسا کہ روایات کے مجموعی مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے۔

(۳) بخاری ۱/۱۲۸، باب القائلۃ بعد الجمعۃ۔

درماندہ اور قدم قدم پر اور ایک طویل مدت کے لیئے بے شمار سہاروں اور مددگاروں کا ضرورتمند ہوتا ہے۔ اس ضرورت کی تکمیل کیلئے خدا نے انسانوں کی فطرت میں اپنی اولاد سے محبت اور تعلق کا ایک والہانہ اور بے ساختہ جذبہ رکھ دیا ہے۔ ایسی محبت جس کو الفاظ کا روپ دینا اتنا ہی مشکل ہے جتنا سورج کی تصویر سے شعاعوں کا بکھیرنا۔ انسان کے علاوہ دوسری مخلوقات ایک تو اپنے نقطۂ آغاز ہی سے خود مکتفی ہوتی ہیں، دوسرے ان میں اولاد سے محبت و شیفتگی کے اتنے بے پناہ جذبات نہیں ہوتے بلکہ بعض مخلوقات تو ایسی ہیں جو اپنی اولاد کو خود اپنی غذا بنالیتی ہیں۔

یہ دراصل قدرت کا ایک لطیف اشارہ ہے جو انسانی بچوں، ان کی تربیت ونشوونما اور سماج کی ان کی طرف توجہ کی ضرورت اور اہمیت کو واضح کرتا ہے۔ اسی لیئے اسلام نے افزائش نسل ان کی تعلیم و تربیت کو بڑی اہمیت دی ہے اور اس کے لیئے ایسا نظام العمل ترتیب دیا ہے جو اس کی پیدائش سے جوانی تک کی پوری زندگی کو حاوی ہے۔

مبارکباد

بچہ کی پیدائش پر سماج کا کیا ردعمل ہونا چاہیئے؟ —— قرآن بتاتا ہے کہ لوگوں کو اس پر مبارکباد دینا اور مسرت کا اظہار کرنا چاہیئے چنانچہ حضرت ابراہیمؑ کو حضرت اسحاقؑ کے تولد ہونے کی اطلاع دینے کا قرآن مجید ان الفاظ میں تذکرہ کرتا ہے: "ہمارے قاصد (فرشتے) حضرت ابراہیمؑ کے پاس خوشخبری لے کر آئے اور سلام کیا، انہوں نے بھی جواباً سلام کہا...... اس وقت ابراہیم کی بیوی (سارہ) کھڑی تھیں، وہ ہنس پڑیں، ہم نے ان کو

اسحاقؑ اور اسحاقؑ کے بعد یعقوبؑ کی خوشخبری دی"۔ (ہود ۶۹ ـ ۷۱)

حضرت زکریاؑ کے سلسلہ میں ارشاد ہے:

"فرشتوں نے ان کو اس وقت ندا دی جب وہ محراب میں کھڑے مصروفِ نماز تھے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو یحییٰ کی خوشخبری دیتے ہیں"۔ (آلِ عمران: ۲۹)

یہ مبارکباد جس طرح بچوں کے لئے ہے اسی طرح بچیوں کے لئے بھی۔ بچیوں کی پیدائش پر رنجیدہ خاطر اور محزون ہونا جاہلانہ اور غیر اسلامی اندازِ فکر ہے، قرآن نے اس کو کافرانہ طریقہ قرار دیا ہے (الزخرف ۱۷) اس لئے کہ اولاد جو بھی ہو اللہ کا عطیہ اور اس کی متعین کی ہوئی تقدیر ہے۔ اس طرح جو شخص لڑکیوں پر کبیدہ خاطر ہوتا ہے وہ دراصل اپنے عمل سے اس بات کا اعلان کر رہا ہوتا ہے کہ نعوذ باللہ وہ خدا کے فیصلہ سے ناراض اور نالاں ہے۔

اذان و اقامت

ولادت کے بعد بچہ سے متعلق سب سے پہلا حکم یہ ہے کہ اس کے دائیں کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت کے کلمات کہے جائیں، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسن کی پیدائش کے دن ان کے کانوں میں اذان و اقامت کے کلمات کہے ہیں (۱) اور اس کا حکم بھی دیا ہے (۲) اس اذان و اقامت کا منشا یہ ہے کہ پہلی بات اور پہلی ندا جو بچہ کے کان میں پڑے وہ خدا کی کبریائی اور اس کی الوہیت کی ہو، نیز اس سے پہلے

---

(۱) بیہقی عن ابن عباسؓ، ابوداؤد و ترمذی عن ابی رافعؓ۔
(۲) بیہقی عن حسن بن علیؓ۔

کہ شیطان انسان کے کانوں اور دلوں تک اپنی بات پہنچائے، پہلے ہی اس کو اسلام اور ہدایت کی دعوت دے دی جائے۔

تحنیک:

تحنیک کے معنی کھجور چبانے کے ہیں۔ تحنیک سے مراد یہ ہے کہ بچہ کی پیدائش کے بعد کوئی بزرگ اور صالح آدمی کھجور یا کوئی میٹھی چیز چبا کر اس کا لعاب بچہ کے منھ میں اس طرح لگا دے کہ ایک خفیف حرکت کے ذریعہ منھ کے اندرونی حصہ میں دائیں اور بائیں جانب لگ جائے۔ اس کا مقصد برکت کا حصول ہے، انسان یا کسی بھی مخلوق کے جسم کے اجزاء اور لعاب جس طرح اپنے طبی اثرات رکھتے ہیں اور جسمانی صحت اور بیماری کا ذریعہ بنتے ہیں اسی طرح اس کے اخلاقی اثرات بھی ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ انسان نے ان جانوروں کے گوشت کھانے کو ممنوع اور لعاب کو ناپاک قرار دیا ہے جن میں فطری طور پر درندگی اور خساست ہے مثلاً شیر، بھیڑیے اور سور وغیرہ۔ اس طرح عین ممکن ہے کہ بزرگ و صالح اشخاص سے تحنیک کرانے سے بچہ میں حسنِ اخلاق اور دینداری پیدا ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ثبوت ہے، حضرت ابو موسیٰ اپنے صاحبزادے کو حضور کی خدمت میں لائے تو آپ نے ان کا نام ابراہیم رکھا، کھجور سے تحنیک کی اور برکت کی دعا دی (۱)، حضرت ابو طلحہؓ کے صاحبزادہ کی بھی آپ نے کھجور سے تحنیک کی اور ان کا نام عبداللہ تجویز فرمایا (۲)

---

(۱) بخاری عن ابی بردہؓ۔ ۸۲۱/۲ باب تسمیۃ المولود غداۃ یولد لمن لم یعق عنہ وتحنیکہ۔

(۲) بخاری عن انس بن مالکؓ باب تسمیۃ المولود الخ۔

بال مونڈنا

بچوں سے متعلق احکام میں سے یہ بھی ہے کہ ساتویں دن سر کے بال مونڈ دیئے جائیں اور بال کے ہم وزن چاندی یا اس کی قیمت فقرار اور محتاجوں پر صدقہ کر دی جائے، یہ حکم محض از راہ استحباب ہے۔ اس سے طبی فائدہ تو یہ ہوگا کہ سر کے مسامات کھلیں گے اور اس کی وجہ سے دماغ اور اس سے وابستہ دوسری صلاحیتوں کو قوت حاصل ہوگی، دوسرے اس خوشی میں سماج کے پس ماندہ اور پست حال افراد بھی شریک ہوسکیں گے جو اسلامی تعلیمات کی روح ہے۔ چنانچہ حضرت فاطمہؓ، حضرت زینبؓ اور حضرت ام کلثومؓ نے حضرت حسن اور حضرت حسین کے بالوں کے ہم وزن چاندی صدقہ فرمائی ہے[1]۔

ناموں کا انتخاب

ناموں کی حیثیت کسی قوم اور سوسائٹی میں بڑی بنیادی ہوتی ہے ان کے ذریعہ مذہب اور فکر و عقیدہ کا اظہار ہوتا ہے۔ اس لئے اسلام نے اس سلسلہ میں تفصیلی ہدایات دی ہیں ______ اچھے اور بامعنی نام رکھنے چاہئیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم لوگ قیامت کے دن اپنے اور اپنے باپ کے ناموں سے پکارے جاؤ گے اس لئے اچھے نام رکھا کرو (۲) چنانچہ جو نام اپنے مفہوم کے لحاظ سے نامناسب ہوتے آپؐ اسے بدل دیتے (۳)، حضرت سیدنا عمرؓ کی ایک صاحبزادی کا نام "عاصیہ" تھا جس کے

(۱) مؤطا امام مالک عن جعفر بن محمدؒ (۲) ابوداؤد عن ابی الدرداءؓ۔
(۳) ترمذی عن عائشہؓ باب ماجاء فی تغییر الاسماء۔

معنی گنہ گار کے ہیں۔ آپؐ نے اسے بدل کر جمیلہ (خوبصورت) رکھا (۱)، اس کے علاوہ بھی آپؐ نے بہت سے نام تبدیل کیے ہیں (۲)

آپؐ نے ایسے ناموں کو ناپسند فرمایا ہے جس سے بدشگونی اور بدفالی ہوتی ہو۔ ایک شخص حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپؐ نے دریافت فرمایا، کیا نام ہے؟ انہوں نے کہا حَزن (سخت زمین)۔ آپؐ نے فرمایا، نہیں تم سَہل ہو (۳)۔ (سہل نرم زمین کو کہتے ہیں) اسی طرح حضرت علیؓ نے حسین کا نام "حرب" تجویز کیا جس کے معنی لڑنے کے ہیں، آپؐ نے اس نام کو تبدیل کر کے حسین رکھا۔

ایسے نام رکھنا بھی مناسب نہیں جن سے اللہ تعالیٰ کو موسوم کیا جاتا ہے، ایک شخص آپؐ کی خدمت میں آئے جن کو لوگ "ابوالحکم" کہا کرتے تھے، رسول اللہؐ نے اس نام پر ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا اور کہا کہ حَکم تو ذاتِ خداوندی ہے، پھر بیٹے کی طرف نسبت کرتے ہوئے ان کا نام ابو شریح تجویز فرمایا (۴) آپؐ نے فرمایا، اللہ کے نزدیک مبغوض ترین اور بدترین انسان وہ ہوگا جو اپنا نام "مَلک الاملاک" (شہنشاہ) رکھے۔ اس لیے کہ مَلک (بادشاہ) صرف خدا ہی کی ذات ہے (۵)

ایسے ناموں کو بھی آپؐ نے ناپسند فرمایا ہے کہ اگر کبھی ان کو پکارا جائے اور ان کی غیر موجودگی کی اطلاع دی جائے تو بظاہر بدشگونی پیدا

---

(۱) ترمذی و ابن ماجہ عن ابن عمرؓ۔ (۲) امام ابو داؤد نے ایسے بہت سے نام ذکر کیے ہیں اور ازراہِ اختصار ان کی سندیں ذکر نہیں کیں۔

(۳) بخاری عن سعید بن میسبؓ باب اسم الحزن (۴) ابو داؤد۔ باب فی تغیر الاسم القبیح

(۵) بخاری عن ابی ہریرہؓ۔ باب البغض الاسماء الی اللہ ۲/۹۱۶۔

۲۹ع
حلال و حرام

ہوتی ہو، مثلاً کسی کا نام "یسار" جس کے معنی آسانی کے ہیں، اَب اس کے بارے میں کہا جائے کہ "یسار نہیں ہے" تو اس کے ظاہری معنی ہوں گے آسانی نہیں ہے — ایسے چار ناموں کا حدیث میں ذکر آیا ہے۔ یسار (آسانی) رباح (نفع) نجیح (کامیاب) اور افلح (کامیاب[1])

ایسے نام بھی نہیں رکھنے چاہئیں جس سے شرک کا اظہار ہوتا ہے جیسے عبد النبی (نبی کا بندہ) یا ایسے نام جس میں غیر مسلموں سے تشبہ پیدا ہو اور ناموں میں مسلمانوں کا تشخص باقی نہ رہے جیسے جمشید، آفتاب، ماہتاب، نسرین، یاسمین وغیرہ۔

اس کے برخلاف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے ناموں کو پسند فرمایا ہے جس سے اللہ کی عبدیت کا اظہار ہوتا ہو جیسے عبد اللہ، عبد الرحمٰن وغیرہ، اسی طرح انبیاء کرامؑ کے نام ابراہیم واسماعیل وغیرہ (۲)

اسی طرح صحابۂ کرامؓ اور سلف کے ناموں پر اپنے نام رکھنے چاہئیں اور ایسے ناموں کا انتخاب کرنا چاہیئے کہ اولِ لمحہ سمجھ لیا جائے کہ یہ شخص مسلمان ہے، نام بامعنی ہونا چاہیئے۔ اس لئے کہ نام کا اثر انسان کی ذات اور اس کے اوصاف پر بھی پڑتا ہے۔

ناموں کی ایک قسم "کنیت" ہے۔ کنیت وہ نام ہے جس میں اَب یا ابن کی طرف نسبت ہو جیسے ابو ہریرہ (بلی والے) ابو سفیان یعنی سفیان کے باپ اور علی بن ابی طالب، ابو طالب کے بیٹے علی۔ سلف صالحین میں اس قسم کے ناموں کا کثرت سے رواج تھا جیسے ابوبکر، ابوالحسن، ام سلمہ،

---

(۱) بخاری عن جابر باب احب الاسماء الی اللہ۔

(۲) ابو داؤد عن سمرۃ بن جندب باب فی تغییر الاسم القبیح۔

ابن عمر، ابن مسعود وغیرہ، ایسے ناموں سے انسان کی شخصیت اور اس کے نسب کا اظہار ہوتا ہے اس لئے ایسے نام رکھنے چاہئیں۔

اس بات کا خاص خیال رکھنا چاہیے کہ ناموں میں بگاڑ نہ پیدا ہو مثلاً کسی کا نام عبدالکریم یا عبدالرزاق ہو تو اس کو صرف کریم یا رزاق کہا جائے (۱) یہ سخت گناہ ہے اس لئے کہ یہ اللہ کے نام ہیں، اسی طرح اگر بچہ گونگا یا کانا اور زیادہ لمبا ہو تو اس کو گونگا، لمبو کہنا بُری بات ہے۔ اس لئے کہ قرآن مجید نے "تنابز بالالقاب" سے منع فرمایا ہے۔ ولاتنابزوا بالالقاب (الحجرات ۱۱)

ساتویں دن تک بچہ کا نام رکھ دینا چاہیے، بعض احادیث میں اس کا ذکر موجود ہے۔ ویسے بہتر یہ ہے کہ ولادت کے دن ہی نام رکھ دینا چاہیے۔ چنانچہ حضرت ابواسید اپنے صاحبزادہ کی ولادت کے بعد خدمتِ والا میں لائے تو آپؐ نے اسی وقت ان کا نام "منذر" تجویز کیا (۲) حضرت ابراہیمؓ کی پیدائش شب میں ہوئی تو آپؐ نے ارشاد فرمایا۔ رات میرے یہاں ایک بچہ تولد ہوا اور میں نے اس کا نام اپنے باپ ابراہیمؑ کے نام پر ابراہیمؓ رکھا ہے (۳)۔

عقیقہ

عربی زبان میں "عق" کے معنی کاٹنے کے ہیں، عقیقہ میں ایک طرف جانور ذبح کیا جاتا ہے اور دوسری طرف ان بچوں کے بال کاٹے جاتے ہیں

(۱) تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو قاموس الفقہ لفظ "اللہ"۔

(۲) مسلم عن سہل بن سعد ساعدی۔ (۳) مسلم عن سلیمان بن مغیرہؓ۔

جن کا عقیقہ کیا جاتا ہے، اس دوہری مناسبت کی وجہ سے عرب اس کو عقیقہ کہا کرتے تھے (۱) اسلام سے پہلے عرب میں مختلف قسم کی قربانیاں کی جاتی تھیں، انہیں میں "عقیقہ" بھی ہے (۲) اس طرح اس پر ماقبل اسلام سے عمل ہے ——— اسلام نے بھی عقیقہ کو باقی رکھا اور خود آپؐ نے اپنے نواسوں کا عقیقہ فرمایا، خیال ہوتا ہے کہ اس کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ حلال اور مباح کو علانیہ کیا جانا چاہیئے اور اس کا پوری طرح اظہار و اعلان ہو جانا چاہیئے، نکاح حلال ہے اور اس کے ذریعہ ایک مرد و زن کا علاقۂ باہمی پاکبازی پر مبنی ہے، اس لئے ولیمہ کے ذریعہ اس کی تشہیر کی گئی اسی طرح ایک جائز رشتہ کے ذریعہ جب بچہ کی تولید ہو تو اس کے نسب کو بھی معروف کیا جانا چاہیئے تاکہ عام لوگ بھی اس سے مطلع ہو سکیں۔ غالباً اسی مقصد کے لئے شریعت نے "عقیقہ کی سنت رکھی ہے۔

عقیقہ کا حکم

امام ابو حنیفہ کا قول مشہور یہی ہے کہ عقیقہ محض مباح ہے نہ واجب اور نہ سنت (۳) اس لئے کہ حضرت عائشہ کی روایت میں ہے کہ بقرعید کی قربانی نے اور تمام قربانیوں کو منسوخ کر دیا ——— اکثر فقہاء کے نزدیک عقیقہ مسنون ہے (۴) اور یہی صحیح ہے اور اس سلسلہ میں کئی حدیثیں

---

(۱) فتح الملک المعبود تکملہ العذب المورود ۲/۲۷۔

(۲) بدائع الصنائع ۵/۶۹۔

(۳) بدائع ۵/۶۹، عالمگیری ۵/۲۶۲۔

(۴) دیکھئے المغنی ۸/۶۴۵ اور بدایۃ المجتہد ۱/۴۴۸۔

موجود ہیں (۱) اسی بنا پر خود احناف کے بھی محقق علماء اس کے مستحب یا مسنون ہونے کے قائل ہیں، خود امام طحاوی نے مستحب قرار دیا ہے (۲) یہی رائے مولانا عبدالحی لکھنوی فرنگی محلی کی بھی ہے (۳) علامہ کاسانی نے لکھا ہے کہ قربانی کے ساتھ عقیقہ کا حصہ شریک ہو تو درست ہے اس لئے کہ اس سے بھی اللہ تعالیٰ کا تقرب ہی مقصود ہے (۴) اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی کو کم از کم مستحب کا درجہ ضرور دیتے تھے۔

رہ گئی حضرت عائشہؓ کی روایت تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ قربانی واجب ہونے کے بعد عقیقہ واجب نہیں رہا، محض مستحب کا درجہ رکھتا ہے۔

عقیقہ کے جانور

ام کرز کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لڑکے کا عقیقہ دو بکرے سے اور لڑکیوں کا ایک بکرے سے کیا جائے (۵) اسی مضمون کی روایت عبداللہ ابن عمر سے بھی منقول[۶] ہے اور حضرت عائشہ سے بھی (۷) ———— اس کے مقابلہ میں عبداللہ ابن عباس کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسن اور حضرت حسین کا عقیقہ ایک ایک ہی مینڈھے سے کیا ہے (۸) احناف اور مالکیہ اس حدیث

---

(۱) دیکھئے ابوداؤد باب فی العقیقہ۔ (۲)
(۳) التعا المجد ۲۸۸۔ (۴) بدائع ۵/۷۲۔
(۵) ابوداؤد باب فی العقیقہ۔
(۶) حوالۂ سابق۔
(۷) ترمذی
(۸) سبل السلام ۴/۱۴۲۶ باب العقیقہ۔

کے مطابق ایک مینڈھے کا عقیقہ لڑکے اور لڑکیوں دونوں کے لئے قرار دیتے ہیں اور شوافع اور حنابلہ کا عمل پہلی حدیث پر ہے یعنی بہتر طریقہ لڑکوں کی طرف سے دو بکرے اور لڑکی کی طرف سے ایک بکرا ہے (۱) اور یہی زیادہ صحیح ہے، حضرت حسن و حسین کا عقیقہ ایک مینڈھے کے ذریعہ جواز بتانے کیلئے ہے۔

عقیقہ کن جانوروں کے ذریعہ ہوگا اس سلسلہ میں عام فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ جن جانوروں کی قربانی درست ہے انہی کے ذریعہ عقیقہ بھی درست ہے اور قربانی جن جانوروں کے ذریعہ درست ہے وہ اونٹ گائے، بیل اور بکرے مینڈھے ہیں، البتہ امام شافعی اور امام احمد کے نزدیک اونٹ کے ذریعہ عقیقہ بہتر ہے اور امام مالک کے نزدیک بکرے کے ذریعہ (۲) اور واقعہ ہے کہ امام مالکؒ کی رائے حدیث سے زیادہ مطابقت رکھتی ہے۔ چنانچہ حضرت عبدالرحمن بن ابی بکر کی ایک بیوی نے بچے کی پیدائش پر اونٹ کی قربانی نذر مانی تو حضرت عائشہ رضؓ نے فرمایا کہ سنت پر عمل کرنا افضل ہے اور وہ یہ ہے کہ لڑکوں کی طرف سے دو اور لڑکیوں کی طرف سے ایک بکری ذبح کی جائے (۳)

عقیقہ کب کیا جائے؟

عقیقہ بچہ کی ولادت کے ساتویں دن کیا جانا چاہیئے، یوں ساتویں

---

(۱) نیل الاوطار ۵/۱۳۲، عالمگیری ۵/۳۶۲، سبل السلام ۴/۱۴۲۸۔

(۲) دیکھئے: بدایۃ المجتہد ۱/۴۴۹ نیز شرح مہذب ۸/۴۳۰۔

(۳) مستدرک ۴/۲۳۸ بحوالہ اعلاء السنن ۱۷/۱۱۵۔

دن سے پہلے بھی کرلیا جائے تو کافی ہے۔ کس عمر تک عقیقہ کیا جا سکتا ہے؟ اس سلسلہ میں امام شافعی اور امام احمد کا خیال ہے کہ بالغ ہونے سے پہلے پہلے تک (۱)، امام مالکؒ کے نزدیک ساتویں دن تک عقیقہ نہیں کر پایا تو اب عقیقہ کی گنجائش باقی نہیں رہی (۲)

ساتویں دن عقیقہ نہیں کرپائے تو چودھویں ورنہ اکیسویں دن عقیقہ کرنا چاہیے، اس سلسلہ میں حضرت بریدہؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک روایت نقل کی ہے، محدثین کے یہاں جس کی صحت مشکوک ہے (۳) نیز حضرت عائشہؓ کے ایک قول سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ اسی لئے علامہ ابن قدامہ نے بھی ساتویں تاریخ پر عقیقہ نہ ہوسکے تو چودھویں اور اکیسویں تاریخ کو عقیقہ مسنون قرار دیا ہے (۴)

متفرق احکام

عقیقہ کے گوشت میں سے خود بچہ کے اولیاء کے لئے کھانا، دوسروں کو کھلانا، غرباء کو دینا مسنون ہے (۵) یہ بھی مستحب ہے کہ عقیقہ کے جانوروں کی ہڈیوں کو توڑا نہ جائے بلکہ صرف جوڑوں سے الگ کیا جائے، حضرت حسین وحسن کے عقیقہ کے جانور کی ران آپ نے دایہ کو دی تو فرمایا کہ اس کی ہڈیوں کو نہ توڑنا لاتکسروا منها عظماً (۶)

---

(۱) شرح مہذب ۸/۴۳۰، المغنی ۸/۶۴۶۔

(۲) سبل السلام ۴/۱۴۲۹۔ (۳) دیکھئے مجمع الزوائد ۴/۵۹، ز من العقیقہ

(۴) المغنی باب الذبائح۔ (۵) شرح مہذب ۸/۴۴۸۔

(۶) المحلی ۶/۲۴۰ مع تحقیق ڈاکٹر عبدالغفار، ویسے بہشتی زیور ۶/۱۲ میں ہڈی نہ توڑنے کو بے اصل قرار دیا گیا ہے۔

بعض روایتوں میں یہ بات بھی آئی ہے کہ عقیقہ کے جانور کا خون بچہ کے سر میں لگایا جائے، لیکن اکثر علماء کے نزدیک فنی اعتبار سے یہ روایت قابلِ اعتبار نہیں ہے۔ نیز دوسری صحیح روایات میں یہ ہدایت موجود ہے کہ بچہ سے گندگی کو دور کرو۔ امیطوا عنہ الاذیٰ، جو مذکورہ روایت کے مضمون کے برعکس ہے، اس کے علاوہ عبداللہ مزنی سے مروی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ بچہ کے سر کو خون نہ لگایا جائے لایمس رأسہ بدمٍ (۱) اس لئے صحیح یہی ہے کہ عقیقہ کا خون بچہ کے سر پہ لگانے کی ضرورت نہیں اور اسی پر عام فقہاء کا عمل ہے (۲) ——— مستحب طریقہ یہ ہے کہ پہلے جانور ذبح کیا جائے پھر بچہ کا بال مونڈا جائے (۳) اگر عقیقہ کے جانور کا چرم فروخت کیا جائے تو قربانی کے چرم کی طرح قیمت کا صدقہ کرنا واجب ہوگا (۴) یہ بھی مسنون ہے کہ بچہ کا بال کاٹ کر اس کے ہم وزن چاندی صدقہ کردی جائے۔ خود حضورؐ نے حضرت عائشہ کو اس کی تلقین فرمائی، وتصدقی بوزن شعرہ فضۃً (۵)

ختنہ

حضرت ابوہریرہ کی ایک روایت کے مطابق امور فطرت میں سے ایک "ختنہ" ہے (۶)۔ ابوالانبیاء سیدنا حضرت ابراہیمؑ نے ۸۰ رسال کی عمر میں خود اپنا ختنہ فرمایا (۷)، جو انسانی تاریخ کا غالباً پہلا ختنہ تھا اور قرآن نے حضرت

---

(۱) مجمع الزوائد ۴/۵۸۔ (۲) المغنی ۹/۳۶۵۔

(۳) فتح الباری ۹/۵۱۵ (۴) المغنی ۹/۳۶۶۔

(۵) سبل السلام ۴/۱۴۲۹۔

(۶) بخاری عن ابی ہریرۃ، باب تقلیم الاظفار۔

(۷) بخاری عن ابی ہریرۃ باب قول اللہ واتخذ اللہ ابراہیم خلیلاً۔

ابراہیمؑ کے طریقہ کو بطور خاص قابل اتباع اور لائق پیروی قرار دیا ہے (النحل: ۱۲۳) پیغمبر اسلامؐ کے مختون ہونے پر اتفاق ہے، البتہ آپؐ کا ختنہ کیوں کر ہوا؟ اس سلسلہ میں اہل علم سے تین رائیں منقول ہیں، اول یہ کہ آپؐ مختون ہی پیدا ہوئے تھے۔ اس طرح کی روایت حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت انسؓ سے مروی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس سے منقول ہے کہ آپؐ کے دادا حضرت عبدالمطلب نے ساتویں دن آپؐ کا ختنہ کرایا، دعوت کی اور "محمد" کے نام سے آپؐ کو موسوم کیا اور حضرت ابوبکرہ راوی ہیں کہ حضرت حلیمہ سعدیہ کے یہاں رہنے کے دوران "شرح صدر" کے واقعہ کے ساتھ حضرت جبرئیلؑ نے آپؐ کا ختنہ کیا (۱) حقیقت یہ ہے کہ اتنا تو واضح ہے کہ آپؐ مختون تھے اور عربوں میں زمانۂ قدیم سے ختنہ کا رواج تھا لیکن مذکورہ روایات میں کوئی بھی فنی اعتبار سے اس درجہ قوی نہیں ہے کہ اس پر اعتبار اور اعتماد کیا جاسکے۔

ختنہ صحت کیلئے مفید ہے۔ حشفہ کے اوپر چمڑے باقی رہیں تو میل جمع ہوکر مختلف امراض اور بیماریوں کا سبب بن سکتے ہیں، ختنہ کی وجہ سے ان بیماریوں سے نجات مل سکتی ہے۔ ختنہ کے بارے میں تسلیم کیا گیا ہے کہ اس سے طرفین کیلئے لذت میں اضافہ بھی ہوتا ہے اور مرد کے شہوانی تقاضوں میں اعتدال بھی آتا ہے، اس لئے اس کو مطابق فطرت کہنا عین درست ہوگا۔

حکم اور طریقہ:

---

(۱) الاتحاف ۲/ ۶۶۶۔

ختنہ اکثر فقہاء کے نزدیک سنت ہے۔ یہی رائے فقہاء احناف کی ہے، امام شافعیؒ کے مشہور قول کے مطابق مرد و عورت دونوں کے لئے واجب اور امام احمد کے نزدیک مردوں کیلئے واجب اور عورتوں کے لئے سنت ہے فقہاء احناف سے عورتوں کے ختنہ کے سلسلہ میں دو رائیں منقول ہیں۔ ایک سنت ہونے کی، دوسرے مستحب (مکرمہ) ہونے کی (۱) اور اس کی تائید حضورؐ کی حدیث سے ہوتی ہے: الختان سنة للرجال ومكرمة للنساء "ختنہ مردوں کیلئے سنت اور عورت کے لئے مستحب ہے (۲)۔

مردوں کے لئے ختنہ کی صورت یہ ہے کہ حشفہ کے اوپر کے چمڑے کاٹ دیئے جائیں اور عورت کے ختنہ کی صورت یہ ہے کہ پیشاب کے مخرج کے اوپری حصہ کے اُبھرے ہوئے چمڑے کو کاٹ دیا جائے (۳) جس سے عورت کی شہوت میں کمی واقع ہوتی ہے، گرم ممالک میں غالباً اس کا رواج زیادہ ہے۔ اہل سیر کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جیسے مردوں میں حضرت ابراہیمؑ سے ختنہ کی ابتدا ہوئی۔ اسی طرح عورتوں میں حضرت ہاجرہ ام اسماعیلؑ سے (۴) واللہ اعلم۔

ختنہ کی عمر

لڑکوں کا ختنہ بہتر ہے کہ سات سال سے ۱۲ سال کی عمر کے درمیان کیا جائے (۵)، فقہاء شوافع کا خیال ہے کہ ساتویں دن یا چالیس دن کے اندر اور زیادہ سے زیادہ ساتویں سال میں ختنہ کر دینا مستحب ہے (۶)۔

---

(۱) ملاحظہ ہو شرح مہذب ۱/۳۰۱۔۔۳۰۰، الاتحاف ۲/۶۶۵، عالمگیری ۵/۳۵۷۔

(۲) رواہ احمد والبیہقی۔۔۔۔ باسناد ضعیف، اتحاف ۲/۶۶۵۔

(۳) شرح مہذب ۱/۳۔۔۳۰۲۔ (۴) الاتحاف بحوالہ سہیلی ۲/۶۶۸۔

(۵) عالمگیری ۵/۳۵۷۔ (۶) شرح مہذب ۱/۳۰۲۔

بہرحال نابالغی کی عمر میں ختنہ کر دینا چاہیئے اور بچہ کی صحت اور اس کی آسانی کے اعتبار سے وقت اختیار کرنا چاہیئے۔

بالغ آدمی اسلام قبول کرے تو اگر ختنہ کی تکلیف برداشت کرنے کی قوت نہ ہو تو ختنہ نہ کرے، تکلیف اٹھا سکتا ہو اور اپنا آپ ختنہ کرنے پر قادر ہو تو خود ختنہ کرلے جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ کے عمل سے ثابت ہے، خود نہ کر سکتا ہو تو ایک طرف بے ستری ہوتی ہے جس کا تقاضا ہے کہ ختنہ ممنوع ہو، دوسری طرف ختنہ شعار اسلام کا درجہ رکھتا ہے اور شعار کی جو اہمیت ہے وہ محتاج اظہار نہیں ——— ان دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھ کر خیال ہوتا ہے کہ ایسے شخص کے لئے ختنہ کرالینا بہتر ہے، اس لئے کہ ختنہ ایک درجہ میں علاج بھی ہے اور علاج کیلئے بے ستری کا جائز ہونا ظاہر ہے۔ دوسرے عثیم بن کثیر کی روایت بھی موجود ہے کہ ایک نومسلم کو آپؐ نے ختنہ کرانے کا حکم فرمایا (۱)، اسی لئے فقہاء نے بھی حمامی (غسل خانہ کے کارندہ) سے ختنہ کرانے کی اجازت دی ہے (۲)

بعض اور احکام

جو بچے پیدائشی طور پر مختون ہوں، ان کا ختنہ نہیں کرایا جائے (۳) ختنہ کرنے اور علاج کے اخراجات خود بچہ کے مال سے ادا کئے جائیں ورنہ اس کی ذمہ داری باپ پر (۴)، یا اس شخص پر ہوگی جس کے ذمہ اس کا نفقہ واجب ہے۔[۵]

---

(۱) الاتحاف ۲/۶۶۶۔ (۲) ہندیہ ۵/۳۵۷۔
(۳) شرح مہذب ۱/۳۰۷۔ (۴) عالمگیری ۵/۳۵۷۔
(۵) شرح مہذب ۱/۳۰۶۔

تعلیم و تربیت

بچوں کی تعلیم و تربیت کو اسلام میں بڑی اہمیت حاصل ہے، قرآن مجید نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: قوا انفسکم واھلیکم ناراً (التحریم ۶) اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو دوزخ سے بچاؤ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: الرجل راع فی اھلہ ومسئول عن رعیتہ والمرأۃ راعیۃ فی بیت زوجھا ومسئولۃ عن رعیتھا (۱)

آپ کا ارشاد ہے کہ یہ بات کہ آدمی اپنے بچے کو ادب سکھائے اس سے بہتر ہے کہ ایک صاع صدقہ کردے (۲)۔ اس کی وجہ ظاہر ہے بچوں کی حیثیت ایک نرم اور نوخیز پودے کی ہے اسے جس طرح چاہے موڑا جا سکتا ہے۔ جب یہ پودے اپنی پختگی کو پہنچ جائیں گے ان کو موڑنا ممکن نہ رہے گا۔ یہی حال انسان کا ہے بچپن جس ماحول میں گذرے گا اور جیسی ذہنی اور عملی تربیت کی جائے گی، زندگی کا پورا سفر اسی طرح تمام ہوگا۔

پھر اسلام بچہ کی تربیت کا جو تصور رکھتا ہے وہ نہایت وسیع اور ہمہ گیر ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ دینی، اخلاقی، جسمانی، عقلی اور نفسیاتی ہر طرح بچہ کی ایسی مکمل تربیت کی جائے کہ مکمل طور پر اس کی شخصیت کی تعمیر ہو سکے اور وہ ایک آئیڈل بن سکے۔

دینی تربیت

تربیت کے مختلف شعبوں میں سب سے اہم دینی اور اسلامی تربیت ہے

---

(۱) بخاری عن ابن عمر باب العبد راع فی مال سیدہ۔ (۲) ترمذی عن جابر بن سمرہ باب ماجاء فی ادب الولد۔

جس میں مبادیات دین کی تعلیم، عبادات کی ترغیب، حلال وحرام کی تفہیم، قرآن مجید کا پڑھانا وغیرہ داخل ہے۔ آپؐ نے اس کو اتنی اہمیت دی ہے کہ فرمایا کہ بچے سے جو سب سے پہلا کلمہ کہلایا جائے وہ ہے لا الٰہ الا اللہ۔ افتحوا علیٰ صبیانکم اول کلمۃ بلا الٰہ الا اللہ (۱) اسی طرح آپؐ نے فرمایا کہ اپنے بچوں کو اوامر کی انجام دہی اور شریعت کی منع کی ہوئی چیزوں سے بچنے کا حکم دو۔ یہ ان کے لئے بھی جہنم سے تحفظ کا ذریعہ ہے اور تمہارے لئے بھی (۲)

اب ظاہر ہے کہ جب تک حلال وحرام اور فرائض وواجبات کی تعلیم نہ دی جائے اور اس کو نہ سمجھایا جائے ان کو اس کا حکم کیونکر دیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح حدیث میں ہے کہ سات سال میں بچوں کو نماز کا حکم دیا جائے اور دس سال کے ہوں تو نماز کی خاطر مار پیٹ بھی کی جائے (۳) اسی حدیث سے معلوم ہوا کہ سات سال کے بچے کو اسلامی عبادات اور ان سے متعلق احکام سے واقف ہونا چاہیئے اور دس سال تک ان کو پوری طرح خوگر بنا دینا چاہیئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق اسلام کی بنیاد اور اساس ہے اور دراصل یہیں سے اطاعت اور اتباع کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ادبوا اولادکم علیٰ ثلاث خصال حُبّ نبیّکم وحب آل بیتہ وتلاوۃ القرآن (۴)

---

(۱) مستدرک حاکم عن ابن عباسؓ۔

(۲) ابن جریر عن ابن عباسؓ۔

(۳) ترمذی عن عبدالملک بن الربیع بن سبرہ عن ابیہ عن جدہ، ۱/۹۲۔

(۴) طبرانی عن علیؓ

چنانچہ صحابۂ کرام کا معمول تھا کہ وہ اپنے بچوں کو دینی اور اسلامی تربیت کے لئے سیرتِ نبوی ؐ کی تعلیم بھی دیتے تھے۔ حضرت سعد بن وقاص رضؓ سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ ہم جس طرح اپنے بچوں کو قرآن کی تعلیم دیا کرتے ہیں اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات کی بھی تعلیم دیتے ہیں (۱)

اخلاقی تربیت

دینی تربیت کا ایک حصہ اخلاقی تربیت اور تہذیب نفس ہے، اسلام میں فطری طور پر اس کو بڑی اہمیت دی گئی ہے، آپؐ نے فرمایا کہ کسی شخص نے اپنی اولاد کو اچھے اخلاق و آداب سے بہتر عطیہ نہیں دیا (۲) اور یہ کہ اپنی اولاد کو تہذیب و شائستگی سکھاؤ واحسنوا ادبھم (۳) اور خیر کی تعلیم دو (۴) دو چیزوں کو آپؐ نے اولاد کا باپ کے ذمہ حق قرار دیا ہے۔ ایک اچھے اخلاق و آداب سے آراستہ کرنا، دوسرے اچھا نام رکھنا (۵) ایک روایت میں ہے کہ ساتویں دن بچہ کا عقیقہ کیا جائے، اس کا نام رکھا جائے اور نہلایا دھلایا جائے پھر جب سات سال کی عمر کو پہنچے تو نماز کی تلقین کی جائے، نو سال میں بستر علٰحدہ کر دیا جائے، تیرہ سال میں نماز روزہ کے لئے سرزنش کی جائے سولہ سال کی عمر میں باپ اس کی شادی کر دے، پھر اس کا ہاتھ پکڑے اور کہے

---

(۱) تربیت الاولاد فی الاسلام ۱/۱۵۰۔
(۲) ترمذی عن ایوبؓ۔ باب ما جاء فی ادب الولد۔
(۳) ابن ماجہ عن حارث بن نعمان، باب برالوالد والاحسان الی البنات۔
(۴) مسند عبدالرزاق عن علیؓ۔
(۵) بیہقی عن ابن عباسؓ۔

یں نے تجھے اخلاق سکھا دیئے (قد ادبتك) تعلیم دے دی اور تمہارا نکاح کر دیا۔ اَب میں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں اس سے کہ تو دنیا میں میرے لئے فتنہ کا یا آخرت میں عذاب کا باعث بنے (۱)

اسی اخلاقی تربیت کے پیش نظر آپؐ نے والدین کو کسی ایسی حرکت سے منع فرمایا جو بچہ کے معصوم اور سادہ ذہن پر اپنا غلط نقش چھوڑ جائے۔ چنانچہ ارشاد ہوا کہ جو شخص بچہ کو کہے کہ یہ لے لو پھر اسے نہ دے تو یہ بھی جھوٹ ہے (۲) ایک بار دسترخوان پر حضرت عمرو بن ابی سلمہؓ آپؐ کے ساتھ کھانے میں شریک تھے جو اس وقت بہت کم سن تھے۔ وہ برتن میں مختلف جگہوں سے کھا رہے تھے جو آدابِ طعام کے خلاف تھا چنانچہ آپؐ نے اس سے منع فرما دیا اور اپنے سامنے سے کھانے کا حکم فرما دیا (۳) ایک بچی آئی اور اس نے بسم اللہ کہے بغیر دسترخوان سے کھانا چاہا۔ آپؐ نے اس کے ہاتھ پکڑ لئے اور فرمایا جس کھانے پر خدا کا نام نہ لیا جائے اس میں شیطان شریک ہو جاتا ہے (۴)

اسلام میں تعلیم کو جو اہمیت حاصل ہے اس کا اندازہ لگانے کیلئے یہی کافی ہے کہ اسلام ایک خاص حد میں "جبری تعلیم" کا حامی ہے اس لئے کہ اس نے تعلیم حاصل کرنے کو مسلمانوں کا مذہبی فریضہ قرار دیا ہے: طلبُ العلمِ فریضۃ علیٰ کلّ مُسلمٍ (۵) اور جو فرائض ہوں ان میں جبر سے کام لینا ہے۔ پھر چھوٹے بچوں کی تعلیم کو اسلام نے خصوصی اہمیت دی ہے۔

---

(۱) مسند ابن حبان عن انسؓ۔
(۲) مسند احمد عن انسؓ۔
(۳) کنز العمال عن عمرو بن ابی سلمہؓ ۲/۴۴۔
(۴) کنز العمال عن حذیفہؓ
(۵) ابن ماجہ عن انسؓ۔

امام بخاریؒ نے ایک مستقل باب قائم کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ پانچ سال ہی کی عمر میں تعلیم کا آغاز ہو جانا چاہیئے (۱) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بہترین صدقہ قرار دیا ہے کہ ایک شخص دوسرے کو علم سے بہرہ مند کر دے (۲)

اس تعلیم میں سب سے بنیادی چیز تو دینی تعلیم ہے۔ اس لیئے کہ وہ ہر شخص کی ناگزیر ضرورت ہے جس کے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں ہے، اس کے علاوہ ایسی ضروری دنیوی تعلیم دلانی بھی والدین کی ذمہ داری اور ان کا فریضہ ہے جو اولاد کی زندگی یا اس کی معیشت کے لیئے ناگزیر ہو۔ سلفِ صالحین نے ایسے غیر دینی مفید علوم و فنون کی بھی توصیف کی ہے۔ حضرت علیؓ سے مروی ہے انہوں نے فرمایا:

العلوم خمسة الفقه للأديان والطب للأبدان والهندسة للبنيان والنحو للّسان والنجوم للزمان۔ (۳)

(مقصدی) علوم پانچ ہیں، فقہ مذہب کو سمجھنے کیلیئے، طب جسمانی علاج کیلیئے۔ انجنیرنگ تعمیر کیلیئے، قواعد نحو زبان دانی کیلیئے اور علم نجوم وقت کی تحقیق کیلیئے۔

جسمانی تربیت

عقل و فہم، اخلاق و شائستگی اور فکر و عقیدہ کی درستگی اور اعتدال کے لیئے سب سے بنیادی اور مادی ضرورت انسان کی جسمانی صحت اور اعتدال ہے۔ اسلام نے اس گوشہ کو بھی تشنہ نہیں رکھا اور واضح ہدایات دی ہیں

---

(۱) بخاری اول باب الاغتباط فی العلم والحکمۃ۔ (۲) کنز العمال ۱/۹۸۔
(۳) طاش کبریٰ زادہ: مفتاح السعادۃ ۱/۲۶۷۔

باپ کو رزق اور لباس کا ضامن اور ذمہ دار قرار دیا ہے (البقرہ ۲۲۵) اور اس شخص کو گنہ گار قرار دیا جو اپنے زیرِ پرورش لوگوں سے خیال نہ کرے، ان کو ضائع ہونے دے یا ان کی ضروریات کی کفالت سے رک جائے (۱)
بیمار آدمی کو تندرست آدمی پر زیادہ آمد و رفت کرنے سے منع کیا گیا (۲)
ہر مرض کو قابلِ علاج قرار دیا اور علاج کی ترغیب دی (۳) نشانہ بازی، گھوڑ سواری اور تیراکی کو ذکرِ الٰہی کے حکم میں رکھا ہے (۴) اور عیش کوشی سے پرہیز، جفاکشی اور تیر اندازی کا حکم دیا گیا (۵)

یہ ہدایات مسلمانوں کے ہر طبقہ کے لئے ہیں اور صلاحیت و استعداد کے لحاظ سے بچے اور جوان اس کے زیادہ مخاطب ہیں، ان کے اندر جسمانی ریاضت، چستی اور پھرتی پیدا کرنے کی جو صلاحیت ہے، وہ ظاہر ہے۔
اسی طرح ایامِ جاہلیت میں خواتین بچوں کے تالو کو مسل دیتی تھیں، جو بسا اوقات شدید مضرت کا باعث بن جاتا تھا۔ آپؐ نے اس سے منع فرمایا (۶) ماں کا دودھ بچے کے لئے ایک صحت مند غذا ہے، ماؤں کو اس کا مکلف قرار دیا گیا کہ وہ عام حالات میں اپنے بچوں کو دودھ پلائیں (البقرہ ۲۳۳) حیض کی حالت میں بیوی سے ہمبستری قطعاً ممنوع قرار دی گئی (البقرہ ۲۲۲) جو بچے کیلئے شدید اور سنگین خلقی امراض کا باعث بنتا ہے۔

---

(۱) ابوداود۔ عن عبد اللہ بن عمرو باب فی صلۃ الرحم۔
(۲) لا یوردون ممرض علی مصحح، بخاری و مسلم عن ابی ہریرہؓ۔
(۳) طبرانی۔
(۴) حوالہ مذکور۔
(۵) تمعددوا اخشوشنوا انتضلوا، طبرانی عن قعقاع۔
(۶) بخاری و مسلم عن انس و ام قیس۔

تربیت کے اصول

اسلام ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ تربیت دینے کا طریقہ کیا ہے؟ اور اس کے لئے کیا کیا ذرائع استعمال کیے جا سکتے ہیں؟

اس سلسلہ میں اصولی طور پر یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اسلام ہر طرح کی اصلاح و تربیت کیلئے حتی المقدور نرمی سے کام لینے اور بلا وجہ تشدد سے احتراز کرنے کا حامی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت ابو موسیٰ اشعری رضؓ اور حضرت معاذ رضؓ کو یمن بھیجا اس وقت چند مختصر اور جامع لفظوں میں دعوت کے جو زریں اصول بتائے وہ یہ تھے کہ نرمی کرو، سختی نہ کرو، خوشخبری دو اور متنفر نہ کرو یسرا ولا تعسرا و بشرا و لا تنفرا (۱)

بے جا تشدد اور سخت گیری اکثر اوقات بڑے مضر اور نقصان دہ نتائج پیدا کرتی ہے، مشہور مؤرخ علامہ ابن خلدون نے طلبہ کی نفسیات اور ایسے نامناسب رویہ کے اثرات پر بڑی حکیمانہ گفتگو کی ہے، وہ لکھتے ہیں:

"جس کا طریق تربیت غلاموں بچوں یا خادموں کے ساتھ تشدد آمیز اور قہر آلود ہوتا ہے۔ ان کے زیر تربیت لوگوں پر خوف مسلط ہو جاتا ہے، وہ تنگ دل ہو جاتے ہیں اور ان کی طبیعت کا نشاط ختم ہو جاتا ہے پھر اس کی وجہ سے اس کے اندر سستی اور کسل پیدا ہو جاتا ہے اور یہ چیز اس کے لئے جھوٹ اور مختلف برائیوں کا محرک ثابت ہوتی ہے..... وہ مکر و فریب اور حیلہ جوئی سیکھتا ہے یہاں تک کہ یہی رفتہ رفتہ اس کی عادت اور طبیعت بن جاتی ہے (۲) البتہ ایسا بھی نہ ہونا چاہیئے کہ بچوں کی تربیت میں سختی اور

---

(۱) مسلم عن ابی موسیٰ اشعری رضؓ۔ بخاری ۲/۶۲۲ (۲) مقدمہ ابن خلدون ص ۵۴۰ الفصل الثانی والثلاثون

مار پیٹ سے کام ہی نہ لیا جائے۔ اس لئے کہ اکثر اوقات اس کی وجہ سے بچے بہت شوخ اور نافرمان ہو جاتے ہیں اور رعب و دبدبہ ان کے دل میں باقی ہی نہیں رہ پاتا، اس کا ثبوت وہ حدیث ہے کہ اس پر اللہ کی رحمت ہو جو اپنے گھر میں کوڑا لٹکا کر رکھے تاکہ اس کے ذریعہ اس کے اہل و عیال ڈریں"۔ (۱)

پھر تربیت میں جہاں مختلف ذرائع استعمال کرنے پڑیں وہاں اس کا خیال رکھنا چاہیئے کہ پہلے خفیف تنبیہ اور پھر اس کے بعد اس سے سخت تنبیہ کی جائے۔ اس کا اندازہ حضورؐ کے دعوت و اصلاح کے مجموعی طریقِ کار سے تو ہوتا ہی ہے، اس بات سے بھی ہوتا ہے جو قرآن نے بیوی کی فہمائش کے سلسلہ میں ہدایات دی ہیں کہ پہلے وعظ و پند اور نصیحت و موعظت سے کام لیا جائے۔ اس سے کام نہ چلے تو وقتی طور پر ترکِ تعلق کر لیا جائے (ھجر فی المضاجع) اور اگر یہ بھی کافی نہ ہو تو ان کے مناسبِ حال خفیف سرزنش کی جائے ——— یہی اصول بچوں بلکہ سن و سال کے لوگوں کی اصلاح اور ان کی تربیت کے لئے ہے۔

اسوۂ رسالت کی روشنی میں

اس سلسلہ میں جب ہم خود پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے اُسوۂ حسنہ کا مطالعہ کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ آپؐ نے حالات اور مخاطب کے لحاظ سے مختلف مواقع پر جُداگانہ اور الگ الگ طرزِ عمل اختیار کیا ہے۔ کبھی صرف مؤثر توجہ دہانی فرما دی مثلاً عمر بن ابی سلمہ آپؐ کے زیرِ پرورش تھے اور کم عمر

---

(۱) دیلمی بحوالہ کنز العمال ۲۱/۲۷۰ رحم اللہ عبداً علق فی بیتہ سوطاً یؤدب بہ اہلہ۔

تھے، کھانے کے دَوران مختلف جگہوں سے کھا رہے تھے، آپؐ نے توجہ دلائی اور فرمایا بسم اللہ کہو۔ دائیں ہاتھ سے کھاؤ اور برتن کے اس حصّہ سے کھاؤ جو تم سے قریب ہے (۱)

کبھی شفقت اور دلجوئی کا لب و لہجہ اختیار فرمایا، ایک بار آپؐ کے پاس کوئی مشروب لایا گیا۔ آپ کی دائیں جانب عبداللہ بن عباسؓ تھے جو اس وقت بہت کم عمر تھے اور بائیں سمت بڑی عمر کے اصحاب تھے۔ آپ نے حضرت ابن عباس سے فرمایا کیا تم مجھے اس کی اجازت دو گے کہ یہ بچا ہوا ان بڑوں کو دے دوں؟ انہوں نے عرض کیا، آپؐ کی طرف سے جو ملنے والا ہے خدا کی قسم میں اس میں ایثار نہیں کر سکتا یعنی آپؐ کا جھوٹا پینے کا شرف خود ہی حاصل کروں گا۔ چنانچہ آپؐ نے یہ مشروب ان کے ہاتھوں میں رکھ دیا (۲) ——— یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو باتوں ہی باتوں میں بڑوں کا حق اور اُن کے ساتھ رعایت کی تعلیم بھی دے دی۔

مُربّی اور معلّم کبھی ضرورت محسوس کرتا ہے کہ اشارہ اور عمل کے ذریعہ کسی بات پر تنبیہ کر دے۔ آپؐ سے بھی ایسا ثابت ہے۔ ایک بار حجۃ الوداع کے دَوران قبیلۂ بنو خثعم کی ایک خاتون آپؐ سے حج کے بارے میں ایک مسئلہ دریافت کرنے آئیں۔ حضرت فضیل بن عباسؓ آپؐ کے ساتھ تھے اور کم عمر ہی تھے وہ ان کی طرف دیکھنے لگے۔ آپؐ نے اپنے دستِ مبارک سے ان کا چہرہ دوسری سمت موڑ دیا (۳) یہ گویا عملی طور پر

---

(۱) بخاری، عن عمرو بن سلمہ، باب الاکل مما یلیہ۔

(۲) بخاری عن سہل بن سعد۔ (۳) بخاری عن ابن عباسؓ۔

اس بات کی تعلیم تھی کہ غیر محرم عورتوں سے اپنی نگاہ کو بچانا چاہیے۔

موقع کے لحاظ سے آپؐ نے ازراہِ تربیت خفگی کا اظہار بھی کیا ہے اور ڈانٹا ڈپٹا بھی ہے۔ حضرت ابوذرؓ نے ایک بار غالباً اپنے غلام کو ڈانٹتے ہوئے ماں کا طعنہ دیا اور کہا "اے کالی کلوٹی عورت کا بیٹا دیا ابن السوداء) یہ جملہ ازراہِ بشریت فرطِ غصہ میں ان کی زبان سے نکل گیا، آپؐ نے اس پر سخت خفگی کا اظہار کیا اور ارشاد فرمایا" ابوذر! تمہارے اندر جاہلیت کے اثرات باقی ہیں (انك امرأ فيك جاهلية) (۱)

کبھی وقتی طور پر بے رخی اور ترکِ تعلق کا اظہار بھی مؤثر ہوا کرتا ہے حدیث کی کتابوں میں تفصیل سے یہ واقعہ مذکور ہے کہ بعض مخلص صحابہ کرامؓ باوجود قصد وارادہ کے آج کل میں غزوۂ تبوک میں شریک نہ ہو سکے یہاں تک کہ آپؐ کی مدینہ کو واپسی ہوئی۔ ان حضرات نے آکر اپنی غلطی کا اعتراف کیا اس موقع پر جب تک خود اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان کی توبہ کی قبولیت کا حکم نازل نہ ہو گیا۔ آپؐ نے اور دوسرے مسلمانوں نے ان سے گفتگو بند کر دی اور تعلقات منقطع کر لئے مگر ظاہر ہے اصلاح و تربیت کا یہ انداز انہیں کے ساتھ اختیار کیا جا سکتا ہے جن کا شعور بالغ ہو چکا ہو۔ کمسن بچوں کے ساتھ یہ رویہ مفید سے زیادہ مضر ہو گا۔

آخری چارۂ کار کے طور پر اسلام مارنے اور جسمانی سرزنش کرنے کی بھی اجازت دیتا ہے جیسا کہ اس سے پہلے ذکر کیا جا چکا ہے: بچوں کو دس سال کی عمر میں خود آپؐ نے نماز کے لئے مارنے کی اجازت بلکہ اس کا حکم دیا ہے (۲)۔

---

(۱) بخاری عن ابی ذرؓ۔ باب المعاصی من امر الجاھلیۃ۔ (۲) ابوداؤد عن عمرو بن شعیب عن ابیہؓ۔ باب متی یؤمر الغلام بالصلوٰۃ۔

جسمانی سرزنش

جسمانی سرزنش کے سلسلہ میں ان باتوں کا خیال رکھنا چاہیئے کہ اس کا استعمال آخری طریق کار کے طور پر اس وقت کرنا چاہیئے جب فہمائش، پند و موعظت اور ڈانٹ ڈپٹ وغیرہ سے کام نہ چل سکے۔ اس وقت نہیں مارنا چاہیئے جب آدمی بہت جذباتی ہو۔ غصہ میں ہو یا غیر معتدل حالت میں ہو۔ جیسا کہ حدیث میں اس طرح بیوی کو مارنے کی ممانعت آئی ہے کہ اس کی گردن کی رگیں (مارے غصہ کے) پھولی ہوئی ہوں (۱) چہرہ اور جسم کے نازک حصوں پر نہیں مارنا چاہیئے حدیث میں چہرہ پر مارنے کی ممانعت وارد ہوئی ہے (۲) اس طرح نہ مارنا چاہیئے کہ جسم کا کوئی حصہ ٹوٹ جائے یا بچہ کی صحت متاثر ہو جائے۔ اس ممانعت کا ثبوت وہ حدیث اور اسلامی شریعت کا اصول ہے کہ لا ضرر ولا ضرار (نہ نقصان اٹھاؤ اور نہ پہنچاؤ) (۳)

بسا اوقات مدرسین و اساتذہ اس معاملہ میں حد سے گذر جاتے ہیں اور تعذیب کی حد تک بچوں کی سرزنش کرتے ہیں۔ یہ طریقہ نفسیاتی اعتبار سے نہایت نقصان دہ اور مضر ہے۔ اس لئے کہ اس سے طلبہ میں بسا اوقات خود تعلیم ہی سے نفرت کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ نیز وہ سزاؤں کے اس قدر خوگر و عادی ہو جاتے ہیں کہ نہ ان کے اندر پند و موعظت سے کوئی بیداری پیدا ہوتی ہے اور نہ سزاؤں کا خوف باقی رہتا ہے۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ

---

(۱) دیلمی عن ام کلثوم رضہ

(۲) ابن جریر عن حجاج مرسلاً، طبرانی عن بہز بن حکیم۔

(۳) مؤطا امام مالک عن عمرو بن یحییٰ المازنی عن ابیہ، باب القضاء فی المرفق:

استاذ نامناسب حد تک سزا دے تو خود استاد کی تعزیر کی جائے گی۔

نکاح:

اولاد کا آخری حق جو والدین کے ذمہ ہے، یہ ہے کہ بالغ ہونے کے بعد جلد سے جلد ان کا نکاح کر دیا جائے۔ نکاح چوں کہ عفت وعصمت اور پاکیزگی کا نہایت مؤثر اور اہم ذریعہ ہے، اس لئے بالغ ہونے کے بعد اسلام اس میں عجلت کو پسند کرتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ جس کو بچہ ہو وہ اس کا اچھا نام رکھے اور اس کی تربیت کرے پس جب بالغ ہو جائے تو شادی کر دے، پھر اگر بالغ ہو اور شادی نہ کرے اور وہ گناہ میں مبتلا ہو جائے تو اس کا گناہ اس کے باپ پر ہوگا۔(۱)

دوسری حدیث میں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تورات میں لکھا ہوا ہے کہ جس کی عمر بارہ سال ہو جائے اور اس کی شادی نہ کرے پھر وہ لڑکی گناہ میں مبتلا ہو جائے تو اس کا گناہ شادی نہ کرنے والے سرپرستوں پر ہوگا (۲) چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کا نکاح کیا کرو (۳)۔

اسی طرح نکاح کرتے وقت بچے کے لئے اچھے رشتے کا انتخاب کرے یعنی ایسی بہو لائے جو دیندار اور حسنِ اخلاق کی حامل ہو اور قبول صورت ہو، جو سن وسال اور طبیعت کے لحاظ سے اس کے لئے موزوں

---

(۱) مشکوٰۃ، عن ابی سعیدؓ وابن عباسؓ۔

(۲) مشکوٰۃ، عن عمر بن الخطابؓ۔

(۳) کنز العمال عن ابن عمرؓ ۲۰۷/۱۶۔

ہوسکے۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ عورت سے نکاح چار اسباب کے تحت کیا جاتا ہے: مال، خاندان، حسن وجمال اور دین۔ اس میں کامیاب نکاح وہ ہے جو دین کو سامنے رکھ کر کیا جائے (۱) چنانچہ سیدنا حضرت عمرؓ نے اپنے صاحبزادہ حضرت عاصم کیلئے اس لڑکی کا انتخاب کیا جس نے اپنی بوڑھی ماں کے حکم کے علی الرغم رات کے اندھیرے میں دودھ میں پانی ملانے سے انکار کر دیا تھا۔ آپؓ نے صرف اس کی اس ایمانداری اور دیانت کو معیار بنایا، نہ خاندان وحسب پوچھا، نہ مال ومتاع کی تفصیل معلوم کی اور نہ رنگ وروپ (۲)۔

غیبت اور جھوٹ

جیسے چہرہ انسان کے حسن وجمال کا مظہر ہے، اسی طرح اخلاق انسان کی سیرت اور اس کی اندرونی کیفیت کا پیرہن ہے، اخلاق ہی کے ذریعہ انسان کی حقیقی شخصیت کی شناخت ہوتی ہے۔ اسی لئے اسلام میں اخلاق کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔ پیغمبر اسلام ؐ نے اپنے بارے میں فرمایا کہ میں مکارم اخلاق کی تکمیل کیلئے مبعوث کیا گیا ہوں۔ انما بعثت لأتمم مکارم الاخلاق۔ آپؐ کی پوری زندگی مکارم اخلاق کی عملی تفسیر ہے اور انہیں مکارم اخلاق کے مطابق زندگی کو سنوارنا قرآن کی زبان میں تزکیہ ہے۔

اخلاق کے کچھ ابواب مثبت ہیں اور کچھ منفی، جو مطلوب ہیں وہ

---

(۱) کنز العمال عن ابن عمرؓ ۲۱/ ۲۰۷۔

(۲) ابوداؤد عن ابی ہریرہؓ۔ باب مایؤمر من تزویج ذات الدین۔

"مثبت" ہیں۔ انہیں کو فضائلِ اخلاق کہا جاتا ہے، جو مذموم ہیں اور جن سے اجتناب شریعت کا منشاء و مقصود ہے، وہ "منفی" ہیں اور رذائلِ اخلاق کہلاتے ہیں ——— صدق و راستی، رحمدلی، حلم و بردباری عفو و درگذر، غیرت و حیاء، سخاوت و سیر چشمی، تواضع و فروتنی، ایثار و قربانی، شجاعت و بہادری، دیانت و امانت، عفت و پاکدامنی، قناعت و استغناء، شیریں کلامی، ایفاء عہد، احسان و اداء حقوق، بڑوں کا احترام چھوٹوں پر شفقت و محبت یہ فضائل اخلاق ہیں اور یہ بہر صورت واجب العمل ہیں۔ ان کے مقابلہ میں جھوٹ، بہتان تراشی، ظلم، غیظ و غضب بے شرمی، بخل، کبر و ترفع، خود غرضی، بزدلی، خیانت، بے عفتی، حرص و لالچ تلخ کلامی، بدعہدی، حق تلفی، غیبت و بدگمانی، بہتان، بڑوں کی بے توقیری اور چھوٹوں کے ساتھ بدسلوکی وغیرہ مذموم و ناپسندیدہ اوصاف ہیں، اور ان سے اجتناب ضروری ہے۔

لیکن غور کیا جائے تو تمام فضائل اخلاق کی جڑ صدق و سچائی ہے اور تمام رذائل کی جڑ جھوٹ اور غیبت ہے۔ جھوٹ اور غیبت جہاں گناہ ہے وہیں بعض صورتوں میں ایک ضرورت بن جاتا ہے اور ایسے موقعہ پر دائرۂ جواز میں آجاتا ہے، اسی لئے فقہاء نے بھی باب اخلاق کے ان دو رذائل پر بحث کی ہے اور میں بھی ان فقہاء کی اقتداء میں رذائل و اخلاق کے دونوں پہلوؤں پر کچھ عرض کرتا ہوں۔

غیبت کب حرام اور کب حلال ہے؟

غیبت کبیرہ گناہوں میں سے ہے۔ قرآن مجید نے نہ صرف غیبت

سے منع کیا بلکہ اس کو اپنے مُردہ بھائی کے گوشت کھانے کے مترادف قرار دیا (حجرات : ۲) حدیثوں میں نہ صرف غیبت کرنے بلکہ غیبت سُننے کی بھی ممانعت کی گئی (۱) ـــــــــ کسی شخص کی عدم موجودگی میں اس کی کوئی ایسی بات بیان کرنی کہ اگر وہ اس کو سنے تو ناگواری ہو غیبت ہے۔ چاہے اس بات کا تعلق جسمانی نقص، خاندان و اخلاق سے ہو، قول و فعل سے ہو یا دین و دنیا سے (۲)

جیسا کہ عرض کیا گیا غیبت حرام ہے لیکن جب شر سے حفاظت یا ظلم کا دفاع مقصود ہو تو جائز ہے۔ امام غزالیؒ نے چھ صورتیں لکھی ہیں جن میں غیبت کی اجازت ہے:

اول: ظلم کے خلاف دادرسی یعنی مظلوم اپنے فریق کی خیانت، رشوت ستانی یا کسی اور ظلم کی شکایت قاضی، سلطان یا ذمہ دار کو کرسکتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ صاحبِ حق کو بات کہنے کا حق حاصل ہے ان لصاحب الحق مقالاً۔

دوسرے: کسی کی اصلاح اور منکر کو روکنے کی غرض سے زیادہ مؤثر شخص کی مدد حاصل کرنے کے لئے بھی غیبت کی جاسکتی ہے، وصالِ نبوی کے بعد ایک بار حضرت عمرؓ نے حضرت عثمان کو سلام کیا لیکن جواب سے محروم رہے تو حضرت ابوبکرؓ سے اس کی شکایت کی اور حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عثمان سے رجوع کیا۔ یہ شکایت اصلاح کیلئے تھی نہ کہ اہانت کیلئے۔

تیسرے: مفتی سے سوال کرنے والا اگر استفتاء میں کسی کے ظلم

---

(۱) دلیل الفالحین ۴/ ۳۶۲، باب تحریم سماع الغیبۃ الخ۔

(۲) احیاء العلوم ۳/ ۱۴۳۔

یا عیب کا ذکر کردے تو اس میں بھی مضائقہ نہیں۔ چنانچہ حضرت ابوسفیان کی بیوی نے اپنے شوہر کے مال میں سے کچھ لینے کے متعلق مسئلہ پوچھتے ہوئے عرض کیا کہ ابوسفیان بخیل آدمی ہیں۔ اتنا نہیں دیتے کہ میرے اور بچوں کے لئے کافی ہو جائے، کیا میں ان کے مال میں سے (بلا اجازت) کچھ لے سکتی ہوں؟ آپؐ نے فرمایا: بقدر کفایت لے سکتی ہو ——— لیکن بہتر طریقہ یہ ہے کہ استفسار میں بھی ایسے مسائل میں متعلق شخص کے نام کی صراحت کے بجائے فرضی ناموں کے ذریعہ سوالات کئے جائیں

چوتھے: کسی مسلمان کو کسی شخص کے شر سے بچانا مقصود ہو مثلاً کوئی نکاح یا سامان امانت رکھنے کے سلسلہ میں مشورہ کرے، ایسے شخص کو خادم رکھے جو چوری وغیرہ کا عادی ہو، خریدار بیچنے والے کو کھوٹا سکہ دے اور وہ اس کے کھوٹے ہونے سے واقف ہو، ایسی صورتوں میں ایک مسلمان کو ضرر اور شر سے بچانے کے لئے غیبت کرنا جائز ہے۔

پانچویں کوئی انسان کسی ایسے نام سے معروف ہو گیا ہو جس سے اس کے نقصِ جسمانی کا اظہار ہوتا ہو تو تعارف کیلئے ایسے ناموں کے لینے میں کوئی مضائقہ نہیں، جیسے بعض مشہور علماء اعرج (لنگڑا) اعمش (کانا) وغیرہ ناموں سے مشہور ہیں یا جیسے ہمارے یہاں بعض بصارت سے محروم لوگ حافظ نابینا یا حکیم نابینا وغیرہ سے مشہور ہو جاتے ہیں، انہی ناموں سے ان کا ذکر کرنے میں مضائقہ نہیں۔

چھٹے: ایسا شخص جو علانیہ فسق وفجور کرتا ہو اور اس سے نہیں شرماتا ہو، اس کی اس برائی کے بیان کرنے میں بھی مضائقہ نہیں۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ایسے شخص کی کوئی حرمت و کرامت نہیں، اسی طرح کی بات حسن بصریؒ سے بھی نقل کی گئی ہے، ایک روایت میں ہے کہ جس نے اپنے چہرہ سے چادر حیا اتار دی اس کی شکایت غیبت نہیں (۱)

فقہاء نے بعض اور صورتوں کو بھی جائز قرار دیا ہے یا اس کو غیبت میں شمار نہیں کیا ہے مثلاً اشخاص کی تعیین کے بغیر کسی گاؤں یا شہر کے لوگوں کی خامی بیان کی جائے یا کسی کمزوری کو بطور اظہار افسوس کے ذکر کیا جائے، غصہ اور توہین مقصود نہ ہو تو ان صورتوں میں بھی شکایت غیبت نہیں ہے لیکن مناسب یہ بھی نہیں۔ اسی طرح حدیث کے راوی یا کسی معاملہ کے گواہ پر جرح جائز بلکہ واجب ہے کہ یہاں اس کی خامیوں کے بیان کرنے کا مقصد شریعت کی حفاظت اور مظلوم کو ظلم سے بچانا ہے (۲)

جھوٹ ــــ حرام اور حلال

جھوٹ بدترین گناہ اور اکبر کبائر ہے، قرآن میں دسیوں مواقع پر جھوٹ کی مذمت کی گئی ہے۔ یہاں تک کہ جھوٹ کو اللہ کی لعنت کا سبب خاص قرار دیا گیا ہے (نور ــ ۱) اللہ تعالیٰ نے جہاں شرک و بت پرستی سے منع کیا ہے وہیں دوش بدوش دروغ گوئی سے بھی اجتناب کا حکم فرمایا ہے (حج ــ ۴) لیکن بعض صورتوں میں زیادہ بہتر اور اہم مقاصد کے لئے جھوٹ بولنے کی اجازت دی گئی ہے۔ خود احادیث میں جھوٹ کی بعض صورتوں کا استثناء موجود ہے۔

---

(۱) احیاء العلوم ۲/۱۵۲، ۱۵۳، بیان الاعذار المرخصة فی الغیبة، نیز دیکھئے: رد المحتار ۵/۲۶۳۔

(۲) در مختار و رد المحتار ۵/۲۶۲، عالمگیری ۵/۳۶۲۔

حضرت ام کلثومؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تین مواقع پر جھوٹ کی اجازت دیتے تھے، ایک اس صورت میں جب دو مسلمانوں کے درمیان مصالحت مقصود ہو، دوسرے جنگ میں تاکہ دشمن کو دھوکہ دیا جاسکے، تیسرے شوہر بیوی کو یا بیوی شوہر کو خوش کرنے کیلئے (۱)۔ حدیث کا مقصود تین ہی صورتوں کا حصر نہیں بلکہ بقولِ امام غزالی اصل اہمیت مقصود کی ہے، وہ مقاصد جو شریعت کی نگاہ میں مطلوب اور پسندیدہ ہیں، اگر سچ اور جھوٹ دونوں ذریعہ سے حاصل کیے جاسکتے ہوں تو جھوٹ بولنا حرام ہے اور اگر جھوٹ بول کر ہی وہ مقصد حاصل ہوسکتا ہو تو اگر وہ مقصد مباح کے درجہ کا ہو تو جھوٹ بولنا بھی مباح ہوگا اور واجب کے درجہ کا ہو تو جھوٹ بولنا بھی واجب۔

امام غزالیؒ نے میمون بن مہران سے خوب نقل کیا ہے کہ بعض دفعہ جھوٹ سچ سے بہتر ہوتا ہے۔ مثلاً کوئی شخص کسی مسلمان کے قتل کے درپے ہو اور وہ چھپ جائے۔ آمادۂ قتل مجرم اس کی تلاش میں آئے تو اس موقعہ پر جھوٹ بول کر اس کی جان بچالینا، سچ بول کر اس کی نشاندہی کرنے سے بہتر ہے (۲)۔ علامہ حصکفی نے اس سلسلہ میں ایک قاعدہ بیان کیا ہے کہ اپنے حق کے تحفظ اور ظلم سے بچنے کیلئے جھوٹ بولنا جائز ہے (۳)۔ علامہ شامی نے لکھا ہے کہ سچ کے ذریعہ جو فساد ہوتا ہو وہ جھوٹ کے فساد سے بڑھ کر ہو تو جھوٹ جائز ہوگا ورنہ حرام (۴)۔

---

(۱) تخریج احادیث احیاء العلوم للعراقی ۳/۱۳۷۔ (۲) احیاء العلوم ۳/۱۳۷۔
(۳) درمختار علیٰ ہامش الرد ۵/۲۷۴۔ (۴) ردالمحتار ۵/۲۷۴۔

کتابیات

قرآنیات:

قرآن حکیم

الجامع باحکام القرآن — ابوعبداللہ محمد بن احمد الانصاری القرطبی

احکام القرآن — ابوبکر جصاص الرازی۔

" " — ابن عربی۔

" " — مولانا ظفر احمد تھانوی۔

معارف القرآن — مفتی محمد شفیع صاحب

احادیث و شروح احادیث:

بخاری شریف — محمد بن اسماعیل البخاری

مسلم شریف — مسلم بن الحجاج القشیری

ابوداؤد شریف — سلیمان بن الاشعث ابوداؤد سجستانی

ترمذی شریف — ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورۃ الترمذی

نسائی شریف — ابوعبدالرحمٰن احمد بن شعیب نسائی۔

ابن ماجہ شریف — محمد بن یزید بن ماجہ القزوینی

موطا امام مالک — امام مالک بن انس الاصبحی

سنن کبریٰ — ابوبکر احمد بن الحسین بن علی البیہقی

مسند ابن حبان — ابوحاتم بن حبان التیمی المصری

مجمع الزوائد — حافظ نورالدین علی بن ابی بکر الہیثمی

جمع الفوائد — الامام محمد بن محمد بن سلیمان

ریاض الصالحین — الامام یحییٰ بن شرف النووی

مستدرک — امام ابوحاکم نیسابوری

جامع الاصول — ابن اثیر

کتاب الاعتبار — علامہ حازمی

کنز العمال — علی متقی الہندی

مشکوٰۃ شریف — الامام محی السنۃ البغوی

زاد المعاد — ابن قیم جوزی

فتح الباری — احمد بن علی بن حجر عسقلانی

عون المعبود — محمد شمس الحق عظیم آبادی

فتح الملک المعبود تکملہ عون المعبود

نیل الاوطار — محمد بن علی بن محمد الشوکانی

سبل السلام — محمد بن اسماعیل الامیر الیمنی الصنعانی

اعلاء السنن — ظفر احمد عثمانی التھانوی

تحفۃ الاحوذی — ابوالعلی محمد عبدالرحمٰن مبارکپوری

المعتصر من المختصر — ابن باجہ مالکی

شمائلِ ترمذی — الامام محمد بن عیسیٰ بن سورۃ الترمذی

عمل الیوم واللیلۃ — علامہ دینوری

المقاصد الحسنہ — علامہ سخاوی

تکملہ فتح الملہم — مولانا محمد تقی عثمانی

مرقاۃ المفاتیح — ملا علی بن سلطان محمد القاری

احیاء العلوم — امام ابوحامد الغزالی

اتحاف السادۃ المتقین — محمد بن محمد حسینی الزبیدی الشہیر بمرتضیٰ۔

فقہ واصولِ فقہ:

رحمۃ الامۃ — ابوعبداللہ محمد بن عبدالرحمٰن الدمشقی

بدایۃ المجتہد — الامام محمد بن رشد القرطبی

الفقہ علی المذاہب الاربعہ — عبدالرحمٰن الجزیری

بدائع الصنائع — ملک العلماء ابوبکر بن مسعود کاسانی

المبسوط — شمس الدین سرخسی

البحر الرائق — زین الدین بن نجیم الحنفی

فتح القدیر — کمال محمد بن عبدالواحد المعروف بابن الہمام

ردالمحتار — محمد امین آفندی الشہیر بابن عابدین الشامی

درمختار — علاء الدین حصکفی

خلاصۃ الفتاویٰ — عبدالرشید طاہر بخاری

ہدایہ — برہان الدین مرغینانی

مجمع الانہر — عبداللہ بن الشیخ محمد بن سلیمان المعروف بداماد آفندی۔

عنایہ — اکمل الدین محمد بن محمود بابرتی

الفتاویٰ الہندیہ: شیخ نظام وجماعۃ من علماء الہند

فتاویٰ تاتارخانیہ: علامہ عالم بن العلاء انصاری

فتاویٰ غیاثیہ — ابوداؤد بن یوسف الخطیب

فتاویٰ قاضی خان — فخرالدین حسن بن منصور اوزجندی

فتاویٰ بزازیہ — محمد بن محمد بن شہاب المعروف بابن البزاز الکردی۔

الفقہ الاسلامی وادلتہ — ڈاکٹر وہبہ زحیلی

کتاب الام — الامام محمد بن ادریس الشافعی۔

المغنی — ابومحمد عبداللہ بن احمد بن قدامہ

المجموع شرح مہذب — الامام یحییٰ بن شرف النووی

فتح العزیز مع شرح المہذب

حاشیہ اذرعی علیٰ ہامش المجموع

الشرح الکبیر

الاحکام فی اصول الاحکام — علی بن محمد آمدی

المحصول فی علم الاصول — امام فخرالدین رازی

الموافقات — ابواسحاق ابراہیم بن موسیٰ شاطبی

اعلام الموقعین — ابوعبداللہ محمد بن ابی بکر المعروف بابن قیم۔

الاشباہ والنظائر : زین الدین بن نجیم الحنفی

" " : علامہ جلال الدین سیوطی

غمز عیون البصائر : احمد بن محمد الحنفی الحموی

امداد الفتاویٰ : مولانا اشرف علی تھانویؒ

کفایت المفتی : مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ

جواہر الفقہ : مولانا مفتی محمد شفیع صاحب

جدید فقہی مسائل : خالد سیف اللہ رحمانی

متفرقات :

شرح فقہ اکبر : ملا علی بن سلطان محمد القاری

الاعتصام : ابو اسحاق شاطبی

مقدمہ ابن خلدون : عبد الرحمٰن بن محمد بن خلدون۔

حجۃ اللہ البالغہ : شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ

مکتوبات مجدد الف ثانی : شیخ احمد سرہندیؒ

فیوض یزدانی : شیخ عبد القادر جیلانیؒ

سیرت النبی : علامہ سید سلیمان ندویؒ

تربیۃ الاولاد فی الاسلام۔